اردو کے کلاسیکی ادب

کلیاتِ ناسخ

جلد اوّل

از

شیخ امام بخش ناسخ

ترتیب و تحشیہ

یونس جاوید

مجلسِ ترقیِ ادب لاہور

کلیات ناسخ ، جلد اول

طبع اول : اپریل ۱۹۸۷ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی

ناظم مجلس ترقی ادب ، لاہور

مطبع : زرین آرٹ پریس ، ۶۱ - ریلوے روڈ ، لاہور

طابع : محمد زرین خان

قیمت : [redacted]

بعونِ صناعِ مکین و مکان و بفضلِ خلاقِ زمین و زمان

۱۷۲

اُردو کا کلاسیکی ادب

کلیاتِ ناسخ

مرتّبہ

یُونس جاوید

ناشر

مجلسِ ترقیِ ادب ۲۔ نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور

کلیاتِ ناسخ

(جلد اول)

☆

ترتیب و تحشیہ

یونس جاوید

☆

مجلس ترقی ادب
۲۔ کلب روڈ ۔ لاہور

انتساب

مشفق و مہربان

جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کے نام

فہرست

غزلیات

ردیف الف

ردیف ب

ردیف ت

ردیف ث

ردیف ج

ردیف ح

ردیف خ

ردیف د

ردیف ر

ردیف ز

ردیف س

ردیف ع

ردیف غ

ردیف ق

ردیف ک

ردیف م

ردیف ن

ردیف و

ردیف ہ

ردیف ی - ے

• • •

حرفِ اول

کلیاتِ ناسخ کی ترتیب کے آغاز پر میرے پاس کلیات کا صرف ایک ایڈیشن تھا جو مطبع خاص نولکشور سے ۱۸۷۲ء میں شائع ہوا تھا ۔ اس کی نقل کے ساتھ ساتھ دوسرے کسی ایڈیشن کی تلاش و جستجو جاری رکھی اور بالآخر مجھے نسخہ مصطفائی کا ایک ایڈیشن ، جو ۱۲۶۷ھ کا تھا ، مل گیا ۔ اس کے ساتھ ہی مصطفائی کا ایک اور ایڈیشن بھی مل گیا جو ۱۲۶۷ھ سے پہلے کا تھا ، مگر یہ ناقص تھا ۔ اس کے شروع اور آخر کے چند صفحات نہیں تھے ۔ مگر چونکہ یہ ۱۲۶۷ھ والے ایڈیشن کی سطر سطر نقل تھا لہٰذا اسے بھی سامنے رکھ لیا گیا ۔ دونوں ایڈیشنوں میں بہت کم اختلاف ہے ۔ مگر جو چند اختلاف ہیں وہ کارآمد ہیں ۔ اس کے اختلاف درج کرتے ہوئے اسے ''مصطفائی طبع اول'' کا نام دیا گیا ہے اور ۱۲۶۷ھ والے ایڈیشن کو ''مصطفائی طبع دوم'' کے حوالے سے درج کیا گیا ہے ۔ یہ ایڈیشن مطبع سلطانی سے شائع ہوئے تھے ۔ ۱۲۶۷ھ والے یعنی مصطفائی طبع دوم کے سرورق پر واضح طور پر لکھا ہے :

> ''بہ اہتمام مدد علی داروغہ مطبع سلطانی ، حسبِ فرمائش محمد مصطفٰی خاں لکھنوی علی بخشان طبع نمود'' ۔

اس کے بعد نولکشور کے کچھ دوسرے ایڈیشن ہاتھ لگے مگر ایک تو وہ بہت قریبی عہد کے تھے ، دوسرے ان میں اختلاف کے بجائے اغلاط تھیں لہٰذا ان سے استفادہ کرنا بے کار تھا ۔ بہرحال سو ڈیڑھ سو

صفحات پر کام ہو چکا تھا کہ خوش قسمتی سے کلیات کا اول ایڈیشن جو ۱۲۵۸ھ میں مطبع محمدی سے شائع ہوا تھا ، مجھے مل گیا ۔ لہٰذا اس کے اختلافات کا حوالہ دیتے ہوئے نسخۂ مطبع محمدی کا اندراج کیا گیا ہے ۔ یہ ایڈیشن میر حسن رضوی ولد میر حسین عرف میر کامل رئیس محلہ محمود نگر لکھنو کے اہتمام سے شائع ہوا تھا ۔ یہ نسخہ ہر لحاظ سے دیگر تمام نسخوں پر فوقیت رکھتا ہے اور دونوں مصطفائی نسخے اس پہلے ایڈیشن کی صفحہ بہ صفحہ نقل ہیں ، سوائے اس کے کہ ان میں سے مثنوی حذف کر دی گئی ہے ۔ نسخۂ مطبع محمدی کے ملنے پر میں نے دوبارہ کام کا آغاز کیا اور جو اختلافات نسخۂ مطبع محمدی سے ملے ، انھیں حواشی میں درج کرنا شروع کیا ۔

لہٰذا متن میں نسخۂ نول کشور (۱۸۷۲ع) ہے اور نسخۂ مصطفائی (اول و دوم) اور نسخۂ مطبع محمدی کے اختلافات حاشیے میں درج کیے گئے ہیں ۔

نسخۂ مصطفائی کے آخر میں ''تمت'' کے عنوان سے یہ عبارت درج ہے :

> ''الحمد للہ کہ کلیاتِ دیوان شیخ امام بخش ناسخ حسبِ فرمائش محمد مصطفیٰ خان خلف حاجی محمد روشن خان غفرلہما المیان ساکن لکھنؤ محلہ محمود نگر در کارخانۂ علی بخش خان بتاریخ بست ہفتم جمادی الاولیٰ ۱۲۶۷ ہجری اختتام رسید'' ۔

اسی طرح نسخۂ مطبع محمدی کے آخر میں کلیات کی اشاعت کی بہت سی تاریخیں درج ہیں ، مگر میں یہاں رشک کی دو تاریخوں پر ہی اکتفا کرتا ہوں :

اے رشک شنید ہر کہ ابیات غزل
مطبوع بشد کلامِ پاکِ **ناسخ**
تاریخ پئے طبع دواوین گفتم
مطبوعِ بشد کلامِ پاکِ **ناسخ**

۱۲۵۸ھ

شکرِ ایزد کہ طبع شد دیوان ھا
تا حشر ازیں بماند نامِ **ناسخ**
تاریخش طبع رشک بر گفت چنیں
زیبا شدہ مطبوع کلامِ **ناسخ**

۱۲۵۸ھ

اس سلسلے میں ، میں استادِ گرامی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے کمال مہربانی سے مجھے اپنا ذاتی نسخہ (نسخہ مطبع مجدی) عنایت فرمایا ۔ اگر وہ یہ نسخہ عنایت نہ فرماتے تو اس کام کی تکمیل مشکل ہو جاتی اور میرا بہت سا وقت تلاش و جستجو میں ضائع ہو جاتا ۔

اس کے علاوہ میں اپنے محترم جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے قدم قدم پر میرا حوصلہ بڑھایا اور میرے کام میں برابر دلچسپی لیتے رہے ۔ ان کی گہری دلچسپی اور حوصلہ افزائی نے اس کام میں میرے لیے آسانیاں پیدا کر دی تھیں ۔ میں ایک مرتبہ پھر ان اصحاب کا شکر گزار ہوں ۔ ــــ بے حد !

یونس جاوید

مجلس ترقی ادب ، کلب روڈ ، لاہور

• • •

مقدمہ

از

یونس جاوید

شیخ امام بخش ناسخ ، شیخ خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے ۔ مولانا آزاد کسی حوالے کے بغیر انھیں شیخ خدا بخش کا متبنٰی بھی بتاتے ہیں اور تقریباً یہی الفاظ سید عبدالحی نے ''گلِ رعنا'' میں دہراتے ہیں ۔ آزاد کے الفاظ میں ''خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے اور بعض اشخاص کہتے ہیں کہ اس دولت مند لاولد نے متبنٰی کیا تھا[1] ۔'' اسی طرح سید عبدالحی کا بیان ہے ''شیخ خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے اور بعض اشخاص کہتے ہیں کہ اس نے متبنٰی کیا تھا[2] ۔'' ''گلِ رعنا'' میں ہی ایک دوسری جگہ سید عبدالحی لکھتے ہیں ۔ ''بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ لکھنؤ میں میر کاظم علی ایک رئیس تھے انھوں نے ان کو اپنا فرزند بنا لیا تھا ۔ وہ مرے تو اچھی خاصی دولت وصیت نامے کے رو سے ان کو مل گئی ۔ اب آسودہ حال ہو گئے اور ٹکسال میں ایک مکان لے کر بود و باش اختیار کی[3] ۔'' علاوہ ازیں ان کے والد کے پیشے کے بارے میں آزاد نے خیمہ دوز بھی لکھا ہے اور مولانا رغمی کے حوالے سے یہ بھی درج کیا ہے کہ وہ بنفشہ اور زعفران کی تجارت کرتے تھے ۔

۱۔ آبِ حیات ، طبع دوم ، وکٹوریا پریس لاہور ، ۱۸۸۳ء ، ص ۳۵۲ ۔

۲ ، ۳۔ گلِ رعنا ، طبع چہارم ، مطبع معارف اعظم گڑھ ، ص ۳۲۳-۳۲۲ ۔

قطع نظر اس بات کے کہ وہ شیخ خدا بخش کے اصل بیٹے تھے یا متبنٰی تھے یا میر کاظم علی نے انھیں اپنا فرزند بنا لیا تھا ، یہ طے ہے کہ ان کا بچپن فیض آباد ہی میں گزرا ۔ البتہ اہم تذکرہ نگار اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ شیخ خدا بخش کا آبائی وطن لاہور تھا ۔ بقولِ مصحفی :

''شیخ امام بخش ، تخلص ناسخ ، خلف الرشید شیخ خدا بخش مرحوم ، وطنِ بزرگانش دارالسلطنت لاہور . . . ۔[۱]''

نواب سید علی حسن نے بھی ''تذکرۂ رشک چمن'' میں ''تاجرِ لاہوری'' لکھا ہے :

''شیخ امام بخش ابن شیخ خدا بخش تاجر لاہوری . . .[۲]''

''تذکرۂ سراپا سخن'' میں ''شیر بیشۂ سخن وری شیخ امام بخش ناسخ خلف شیخ خدا بخش باشندۂ لاہور مقیم لکھنو[۳] ۔'' ایک جگہ نہیں بلکہ دس جگہ پر ملتی جلتی عبارت میں لاہور کا حوالہ ملتا ہے ۔ ''آبِ حیات'' میں مولانا آزاد نے بھی حاشیے میں مولانا رغمی کے حوالے سے یہ الفاظ درج کیے ہیں :

''رغمی سلمہ اللہ فرماتے ہیں ، آن کے والد لاہور سے گئے

۱۔ ریاض الفصحا (تذکرۂ ہندی گویاں) مؤلف غلام ہمدانی مصحفی ، مرتبہ مولوی عبدالحق ، طبع اول ، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ، ۱۹۳۴ع ، ص ۳۲۳ ۔

۲۔ تذکرۂ رشک چمن مسمول بہ بزم سخن ، مطبع نامی آگرہ ، ۱۸۸۱ع ، ص ۱۱۰ ۔

۳۔ تذکرۂ سراپا سخن ، ص ۳۸۳ ۔

تھے -"[1]

تحقیق کے طور پر یہ باتیں درست سہی کہ ان کے آبا کہاں کے تھے یا وہ متبنٰی تھے یا نہیں ، مگر میرے خیال میں زیادہ اہم وہ حالات ہیں جن میں انھوں نے شعور کی آنکھ کھولی ، پروان چڑھے ، شعر و ادب کے اثرات قبول کیے اور شاعری میں اپنا لوہا منوایا -

یہ بات متنازعہ نہیں ہے کہ ان کا بچپن فیض آباد میں گزرا - اس سے پہلے کی خبر مولانا رغمی کے بیان کے مطابق اس قدر ملتی ہے کہ وہ کمسنی میں ہی فیض آباد آ گئے تھے :

"ان کے والد لاہور سے گئے تھے - بنفشہ اور زعفران وغیرہ اشیاء قیمتی کابل و کشمیر کی تجارت کرتے تھے - شیخ مرحوم بعالم خورد سالی ہمراہ تھے -"[2]

اگر یہ بیان درست ہے تو ان کی پیدائش بھی لاہور میں ہوئی ہوگی -

اس کے بعد کے حالات کا جائزہ لیں تو ان کا ابتدائی زمانہ کچھ اس طرح سے مرتب ہوتا ہے کہ فیض آباد میں جوان ہوئے - اس زمانے کے رسم و رواج کے مطابق ورزش کرتے تھے اور ورزش بھی ایسی کہ "ہزاروں ڈنڈ کرتے اور سیکڑوں ہاتھ جوڑیوں کے ہلاتے -"[3]

---

۱ ، ۲- آب حیات ، طبع ثانی ، وکٹوریا پریس لاہور ، ۱۸۸۳ع ، ص ۳۵۴ (حاشیہ) -

۳- گل رعنا ، طبع چہارم ، مطبع معارف اعظم گڑھ ، ص ۳۵۳ -

مولانا رغمی کے حوالے سے ''آبِ حیات'' میں درج ہے کہ :

''۱۲۹ ڈنڑ کا تو معمول تھا کہ ''یا غفور'' کے عدد ہیں ۔ یہ وظیفہ قضا نہ ہوتا تھا ۔''[1]

جو سراپا ، صاحبِ ''گلِ رعنا'' نے بیان کیا ہے اس سے شاعر سے زیادہ پہلوان نظر آتے ہیں :

''سیاہ فام ، مضبوط گٹھا ہوا بدن ، سر منڈا ہوا ، داڑھی خشخشی ، بانکپن کے ساتھ جاڑوں میں شب کو نواب[2] صاحب کے مکان کے پنبئی پردے اوڑھتے اور دن کو باریک ململ کے کپڑے پہن کر ادھر آدھر اکڑا پھرتے ۔''[3]

یہاں ناسخ کے سلسلے میں قابلِ ذکر بات ان کا فیض آباد سے لکھنؤ آنا تھا اور اس ضمن میں نواب محمد تقی کی ذات اہمیت کی حامل ہے جو امیر تو فیض آباد کے تھے مگر ناسخ کو ملازم رکھ کر لکھنؤ لانے والے وہی تھے ۔ انھیں ایک تو بانکوں کو ملازم رکھنے کا شوق تھا ، دوسرا شعر و شاعری کا ذوق ۔ خود چونکہ شاعر تھے لہٰذا شعرا سے سلوک بھی اچھا تھا ، اور اسی سبب سے ان کے ہاں شاعروں کا جمگھٹا رہتا تھا ۔ شعر و شاعری کی ان محفلوں سے ناسخ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے اور بعد میں تو انھیں شعر سے عشق ہو گیا ۔ مگر اس عشق کی پہلی چنگاری نواب محمد تقی کی ملازمت ہی میں سلگی ۔

۱۔ آبِ حیات ، طبع دوم ، وکٹوریا پریس لاہور ، ۱۸۸۳ع ، ص ۲۵۷ ۔
۲۔ نواب محمد تقی ۔
۳۔ گلِ رعنا ، طبع چہارم ، مطبع معارف اعظم گڑھ ، ص ۲۹۴ ۔

پھر وہ زمانہ آیا جب لکھنؤ جرأت کی گرم بازاری سے تپنے لگا ۔ ہر طرف شعر و شاعری کے ہنگامے تھے اور ان ہنگاموں میں سب سے بڑا ہنگامہ تو انشا و مصحفی کے درمیان تھا ۔ ایسے میں ناسخ کے اندر کی چنگاری نے شعلے کا روپ دھار لیا تھا ۔ شعر سے ان کی وابستگی کئی گنا بڑھ چکی تھی مگر وہ اس کا اظہار نہیں کر رہے تھے ۔ شاید اس لیے کہ وہ ابھی باقاعدہ کسی کے شاگرد نہ ہوئے تھے ، چپکے چپکے شاعری کرتے تھے ۔

مؤلف ِ ”گل ِ رعنا“ نے بعض لوگوں کا نام بتائے بغیر لکھا ہے کہ ابتدا میں مصحفی سے اصلاح لیتے تھے ۔ اور یہ روایت بھی کی ہے کہ محمد عیسیٰ تنہا شاگرد ِ مصحفی سے تنہائی میں مشورہ کرتے تھے ۔ اور اس روایت کی بنیاد وہ فقرہ بتایا ہے جو حسرت موہانی نے ”اردوئے معلیٰ“ میں مصحفی کے دیوان ِ ششم کے دیباچے سے نقل کیا تھا ۔ وہ فقرہ یوں ہے :

”حصہ نعمت الوان این خوان بہ شیخ ناسخ کہ یکے از دوستان محمد عیسیٰ تنہا است ، بفقیر ہم رسوخی ز تہ دل دارد ، مقسوم گشت ۔“[۱]

نواب سید علی حسن بھی ادھر ہی اشارہ کرتے ہیں :

”ناسخ شیخ امام بخش ابن شیخ خدا بخش تاجر لاہوری از گرامی سخنوران و نامی قافیہ سنجان لکھنؤ بودہ است ۔ آوردہ اند کہ از محمد عیسیٰ تنہا اصلاح میگرفت ۔“[۲]

۱۔ گل رعنا ، طبع چہارم ، مطبع معارف اعظم گڑھ ، ص ۲۸۳ ۔ حسرت نے ...

۲۔ تذکرۂ رشک چمن ، مسمیٰ بہ بزم سخن ، مطبع نامی آگرہ ، ص ۱۲۰ ۔

قطب الدین باطن کا بیان ہے کہ وہ کسی کے شاگرد نہ تھے :

"۔ ۔ ۔ کسی کو گمان ہے کہ شاگردِ آتش محترم ہیں ، کوئی بیان کرتا ہے کہ ان کے استاد مرزا اکرم ہیں ۔ غرض مختلف روایات کا بیان ہے ، ہر عاصی کے ذہنِ ناقص کے نزدیک یہ کامل دور تر از این و آن ہے ۔ ۔ ۔ کسی کے شاگرد نہیں اور سب کے استاد ہیں ۔ جس کا اعتقاد راسخ ہے وہ معتقدِ ناسخ ہے ۔ ۔ ۔"[1]

کسی کے استاد ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں سب سے دلچسپ روایت "آبِ حیات" میں آزاد نے درج کی ہے ۔ اصل میں یہ ناسخ کا اپنا بیان ہے ۔ پہلے آزاد خود لکھتے ہیں کہ "شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے مگر ابتدا سے شعر کا عشق تھا ۔"

پھر لکھتے ہیں :

"(مولانا رغمی فرماتے ہیں) مجھ سے خود شیخ صاحب نے آغازِ شاعری کا حال نقل فرمایا کہ میر تقی مرحوم ابھی زندہ تھے جو مجھے ذوقِ سخن نے بے اختیار کیا ۔ ایک دن اغیار کی نظر بچا کر کئی غزلیں خدمت میں لے گیا ۔ انھوں نے اصلاح نہ دی ۔[2] میں دل شکستہ ہو کر

۱۔ تذکرۂ گلستانِ بے خزاں ، معروف بہ "نغمۂ عندلیب" ، مطبع نامی نول کشور ، ۱۸۷۵ء ، ص ۲۳۸ ۔

۲۔ مولانا آزاد نے اپنی طرف سے جو حاشیہ لکھا ہے دلچسپ ہے ۔ لکھتے ہیں : "ان کی طبیعت اور زبان دونوں ان سے میل کھانے والی نہ تھیں اور بے دماغی اس پر طرہ ۔ افسوس ! میر صاحب نے جو الفاظ فرمائے ہوں گے ، سننے کے قابل ہوں گے ، مگر شیخ صاحب نے وہ کسی کو کب سنائے ہوں گے ۔" (آبِ حیات ، ص ۳۵۶) ۔

چلا آیا اور کہا کہ میر صاحب بھی آخر آدمی ہیں، فرشتہ تو نہیں۔ اپنے کلام کو آپ اصلاح دوں گا۔ چنانچہ کہتا تھا اور رکھ چھوڑتا تھا۔ چند روز کے بعد پھر دیکھتا، جو سمجھ میں آتا اصلاح کرتا اور رکھ دیتا۔ کچھ عرصے کے بعد پھر فرصت میں نظرثانی کرتا اور بناتا۔ غرض مشق کا سلسلہ برابر جاری تھا لیکن کسی کو سناتا نہ تھا۔ جب تک خوب اطمینان نہ ہوا، مشاعرے میں غزل نہ پڑھی، نہ کسی کو سنائی۔۔۔"[1]

ان سب حوالوں سے یہی بات معتبر معلوم ہوتی ہے کہ ناسخ باقاعدہ کسی کے شاگرد نہ تھے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ناسخ کی تربیت میں ان محافل اور صحبتوں کا بڑا دخل ہے جو شعر و شاعری کے وسیلے سے مرزا حاجی[2] کے ہاں منعقد ہوتی تھیں۔ انہی محفلوں میں ناسخ نے جرأت، انشا، مصحفی جیسے اہلِ کمال و ہنر کو نہ صرف قریب سے دیکھا بلکہ ان کے ہنگاموں کا مشاہدہ بھی کیا اور سنا بھی۔ ان کے علاوہ مرزا قتیل جیسے فارسی داں اور قاضی محمد صادق خاں اختر جیسے اہلِ ہنر بھی ان محفلوں کی رونق تھے۔

۱۔ آبِ حیات، ص ۳۵۶۔
۲۔ مرزا حاجی لکھنؤ کے بڑے عالی خاندان امیر زادے تھے۔ ان کا نام قمر الدین احمد تھا۔ خاندانی حیثیت سے مرزا زین الدین عالمگیری کی اولاد میں تھے۔ علوم و فنون میں ماہر تھے اور شعر کا بہت ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ نواب غازی الدین حیدر کے زمانے میں دربار میں اثر و رسوخ بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ پانچ ہزار ماہوار مقرر تھا اور اہلِ ذوق کی محفلوں کی وجہ سے ان کا گھر ایک دبستان کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

شعر و سخن کے ساتھ ساتھ زبان کی تراش خراش اور تحقیق پر مباحثے بھی ہوتے تھے اسی محفل میں ناسخ کے شوقِ شعر کی نشو و نما ہوئی اور اسی صحبت نے ناسخ کے اصلاحِ زبان کے ذوق و شوق کو پروان چڑھایا۔

اعلیٰ درجے کی ان صحبتوں اور مشاعروں نے جو کچھ ناسخ کو دیا انھوں نے کئی گنا کر کے قارئین کو لوٹا دیا اور اس طرح ناسخ نہ صرف بڑے شاعر بلکہ اپنے عہد میں شاعری کے تاجدار بھی سمجھے گئے۔ لہٰذا نواب محمد تقی کی ملازمت کے بعد دوسری قابلِ ذکر شخصیت مرزا حاجی کی قرار پاتی ہے جن کی قربت نے ناسخ کے ذوق و شوق کے دھارے ہی موڑ دیے اور شعر کا وہ دیا، جو ان کے اندر کہیں جھلملا رہا تھا، فانوس میں بدل گیا۔ زبان کی تراش اور تحقیق کی طرف مائل کرنے میں بھی مرزا حاجی کی ان مجلسوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اور شروع میں جو ان کے کلام میں زور بڑھنے لگا تو اس میں بھی ان کی ہمت افزائی ہی کارفرما نظر آتی ہے۔ کیونکہ ابھی تک ناسخ نے باقاعدہ مشاعرے میں غزل نہ پڑھی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ شعر و سخن کے اتنے ہنگامے تھے اور ایسا ایسا معرکہ دیکھنے میں آتا تھا کہ ہفتوں اس کی یاد تازہ رہتی اور مباحث کے نئے در وا ہو جاتے۔ ایک سے ایک بڑے استاد کے ہوتے ہوئے ناسخ مشاعرے میں کچھ پڑھنے سے گریز کرتے رہے۔

مشاعروں کا اتنا زور ہونے کے باوجود غزل پڑھنے سے گریز کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کسی مشاعرے میں غزل پڑھنا ایک امتحان سے کم نہ تھا۔ مضمون کیا ہے؟ کیسے باندھا گیا ہے؟ ہر شریک شاعر کے ہاتھ میں ایک کسوٹی ہوتی تھی اور وہ پڑھنے والے کے

عیوب کی تلاش میں رہتے تھے ۔ شعر میں معمولی لغزش پر پگڑیاں اچھال دی جاتی تھیں ۔ لہٰذا کبھی مشاعرے میں غزل پڑھنا اور پگڑی بچا کر، آبرومندانہ واپس آ جانا کامیابی کی دلیل بھی تھی اور سند بھی ۔ چنانچہ ناسخ کا اپنے ابتدائی زمانے میں مشاعرے میں شریک ہونا مگر غزل نہ پڑھنا ایک طرح کی احتیاط تھی ۔ وہ مشاعرے میں شریک ہوتے، سنتے، اور سمجھنے کے ساتھ ساتھ مشاعرے کے اس ماحول سے مانوس ہوتے چلے گئے ۔ وہ سارے معرکے انھوں نے قریب سے طالب علمانہ طور پر دیکھے تھے اور بہت کچھ سیکھا اور اپنی ذہنی فضا کی تہذیب بھی کی ۔ شعر و شاعری کے سنگلاخ راستوں سے آشنا ہوئے اور پھر جب مشاعروں میں انشا و مصحفی کے معرکے ذرا کم ہوئے اور ان کی اپنی مشق بھی پوری ہوئی تو ان کے لیے زمین ہموار اور تیار تھی ۔ وہ میدان شعر میں کود پڑے، اور یوں کہ شہرت و ناموری میں زیادہ دن نہیں لگے ۔ باوجود اس کے کہ وہ دیر سے اس سبزہ زار میں آئے تھے مگر دیکھتے ہی دیکھتے استاد مان لیے گئے ۔ نہ صرف استاد بلکہ ادب ساز کہلائے ۔

خود ناسخ کے اپنے بیان سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے جو آزاد نے مولانا رغمی کے حوالے سے درج کی ہے :۔

”۔ ۔ ۔ جب تک خوب اطمینان نہ ہوا، مشاعرے میں غزل نہیں پڑھی، نہ کسی کو سنائی ۔ مرزا حاجی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا ۔ سید انشاء، مرزا قتیل، جرأت، مصحفی سب شعرا جمع ہوتے تھے ۔ میں جاتا تھا، سب کو سنتا تھا مگر وہاں کچھ نہ کہتا تھا ۔ ۔ ۔ غرض سید انشا اور

مصحفی کے معرکے بھی ہو چکے، جرأت اور ظہور اللہ خاں کے ہنگامے بھی طے ہو گئے تو میں نے غزل پڑھنی شروع کی ۔۔۔ مرزا حاجی، مرزا قتیل اور حاجی محمد صادق خاں اختر نے بڑی قدر دانی کی ۔۔۔ کلام نے روز بروز رنگ پکڑنا شروع کیا۔"[1]

شعر و شاعری اور مشاعروں کی محافل کا بازار پورے لکھنؤ میں گرم تھا مگر اس کے ساتھ علمی تحقیق اور اصلاحِ زبان کا سلسلہ بھی کچھ ایسا پھولا پھلا کہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا، جس میں ناسخ خصوصی اور مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی تحریک کی بدولت لکھنؤ، دلی کے مقابلے میں ادب کا دبستان اور مرکز ہونے کا دعوے دار تھا۔ اور شاید یہ بات درست بھی تھی۔ اس لیے کہ دلی کی پوری انجمن ہی لکھنو میں اٹھ آئی تھی اور یہ سلسلہ دلی کی تباہی سے شروع ہو گیا تھا۔ اور جو دہلی کے نہیں تھے۔ انھوں نے بھی لکھنؤ ہی کو اپنا ٹھکانا بنایا۔ کس کس کا نام گنوایا جائے۔ میر سوز دلی میں پیدا ہوئے مگر لکھنؤ آ گئے اور مرتے دم تک رہے۔ میر تقی جیسا وضع دار شاعر بھی اس مراجعت سے نہ بچ سکا۔ شروع میں ان کی وضع داری نے انھیں دلی سے نکلنے نہ دیا مگر جب پانی سر سے اونچا ہو گیا۔ تو نکلنا پڑا بقولِ مرزا لطف ۱۱۹۷ھ میں ساٹھ برس کی عمر میں لکھنؤ آ گئے اور ۱۲۲۵ھ میں فوت ہو کر وہیں دفن ہوئے۔

۱۔ آبِ حیات، طبع دوم، وکٹوریہ پریس لاہور، ۱۸۸۳ع، ص ۳۵۶ - ۳۵۷۔

میر سے پہلے میرزا رفیع سودا بھی جب تک ہو سکا دلی میں رہے۔ پھر فرخ آباد ہوتے ہوئے فیض آباد آ گئے۔ عمر اس وقت ان کی بھی ساٹھ برس کی ہو چکی تھی۔ بہرحال آصف الدولہ کے ساتھ لکھنؤ آ گئے اور ستر برس کی عمر میں (۱۱۹۵ھ) انتقال کیا اور آغا باقر کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔

غلام ہمدانی مصحفی دلی سے نکلے، لکھنؤ پہنچے۔ دل نہ لگا واپس دہلی چلے گئے۔ مگر روزی روٹی کی مجبوری تھی یا لکھنؤ کی کشش، پھر لکھنؤ چلے آئے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔

جرأت کا خاندان دہلی سے فیض آباد آیا۔ جرأت وہیں پروان چڑھے اور پھر مرزا سلیمان شکوہ کے دربار تک رسائی حاصل کی۔

اسی طرح سید انشا، گو ان کا معاملہ ذرا مختلف ہے کہ ولادت مرشد آباد میں ہوئی مگر پل بڑھ کر پہلے دلی کا رخ کیا، مگر دلی میں ہر طرف تباہی کے سوا کیا تھا، لہٰذا لکھنؤ آنے میں ہی عافیت سمجھی اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں رسائی حاصل کی۔

آتش کا خاندان دہلی سے مراجعت کر کے فیض آباد پہنچا تھا۔ آتش وہیں پیدا ہوئے، پروان چڑھے اور پھر شیخ ناسخ ہی کی طرح پہلی ملازمت نواب محمد تقی کے ہاں کی کیونکہ وہی انہیں لکھنؤ لائے تھے۔

ان کے علاوہ بھی بہت لوگ تھے۔ میر ولی اللہ محب، مرزا قتیل، قاضی محمد صادق خاں اختر، ہر شخص اپنی ذات میں انجمن تھا۔

ان سب اہل ہنر کا تھوڑے بہت وقفے کے ساتھ لکھنؤ میں جمع ہو جانا ایک بڑے تہذیبی عمل کی نشان دہی کرتا ہے۔ لکھنؤ

ادب کا مرکز کہلایا تو اسی عمل کے نتیجے میں ۔

میر سوز، میر تقی اور سودا کو چھوڑ کر باقی اہلِ کمال کو مرزا حاجی نے اپنے تقرب کے وسیلے سے ایک جگہ جمع کر لیا تھا جہاں فن کے ساتھ اہلِ فن کی بھی خدمت ہوتی تھی ۔ ہرچند کہ یہ سب لوگ شعر و شاعری اور علمی مباحث کی محفلوں میں ایک جگہ اکٹھے تھے مگر اپنے ہنر اور کمال میں ہر ایک، دوسرے سے علیحدہ تھا ۔ اس قدر منفرد کہ شاعری اور اس کا معیار، شعر کا لہجہ اور رنگ روپ، اور خصوصاً شاعر کا مزاج اور تشخص الگ جھلکتا تھا ۔ فن اور اس کے اظہار کے مراحل میں اپنی منفرد چھاپ کو زیادہ مستند ثابت کرنے کی کوشش میں ہنگاموں اور ادبی معرکوں کا ہونا لازمی تھا، سو ہوئے ۔ ان معرکوں اور ہنگاموں کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ شاعری کی چھان پھٹک اور زبان کی تحقیق پر کام ہوتا رہا اور خوب سے خوب تر کی جستجو ہمیشہ رہی ۔ کیا کیا معرکے ہوئے اور کیسی کیسی محفل کی بساط الٹی مگر شعر میں نئے نئے رنگ نکھر کر سامنے آ گئے اور اس فضا نے لکھنؤ کو مرکزِ ادب ہی نہیں بنایا اس کی حیثیت کو مسلم اور مستحکم بھی کر دیا ۔ اور لکھنؤ کی بات سند ہوئی جسے مولانا آزاد نے "لکھنؤ کی زبان اب دلی کی قیدِ تقلید سے آزاد ہے" کے عنوان سے درج کیا ہے ۔[1]

۱۔ "آخر دلی بھی ایک ہی دن میں شاہ جہان آباد نہیں ہو گئی تھی ۔ میر تقی اور میرزا رفیع پیدا ہوتے ہی میر اور سودا نہیں ہو گئے ۔ جب کلام کا سلسلہ یہاں تک پہنچا تو اس قدر کہنا واجب ہے کہ اس عہد تک شعرائے لکھنؤ ان استادوں کے شاگرد تھے جن کا

[بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر]

لکھنؤ اور طرزِ لکھنؤ اس مقام پر تھے کہ مرزا غالب بھی اسے ''پسندیدہ'' اور ''منتخب'' جانتے ہیں ۔ لکھتے ہیں :

''مرزا حیدر علی افصح را فردِ کامل دیدہ ام ۔ روشے پسندیدہ و طرزے گزیدہ دارد و ہمیں است طرز مکرمی شیخ امام بخش ناسخ و خواجہ حیدر علی آتش و دیگر تازہ خیالانِ لکھنؤ ۔''[1]

وہ مرزا حیدر علی افصح کو فردِ کامل کہتے ہیں اور ان کی روش کو پسندیدہ اور طرز کو منتخب جانتے ہیں ۔ اور یہ بھی کہ یہی شیوہ ناسخ و آتش اور دیگر تازہ خیالانِ لکھنؤ کا ہے ۔ غالب کا یہ کہنا ہی لکھنؤ کے ادبی استحکام کو سند دینا ہے ۔

ہرچند کہ سارا تانا بانا معنوی خوبیوں سے زیادہ لفظی حسن کے گرد ہی بنا جا رہا تھا ۔ اس جوش میں صنائع بدائع کا استعمال ہی نہیں بڑھا بلکہ مبالغے کی شدت ، تشبیہوں اور استعاروں کی بھرمار ، ذو معنی الفاظ ، لفظی رعایتیں نہ صرف عام ہوئیں بلکہ ان کا استعمال جنون کی حد تک بڑھ گیا ۔ اس جنون میں بلند پایہ مضامین ، مشکل پسندی

[بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ]
دریائے کمال دلی کے سرچشمے سے نکلا تھا اور فصحائے لکھنؤ بھی ہر محاورے کے لیے دلی ہی کو فخر سمجھتے تھے کیونکہ وہ اکثر انھی بزرگوں کے فرزند تھے جنھیں زمانے کی گردش نے اڑا کر وہاں پھینک دیا تھا ۔ پس شیخ صاحب اور خواجہ حیدر علی آتش کے کمال نے لکھنؤ کو دلی کی قید پابندی سے آزاد کرکے استقلال کی سند دی اور وہی مستند ہوئی ۔ اب جو چاہیں سو کہیں ہم نہیں روک سکتے ۔''
(آبِ حیات ، ۱۸۸۳ع ، ص ۳۸۲) ۔

۱۔ مجموعۂ نثر غالب ، مجلس ترقی ادب لاہور ، ص ۴۰ ۔

کی نذر ہونے ، عربی الفاظ کا استعمال بڑھا اور شعوری طور پر محاوروں اور اصطلاحات کو نئے سرے سے بدلا جانے لگا ۔ خصوصاً دلی کے محاوروں اور الفاظ کے مقابلے میں ۔ اس سے فائدہ ہوا تو بس اتنا کہ بعض الفاظ خوبصورت ہو گئے اور بعض لفظوں کا ایک نیا روپ سامنے آیا ۔ مگر کہیں یہ صورت مضحکہ خیز اور کہیں محض تکلف کے ذیل میں بھی نظر آئی ، کیونکہ محاورے ، الفاظ اور تذکیر و تانیث نئے سرے سے بدلے گئے ۔ لگتا یہی ہے کہ دبستان دہلی کی سند ، لکھنؤ والوں کے نزدیک غیر معتبر ٹھہر گئی تھی ۔ چند محاورے ، الفاظ اور تذکیر و تانیث بالکل سامنے دکھائی دے رہے ہیں :

محاورے

دہلی	لکھنؤ
میری شیروانی سل گئی	میری شیروانی سی گئی
,, ,, دھل گئی	,, ,, دھو گئی
کھویا گیا	کھو گیا
جیسا ، جیسے	کے ایسا ، کے ایسے
ہاں	کے یہاں
اجالا	اجیالا
بانسری	بانسلی
تیرنا	پیرنا

لفظوں اور محاوروں تک تو یہ بات شاید زبان کو وسعت دینے کی کوشش ہو مگر تذکیر و تانیث میں جو اختلاف پیدا کیا گیا تو یہ محض دلی والوں سے اپنا الگ تشخص قائم کرنے کا شعوری عمل

تھا یا تہذیبی سطحوں پر زبان کے بعض زاویوں سے اختلاف کرنے کا
جنون ۔ مثلاً :

دہلی ... لکھنؤ

التماس	(مذکر)	التماس	(مؤنث)
سانس	(")	سانس	(")
زنار	(")	زنار	(")
رسم	(مؤنث)	رسم	(مذکر)
دسترس	(")	دسترس	(")
فاتحہ	(")	فاتحہ	(")
گیند	(")	گیند	(")

کوئی کامپلکس ضرور تھا جو محض برابری کی سطح پر آنے
کے لیے نہیں تھا بلکہ محسوس یہ ہوتا ہے کہ اپنی برتری ثابت کرنے
کی ضد بن گیا تھا ۔

تاہم اس حد تک ضرور سودمند ہوا کہ متروکات اور مختارات
میں بہت کچھ کام ہوگیا اور زبان کی اصلاح ہوئی ۔

یعنی آئے ہے ، جانے ہے ، کہے ہے ، کھوئے ہے ، دونوں
ہوں ، لوں ہوں ، کبھو ، کسو ، آئیاں ، جائیاں ، رقیباں ، خوباں
وغیرہ کو آتا ہے ، جاتا ہے ، کہتا ہے ، دیتا ہوں ، لیتا ہوں ،
کبھی ، کسی ، آ کے یا آ کر ، گئیں ، رقیبوں اور خوبوں میں بدل
دیا گیا ۔ فہرست طویل ہے مگر اسی پہ اکتفا کرتا ہوں ۔ ثابت
یہ کرنا ہے کہ زبان کی اصلاح اور تراش خراش میں جو حصہ ناسخ
اور اس کے شاگردوں کا ہے وہ کسی دوسرے کا نہیں ۔

ناسخ نے اصلاح زبان میں حشو و زواید کو کم کیا اور زبان کا جھول دور کرکے اظہار کو بے ساختہ اور چست بنایا۔ اس سے پہلا فائدہ تو یہ ہوا کہ زبان کا جمالیاتی حسن قائم ہوا اور وہ بہتر ہوئی۔ اس کے علاوہ ناسخ نے غلط محاورے کو بھی معتبر جان کر قبول کیا مگر فصاحت پر زیادہ زور دیا اور لغوی صحت کو پیش نظر رکھا۔ اور یہ کوشش بھی کی کہ دوسری زبان کا لفظ دب نہ جائے، کیونکہ اردو ہر زبان کے الفاظ کے خمیر سے وجود میں آئی ہے لہٰذا اس میں ہر لفظ ہی اردو کا سمجھ کر استعمال کرنا چاہیے۔ البتہ وہ الفاظ جو فارسی کے ہوں یا عربی کے یا مقامی بولی سے لیے گئے ہوں اگر ان کے استعمال سے جمالیاتی احساس مجروح ہوتا ہے تو ناسخ کے نزدیک انھیں ترک کر دینا ہی بہتر ہے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ اردو کے صحیح مزاج دان تھے اور ان کی مساعی سے زبان میں وسعت آئی اور اس وسعت کو قبول بھی کیا گیا۔ نہ صرف لکھنؤ میں بلکہ دہلی میں بھی۔ حتٰی کہ اساتذۂ دہلی نے بھی اس پر صاد کیا۔ چنانچہ ناسخ کے ان کارناموں کو ان کے اپنے عہد کے علاوہ بعد میں بھی اچھے الفاظ میں سراہا گیا۔ مثلاً صفیر بلگرامی کا بیان ہے:

”غالب سے ایک دن کچھ دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا ذکر آ گیا۔ فرمایا میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے، ورنہ بولنے کو کون نہیں بولتا۔ اب جس کا جی چاہے تراش خراش روز کرے مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش

کی جگہ ہی نہیں چھوڑ گیا ہے"۔[1]

غالب کے بعد کسی اور سند کی ضرورت نہ سہی مگر امداد امام اثر کی بات بھی درج کرنے کے قابل ہے ۔ وہ "کاشف الحقائق" میں لکھتے ہیں :

"شیخ نے اردو کو تراش خراش کر ایسا درست کر دیا کہ اب اس کی لطافت اور صفائی فارسی سے کچھ کم نہیں معلوم ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ اگر جناب شیخ کو اصلاحِ زبان کی طرف توجہ نہ ہوتی تو زبان حال کی یہ صورت پیدا نہ ہوتی ۔"

زبان کے حوالے سے ناسخ کی پہچان اپنی جگہ ، مگر شاعری میں بھی وہ اپنا مقام پیدا کر چکے تھے ۔ حالانکہ اس وقت لکھنؤ میں دو سکول قائم ہو چکے تھے ۔ ایک ناسخ کا ، دوسرا آتش کا ۔ اور لگتا یوں ہے کہ دونوں سکول سخنوری میں اپنی اپنی حدِ فاصل قائم کر چکے تھے ۔ اسی لیے شعر کے حوالے سے بھی اور مضامین کے حوالے سے بھی دونوں کے رنگ الگ الگ پہچانے جاتے تھے ، اور ہیں ۔ یہ فرق اتنا نمایاں اور واضح ہے کہ شاعر کا نام لیے بغیر غزل پڑھ کر یہ رائے دی جا سکتی ہے کہ اس پر کس سکول کی چھاپ ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ ناسخ اور اس کی پیروی کرنے والوں کا زیادہ زور محاسنِ لفظی ، رعایات اور متعلقات پر تھا اور اس قدر زیادہ تھا کہ بعض اوقات معنوی خوبیاں تک مجروح ہو جاتی تھیں ۔ اس کے برعکس آتش اور تلامذۂ آتش معنی آفرینی اور نئے مضامین

۱۔ جلوۂ خضر ، جلد اول ، بہ حوالہ "ناسخ" ، از سید شبیہ الحسن ، ص ۱۰۱ ۔

کے حوالے سے اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔

دونوں اساتذہ میں سے ہر دو کے تلامذہ کا سلسلہ بھی کافی طویل ہے مگر چند نام جو بے حد اہم ہیں درج کرنے ضروری ہیں۔ مثلاً ناسخ کے شاگردوں میں میر علی اوسط رشک، بحر، برق، تعشق اور آباد وغیرہ بالکل سامنے ہیں، جبکہ تلامذۂ آتش میں جو نمایاں ہوئے ان میں صبا، رند، خلیل اور نسیم کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ہر شاعر اپنے سکول کی آپ پہچان ہے۔ ناسخ اور اس کے تلامذہ مشکل پسندی، شکوہِ لفظی اور مبالغے میں بہت ہی آگے نکل گئے۔ علاوہ ازیں جو فارسی اثرات غیر شعوری طور پر اردو شاعری میں آ چکے تھے، ناسخ نے شعوری سطح پر انھیں اپنایا اور بعض جگہ تو تتبع بھی کیا۔ بسیار نویسی کے باوجود وہ فارسی شاعری سے متاثر نظر آتے ہیں۔ بلکہ اگر کہیں فارسی کے کسی شعر میں انھیں کوئی خیال پسند آ جاتا ہے تو وہ ترجمے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اس طرح بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ فارسی شعر کا لفظی ترجمہ ہو گیا اور بعض اوقات انھوں نے اردو کے انداز بیان میں لطف پیدا کر دیا۔ مثال کے طور پر بیدل کا یہ شعر:

مسی آلودہ ہر لب، رنگِ پان است
تماشا کن، تہِ آتش دخان است

ناسخ لکھتے ہیں:

مسی آلودہ لب پر رنگِ پاں ہے
تماشا ہے، تہِ آتش دھواں ہے

یا پھر شیخ علی حزیں کا یہ شعر :

بوریا جائے من و جائے تونگر قالین
شیرِ قالیں دگر و شیرِ نیستاں دگر ست

ناسخ کہتے ہیں :

فرق ہے شاہ و گدا میں ، قولِ شاعر ہے یہی
شیرِ قالیں اور ہے ، شیرِ نیستاں اور ہے

بیدل کے شعر میں اندازِ بیاں کا لطف ہے جبکہ علی حزیں کے شعر کے ترجمے کے بارے میں مؤلف "جواہرِ سخن" لکھتا ہے :

"ناسخ کے شعر کا دوسرا مصرع علی حزیں کے دوسرے مصرعے سے زیادہ زوردار اور صاف ہے ۔"[1]

بعض مخالفین نے اس طرح کے تمام اشعار کو سرقہ قرار دیا ہے حالانکہ ترجمہ یا توارد کو سرقہ نہیں کہا جا سکتا ۔ ترجمہ شدہ اشعار کا مسئلہ دوسرا ہے مگر ان کی تعداد کے پیشِ نظر کوئی الزام ناسخ پر نہیں دھرا جا سکتا ۔ خود آزاد نے "آبِ حیات" میں سرقہ کا لفظ استعمال تو کیا ہے مگر عنوان میں سرقہ یا توارد لکھ کر سرقہ کا الزام حریفوں کے کھاتے میں ڈال دیا ہے اور خود مبہم لفظوں میں سہی مگر توارد ہی کہا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

"حریف یہ بھی حرف رکھتے ہیں کہ شیخ ناسخ مخلوقِ فارسی کو تناسخ دے کر اردو کی زندگی دیتے تھے ۔"[2]

۱۔ جواہرِ سخن ، جلد سوم ، ہندوستانی اکیڈیمی ، الہ آباد ، صفحہ ج ۔
۲۔ آبِ حیات ، طبع دوم ، وکٹوریہ پریس لاہور ، ۱۸۸۳ء ، ص ۱۷۱ ۔

آگے چند اشعار کی مثال دینے کے بعد آزاد کھلے لفظوں میں اس کی نفی کرتے ہیں:

"اگرچہ اس طرح کے چند اشعار اور بھی سنے جاتے ہیں مگر ایسا صاحبِ کمال، جس کی تصنیفات کمالِ نازک خیالی اور مضامین عالی کے ساتھ ایک مجلد ضخیم میں موجود ہیں، اس پر سرقہ کا الزام لگانا انصاف کی آنکھوں میں خاک ڈالنی ہے۔"[1]

اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ناسخ نے اردو کے طرزِ ادا کی خوبی اور زبان کا جو زور دکھایا ہے وہ صرف انھی کا حصہ ہے۔ اس پر طرہ ان کا قوتِ متخیلہ سے زرخیز ذہن اور مزاج تھا۔ وہ ایک ہی مضمون کو سو رنگوں سے باندھ سکتے تھے۔ زود نویس اتنے کہ کم شعار کی غزل سے ان کی تسلی نہ ہوتی تھی۔ بعض اوقات ایک ہی غزل کہتے ہوئے چوغزلہ کہہ جاتے۔ مضمون ہر مرتبہ نئے رنگ سے جھلکتا۔ تاہم ایسا کرتے ہوئے وہ تمثیل اور مبالغے میں اکثر اعتدال سے گزر جاتے۔ مبالغہ اصلیت سے اس قدر دور ہو جاتا کہ بلند پروازی، پہاڑ کو ذرہ اور سمندر کو قطرہ بنا دیتی۔ لیکن یہ شاید ان کی بسیار نویسی کی ضرورت تھی۔ فرضی تشبیہوں اور استعاروں کو شعر کی بنیاد بناتے ہوئے وہ فارسی الفاظ و تراکیب، مضامین اور طرزِ ادا کو اردو شعر میں ہنرمندی سے سمو لینے کا گر بھی جانتے تھے مگر اس طرح کہ وہ اردو ہی کی ملکیت قرار پائے۔ رہا توارد کا سوال تو وہ اکثر بڑے شعرا کے ہاں بھی مل جاتا ہے۔ فارسی مضامین سے متاثر بعض اشعار تو غالب کے ہاں بھی مل جاتے ہیں۔

۱۔ آبِ حیات، ص ۲۷۶۔

علاوہ ازیں غالب کے ایک مشہور شعر کا مضمون ناسخ کے درج ذیل اشعار میں بھی ملتا ہے جنھیں ہم توارد ہی کہہ سکتے ہیں:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

(غالب)

ناسخ کے تین شعر صرف دیوان اول سے لیے گئے ہیں جو ۱۸۱۶-۱۷ء میں مرتب ہو چکا تھا:

(۱) باغ میں گلبن ہیں گلدستے مزاروں کے تمام
خاک میں کیا کیا ہی گل رخسار پنہاں ہو گئے[1]

(۲) نکلتا ہے جو ہر گل زیرکف گلزار عالم میں
خدا جانے زمیں میں دفن یہ کس کا خزانا ہے[2]

(۳) گلعذاروں کو جو مدفوں لحد کریں قبروں میں
سطحِ خاک سے پیدا کبھی گلزار نہ ہو[3]

ایسی مثالیں ہر شاعر کے یہاں سے دی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا ناسخ پر سرقے کا الزام اور سرقے والی بحث یہیں ختم ہو جانی چاہیے۔

ناسخ کی اصل پہچان وہ ہنر ہے جو قوتِ متخیلہ، نزاکت اور پرشکوہ الفاظ کی آمیزش سے ابھرتا ہے اور اس عہد میں یہ باتیں عیوب کی بجائے محاسنِ کلام کے ذیل میں آتی تھیں، بلکہ بڑا استاد

۱۔ کلیاتِ ناسخ، نول کشور، ۱۸۷۲، ص ۱۳۲۔
۲۔ ایضاً، ص ۲۰۳۔
۳۔ ایضاً، ص ۸۵۔

ہونے کا ثبوت تھیں اور تلامذہ کے لیے سند ۔ لہٰذا ناسخ کی اپنے عہد میں وہی قدر و منزلت ہوئی جو ایک بڑے استاد اور شاعر ساز شخصیت کی ہو سکتی تھی ۔ تلامذہ کا سلسلہ دراز ہوا ، ہر ایک نے آنکھوں پہ بٹھایا ، عزت دی ۔ آتش سے معرکہ آرائی نے گھر گھر چرچا پھیلایا ۔ قاری نے داد اس طرح دی کہ کلامِ ناسخ کے مخطوطے تحفتاً ایک دوسرے کو بھجوائے ۔ مصحفی اور شیفتہ جیسے اساتذہ نے اپنے تذکروں میں تعریف و تحسین کے ساتھ جگہ دی ۔ مگر سچ وہ تجزیہ ہے جو آزاد نے ایک ڈیڑھ سطر میں کر دیا ہے ۔ اختصار کے علاوہ اس میں توازن بھی ہے اور اعتبار بھی :

> "غزلوں میں شوکتِ الفاظ ، بلند پروازی اور نازک خیالی بہت ہے اور تاثیر کم ۔"[1]

بالکل درست ۔ اصل میں تاثیر اور رس کے لیے جذبے کا ہونا لازمی ہے جو ناسخ کی شاعری میں کم ہی ملتا ہے ، کیونکہ شاعر کا مزاج ، زباں دانی پر زور اور اس عہد کے فنی تقاضے ہی یہ تھے کہ ایک ہی مضمون کو کئی زاویوں سے گھما کر کہا جائے ۔ دوسرے یہ بھی کہ ناسخ نے شاعری کا آغاز کسی عشقیہ جذبے سے مغلوب ہو کر یا عشق کے تجربے سے گزر کر نہ کیا تھا ۔ آغازِ جوانی سے ہی ان کی توجہ کا مرکز کسرت تھی جو وہ کرتے تھے ۔ شروع میں کسرت کے حوالے سے اپنے جسم کو خوب سے خوب تر دیکھنے کی خواہش تھی[2] ۔ اس کے بعد تحقیقِ زبان اور شاعری میں اس طرح دھنس گئے کہ شادی کو بھی ضروری نہ سمجھا ۔ عشق کا تجربہ آدمی

۱۔ آبِ حیات ، طبع دوم ، وکٹوریا پریس لاہور ، ۱۸۸۳ع ، ص ۳۶۵ ۔
۲۔ ملازمت بھی ایک بانکے سجیلے نوجوان کے طور پر دی گئی تھی ۔

میں جذبے اور اس کے اظہار کے سو رنگ نمایاں کرتا ہے اور گداز بھی پیدا کرتا ہے ۔ یہ گداز اور جذبے کی فراوانی شاعر کو بھی زندگی عطا کرتی ہے اور شاعری کو بھی ۔ کیونکہ وارداتِ عشق ایک ایسا آئینہ ہے جو آدمی کو حقائق سے قریب تر کر دیتا ہے ۔ یہ سب کچھ نہ ہو تو حقیقتیں اتنی صاف دکھائی نہیں دیتیں ۔ لہٰذا تصنع اور بناوٹ کو کبھی مشکل پسندی سے مصور کیا جاتا تھا اور کبھی ناہموار اور پُر پیچ راستوں پہ چل کر ۔ سو ناسخ مشکل پسندی کے سہارے ہی آگے بڑھے اور ناہموار راستوں اور سنگلاخ زمینوں پر رواں ہو کر انہیں فخر بھی ہوا ۔

ہرچند کہ ان کے ہاں بعض غزلیں اور اشعار سادہ اور سلیس اندازِ بیان اور معنوی خوبیوں سے بھرپور ملتے ہیں مگر بہت محدود حد تک ۔ ثابت ہوا کہ وہ اس ہنر کو جانتے تھے مگر آتش سے معرکہ آرائی نے انہیں اپنی الگ پہچان دے دی تھی اور مشکل سے مشکل اندازِ بیان اور پُر پیچ راستوں کو ہی اپنے فن کی معراج سمجھنا ان کے لیے ضروری ہو گیا تھا ۔ یہ بھی نہیں کہ وہ معنوی خوبیوں سے پُر شاعری کر کے غیر مقبول ہو جاتے ، نہ ہی ان کی قدر و منزلت میں فرق آ جاتا ۔ اگر ایسا ہوتا تو آتش بہت غیر مقبول شاعر ہوتے جو کہ نہ تھے بلکہ بعد کے زمانوں میں تو ان کی شہرت ، معنوی خوبیوں اور پُر تاثیر ہونے کے باعث اور بڑھ گئی ۔ وجہ یہ تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فن کے پیمانے بدلتے چلے گئے اور ایک زمانہ آیا کہ نفسِ مضمون ، سادگی ، سلاست ، معنویت ، جذبہ اور روانی ہی فن کا حسن قرار پائیں اور آتش زیادہ بہتر شاعر سمجھے جانے لگے ۔ شاید بڑے شاعر کی پہچان بھی یہی ہے کہ وہ آنے والے زمانوں میں زندہ اور موثر ہوتا چلا جاتا ہے ۔

یہی مثال نظیر اکبر آبادی کے بارے میں بھی دی جا سکتی ہے ۔ ان کے عہد کے دبستانوں نے انہیں فصاحت سے عاری ، فحش گو اور بے مزہ شاعر قرار دے دیا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ فیصلہ ان کے حق میں ہوگیا ، کیونکہ بعد کے زمانوں میں ارد گرد کے تعصبات کی پرتیں خود بخود اتر جاتی ہیں اور نیا شعور ، غیر جانب دارانہ طور پر فن پارے کو نئے پیمانوں سے پرکھتا ہے۔ اور چونکہ زبان کے مقابلے میں نفسِ مضمون اور جذبہ و خیال کی اہمیت برتر تسلیم کی گئی ہے لہٰذا محض زبان اور اس کے چٹخارے کی حد تک کی گئی شاعری افضل نہ کہلا سکی ۔ اور نظیر ایک بڑے شاعر قرار پائے ۔

تاہم ناسخ کے ساتھ مجبوری یہ تھی کہ وہ قصیدے کا مزاج لے کر پیدا ہوئے تھے لہٰذا مضامینِ خیالی اور شکوہِ الفاظ ہی ان کا فن ٹھہر گیا ۔ ہمہ وقت شاعری کرنا ، شاگردوں کے ساتھ مشاعروں میں شرکت اور ان مشاعروں کا خصوصی مزاج اس فن کا مقتضی تھا جہاں زبان کے پینتروں اور الفاظ کے بھاری بھر کم بوجھ سے حریف کو پھیکا کر دینا ہی سب سے بڑی کامیابی تھی ۔ سو یہ ہتھیار کارگر ہوتے چلے گئے ۔

تھوڑا بہت انداز بدل جاتا تھا ۔ نہیں بدلتا تھا تو گل و بلبل ، مصنوعی عشق و محبت اور جدائی و وصال کے قصے نہ بدلتے تھے ۔ اور بدلتے بھی کیسے ؟ ایسے معاشرے میں جہاں محبت کرنے کی آزادی بس اسی قدر ہو کہ غیر ممکن مفروضوں پر عشق کی بنیاد رکھی جائے ، وہاں موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا ۔ اور

اس کے بغیر یہ ایک تھکا دینے والا عمل بن جاتا ہے جو ناسخ نے مسلسل انجام دیا ۔ اور یہی ناسخ کی خوبی بھی ہے کہ وہ خود نہیں تھکتے ، قاری کو تھکا دیتے ہیں ۔ خصوصاً آج کے قاری کو ۔

یہ سب ٹھیک سہی مگر ان باتوں کے باوجود ناسخ کی ادبی حیثیت میں فرق نہیں آتا ۔ رہی ان کی سماجی حیثیت تو وہ کسی طور کم نہ تھی ۔ ایک شاعر کے لیے آزادانہ طور پر خوش حال زندگی گزار لینا ، اور وہ بھی جاگیردارانہ نظام میں ، کوئی چھوٹا واقعہ نہیں ہے ۔ ناسخ نے ممکن حد تک یہ کر دکھایا ۔ سوائے نواب محمد تقی کی ملازمت کے ، جو شروع عہد میں تھی اور شاعر کی حیثیت سے بالکل نہ تھی ، ناسخ نے ملازمت نہیں کی ۔ مگر زندگی آزاد اور رہن سہن کے لحاظ سے (قصیدہ کہے بغیر) ٹھاٹھ سے گزاری ۔ اس کی ایک وجہ تو وہ ورثہ تھا جو انہیں منتقل ہوا تھا ۔ وہ والد کی طرف سے ہو یا لے پالک بیٹے کے طور پر ملا ہو ، مگر ملا ضرور تھا ۔ ان کی بود و باش اس بات کی غماز ہے کہ وہ دولت مند تھے یا ہو گئے تھے ۔ ٹکسال میں گھر لے کر رہے جو اُن دنوں امرا کی رہائش گاہوں کے لیے مشہور تھا ۔ دولت کے حاصل ہو جانے کے بارے میں آزاد کی شہادت بھی دستیاب ہے ، یعنی :

”اس دولت مند سوداگر نے کہ لاولد تھا ، بلند اقبال لڑکے کو فرزندی میں لے کر ایسا تعلیم و تربیت کیا کہ بڑے ہو کر شیخ امام بخش ناسخ ہو گئے اور اس مجازی باپ کی بدولت دنیا کی ضرورت سے بے نیاز رہے ۔“[۱]

۱۔ آبِ حیات ، طبع دوم ، وکٹوریہ پرنٹنگ لاہور ، ۱۸۸۳ء ، ص ۳۵۳ ۔

نے آزاد نے ''دنیا کی ضرورت سے بے لحاظ'' لکھا ہے اور یہی وہ نشان ہے جس سے ہم ان کے قصیدہ کہنے سے گریز کا سبب سمجھ سکتے ہیں۔ یہ گریز ایک آدھ روایت میں تو انکار کی صورت میں بھی ملتا ہے، حالانکہ ان کا مزاج اور زمانہ دونوں قصیدہ نگاری کے لیے موزوں تھے۔ تقریباً اسی عہد میں سید انشا، مصحفی، شہید، شاہ نصیر، گویا اور ذوق و غالب نے پرشکوہ قصائد لکھے۔ کوئی بھی قابلِ ذکر شاعر اس سے بچا ہوا نہیں ملتا۔ تاہم لکھنؤ میں دو شاعر ایسے تھے، جنھوں نے اس طرف توجہ نہیں دی ــ ایک آتش، دوسرے ناسخ۔

آتش صوفی مزاج ہونے کے سبب چھوٹ گئے، مگر ناسخ تو دنیا داری کے سارے گر جانتے تھے۔ انھیں اپنی قیمت کا علم بھی تھا، اندازہ بھی۔ پھر کیوں؟۔ ہم ان کی خوش حالی کو بنیاد بنا کر یا پھر ''جانے کیوں'' کہہ کر اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس بات کا کریڈٹ انھیں دینا پڑے گا اور یہ بات ان کی خود داری، انا اور استغنا کے حق میں دلیل کے طور پر بھی پیش کی جا سکتی ہے۔

سید شبیہ الحسن نے اپنی کتاب ''ناسخ'' میں لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانے میں منیر شکوہ آبادی کی تصنیف ''سنانِ دلخراش'' کے مخطوطے کا حوالہ دیا ہے، جس کے حواشی میں یہ درج ہے کہ ناسخ الہ آباد پہنچے تو ان کے پاس قصائد کا ایک مجموعہ تھا جس میں ۹۸ قصیدے اور کچھ امرا کی ہجویں تھیں اور یہ سب مختلف پرچوں پر بدخط لکھے ہوئے تھے کہ ناسخ کے ایک شاگرد نے جعل سازی سے چرا کر ان اشخاص تک پہنچا دیے جن کا ان قصائد

میں ذکر تھا ۔ مگر بعد میں ان قصائد کا کچھ پتہ نہیں چلا ۔ یہ روایت درست معلوم نہیں ہوتی ۔ یوں لگتا ہے کہ اس روایت کی اساس کسی مفروضے پر رکھی گئی ہے ۔ کیونکہ اتنی بڑی تعداد میں قصائد ، ناسخ جیسے شاعر نے لکھے ہوں اور کسی کو خبر تک نہ ہو ، جبکہ ناسخ کے کلام کی نقلیں فوراً ہی تیار ہو کر محفوظ کر لی جاتی تھیں اور نقلیں تیار کرانے میں وہ خود پیش پیش تھے ۔ آزاد کے بیان کے مطابق :

"دو تین خوش نویس کاتب بھی نوکر رہتے تھے ۔ دیوان کی نقلیں جاری تھیں ۔ جس دوست یا شاگرد کو لائق اور شائق دیکھتے اسے عنایت فرما دیتے تھے ۔"[1]

اگر ایسا تھا تو اتنی بڑی تعداد میں لکھے گئے قصائد سے بے خبر رہنا ممکن نہیں رہتا ۔ دوسری بات یہ کہ قصائد لکھ کر نواب یا امیر کے سامنے پیش کرنے کے بجائے ، ان کو رکھ لینا اور جمع کرتے جانا اس روایت کو کمزور بناتا ہے اور تیسری بات یہ کہ قصائد انھی لوگوں کے پاس پہنچا دیے گئے تھے جن کی شان میں تھے یا جن کا ان میں ذکر تھا ، تو ان کے تلف ہو جانے یا چھپائے جانے کا جواز نہیں رہتا ۔ ان ۹۸ افراد میں سے کسی ایک کی شہادت موجود ہونی چاہیے ، جبکہ ان کے قصیدے نہ کہنے کی شہادت ایک سے زیادہ مرتبہ مل جاتی ہے ۔ اصل بات یہی ہے کہ وہ خوددار اور بااصول آدمی تھے ۔ رہی وہ ایک قصیدہ نما نظم جو مخطوطات میں ملتی ہے تو وہ بھی ایک ایسے جبر کی پیداوار ہے جس کا پس منظر آگے آئے گا ۔

۱۔ آب حیات ، طبع دوم ، وکٹوریہ پریس لاہور ، ۱۸۸۳ع ، ص ۳۶۹ ۔

ہرچند کہ یہ روایت بھی درست نہیں ہے کہ غازی الدین حیدر نے انھیں قصیدہ کہنے کے لیے کہا تو ناسخ نے انکار کر دیا اور اسی انکار پر جلا وطن کر دیے گئے۔

بقول آزاد روایت کچھ اس طرح ہے کہ جب غازی الدین حیدر نے ناسخ کی شہرت سنی تو اپنے وزیر معتمد الدولہ آغا میر سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ناسخ دربار میں آ کر قصیدہ پڑھیں تو ہم انھیں ملک الشعرا کا خطاب دیں گے۔ جب آغا میر نے یہ پیغام ناسخ تک پہنچایا تو ناسخ نے برا منایا اور کہا "مرزا سلیمان شکوہ بادشاہ ہو جائیں تو خطاب دیں یا گورنمنٹ انگلشیہ خطاب دے۔ ان کا خطاب لے کر میں کیا کروں گا۔"[1]

اور یہ کہ نواب غازی الدین حیدر نے وحشت میں آ کر لکھنؤ سے ہی نکال دیا[2]، تاریخی طور پر درست نہیں ہے۔

یہ تو ممکن ہے کہ ناسخ کی خواہش ہو کہ مرزا سلیمان شکوہ خطاب دیں، کیونکہ جرأت، انشا، مصحفی جیسے شاعر مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے منسلک رہے تھے، مگر گورنمنٹ انگلشیہ سے خطاب کی خواہش مشتبہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ یہ نہ کہتے:

دل ملکِ انگریز میں جینے سے تنگ ہے
رہنا بدن میں روح کو قیدِ فرنگ ہے

جس شخص کو انگریز کے ملک میں رہنا گوارا نہ تھا وہ اس سے خطاب کی خواہش کیونکر رکھے گا۔ البتہ وہ جلا وطن ہوئے،

۱، ۲۔ آبِ حیات، طبع ثانی، ۱۸۸۳ء، وکٹوریہ پریس لاہور، ص ۳۶۳۔ ۳۶۴۔

لکھنؤ کے لیے ترستے تڑپتے رہے ، سب درست ہے ۔

آئندہ حالات میں ان کی جلا وطنی کا پس منظر بیان ہو جائے گا جس سے بات واضح ہو جائے گا ۔

دوسری مثال راجہ چندو لال کی ہے ۔ جب وہ الہ آباد میں تھے تو راجہ نے ۱۲ ہزار روپے بھجوا کر حیدر آباد بلوایا مگر ناسخ کو منظور نہ ہوا ۔ لکھنؤ سے نکل چکے تھے ، پریشانی اور مشکل میں تھے مگر کہا یہی کہ جاؤں گا تو لکھنؤ ہی جاؤں گا ۔ راجہ نے خط لکھا اور ۱۵ ہزار روپے بھجوا کر اصرار کیا ، ملک الشعرا کے خطاب کا وعدہ کیا ، دربار کی حاضری سے مستثنٰی قرار دیا اور یہ بھی کہا کہ ملاقات آپ کی صوابدید پر ہوگی ، مگر ناسخ کو لکھنؤ کے سوا کسی ایک جگہ بندھا رہنا قبول نہ ہوا ۔ بقولِ آزاد ”آزادی کے عالم میں جہاں جی چاہتا وہاں جا بیٹھتے ۔ جس کے ہاں جاتے وہ اپنا فخر سمجھتا تھا ۔“[1]

جلا وطن ہونے کے بعد بھی اگر وہ چاہتے تو قصیدہ لکھ کر خطابات و مراعات حاصل کر سکتے تھے مگر ایسا نہیں ہوا ۔ جگہ جگہ گھومتے رہے ۔ جی ایسا اُچاٹ ہو گیا تھا کہ کہیں لگتا نہ تھا ۔ کہیں لوگ پسند نہ آتے ۔ کہیں بقول اُن کے اُن کی زبان خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا ، حالانکہ ہر جگہ لوگوں نے عزت دی اور آنکھوں پر بٹھایا ۔ لکھنؤ سے نکلے تو الہ آباد ، کانپور ، بنارس ، پٹنہ دل برداشتہ پھرتے رہے :

جو کانپور سے ناسخ چلو بنارس کو
مزارِ پاکِ جنابِ علی حزیں دیکھو

۱۔ آبِ حیات ، طبع ثانی ، ۱۸۸۳ء ، وکٹوریہ پریس لاہور ، صفحہ ۳٦۳ ۔

اس پس منظر میں ناسخ اپنی ذات میں مگن ، آزاد اور ہجو و قصائد سے گریز پا دکھائی دیتے ہیں ۔ چند ہجویہ اشعار یا چند مدحیہ قطعات لکھنے سے ہم انھیں روایتی ہجونگار یا قصیدہ گو نہیں کہہ سکتے ۔

آزاد کا حوالہ یہاں ضروری ہو جاتا ہے کہ :

”قصائد کا شوق نہ تھا ۔ چنانچہ نواب لکھنؤ کی تاریخ و تہنیت میں بھی کبھی کچھ کہا ہے تو بطور قطعہ ہے ۔[1] ہجو کے کانٹوں سے ان کا باغ پاک ہے ۔“[2]

ایک دوسری شہادت مرزا غالب کی ہے ۔ خط بہ نام مرزا حاتم علی مہر میں لکھتے ہیں :

”ناسخ مرحوم، جو تمھارے استاد تھے، میرے بھی دوست صادق الوداد تھے ، مگر یک فنے تھے ۔ صرف غزل کہتے تھے، قصیدے اور مثنوی سے ان کو کچھ علاقہ نہ تھا ۔“[3]

ہرچند کہ چند مدحیہ قطعات اور ایک مختصر مثنوی کلیات کے پہلے ایڈیشن میں شائع ہو چکی تھی، اور یہ کلیات ۱۸۳۲ء میں شائع ہو چکا تھا ، مگر غالب نے ان اصناف کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا تو اس کے کچھ معنی ہیں ۔

۱۔ سوائے حکیم مہدی کی ہجو کے جس کا خمیازہ ناسخ کو بھگتنا پڑا ۔
۲۔ آبِ حیات ، طبع ثانی ، ۱۸۸۳ء ، وکٹوریہ پریس لاہور ، ص ۳۶۴ - ۳۶۵
۳۔ اردوئے معلیٰ ، (جلد اول ، حصہ دوم) ، طبع اول ، ۱۹۶۹ء ، مجلس ترقی ادب لاہور ، ص ۵۲۳ ۔

لہٰذا "داستانِ دلخراش" کے حواشی پر مرقومہ حوالہ باطل ہو جاتا ہے اور ناسخ کے روایتی قصیدے سے دانستہ اجتناب والی بات درست معلوم ہوتی ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا، چند مدحیہ قطعات اور ۶۳ اشعار پر مبنی قصیدہ نما نظم کے حوالے سے ہم انہیں روایتی قصیدہ نگار نہیں کہہ سکتے۔ پھر یہ کہ مدحیہ قطعات تو کلیات میں شامل کیے گئے مگر وہ قصیدہ کسی مرتب نے بھی کلیات میں شامل نہ کیا۔ اول ایڈیشن ہی کی بات نہیں، بعد کے دیگر بہت سے ایڈیشن بھی اس سے خالی ہیں۔ البتہ مخطوطات میں وہ مل جاتا ہے۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ناسخ نے اسے کیوں لکھا؟ اس کا جواب اِن حالات میں ملے گا جو ناسخ کے گرد حصار بن گئے تھے اور یہ ایسے تلخ حالات تھے، جن سے ناسخ مرتے دم تک نبرد آزما رہے۔ اس پس منظر میں ناسخ اپنی خود داری سمیت وضع دارانہ طور پر زندہ رہنے کی جد و جہد میں مصروف نظر آتے ہیں، یہاں تک کے بے بس اور لاچار کرکے جلا وطن کر دیے جاتے ہیں۔ مگر یہ غلط فہمی اب دور ہو جانی چاہیے کہ وہ غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ع - ۱۸۲۷ع) کے زمانے میں جلا وطن ہوئے تھے۔ بلکہ غازی الدین حیدر کا زمانہ ہی ان کے عروج کا زمانہ تھا، اس لیے کہ وہ ۱۸۱۴ع سے پہلے ہی شہرت حاصل کر چکے تھے اور مرزا حاجی کی ذات کے حوالے سے ان کی حیثیت اس قدر مضبوط ہو چکی تھی کہ وہ بڑے بڑے استاد شعرا کے برابر بیٹھنے لگے تھے۔

سعادت علی خاں کے آخری زمانے میں کچھ امرا کا دربار اودھ

میں بڑا اثر و رسوخ تھا ۔ خصوصاً حکیم مہدی اور مرزا جعفر[1] کا ۔

مرزا جعفر ، جو کہ مرزا حاجی کے والد تھے ، امورِ سلطنت میں مشیر کا درجہ رکھتے تھے۔ گو ان کے پاس باقاعدہ ایسا کوئی عہدہ نہ تھا ۔ مگر ان کے اثر و رسوخ کی بدولت یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ غازی الدین کی تخت نشینی کے بعد ان کا وزیر کے عہدے پر فائز ہونا لازمی ہے ۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں رسوخ ہی نہیں باقاعدہ تنخواہ بھی مقرر ہوگئی ۔ پانچ ہزار روپیہ ماہوار مقرر ہوا ۔ لہٰذا ان کا گھر اہلِ کمال کے لیے گوشۂ عافیت اور ایک ادبی مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا تھا جس میں ناسخ برابر شریک ہوتے تھے ۔

ان دنوں ناسخ کی زندگی سکون سے گزر رہی تھی اور مرزا حاجی سے وابستگی نے نہ صرف ان کے لیے سب راستے ہموار کر دیے تھے، بلکہ ان کی سماجی حیثیت بھی برتر ہو گئی تھی ۔ ضرورت مند لوگ اپنے مسائل کے لیے ان سے رجوع کرتے تھے ۔ حتیٰ کہ ایک زمانے میں (گو یہ زمانہ بہت بعد میں آیا) غالب نے بھی مدد کے لیے ناسخ ہی کو پکارا ، جب انھوں نے نصیر الدین حیدر کے لیے قصیدہ لکھا اور وہاں سے ملنے والی رقم خورد برد کر لی گئی تھی ۔[2]

۱۔ نام مرزا فخر الدین احمد تھا ۔ نواب حسن رضا خاں ان کے ماموں تھے ۔ مرزا جعفر بہت پڑھے لکھے آدمی تھے ۔ ملا مبین فرنگی محلی ، مولوی سید دلدار علی مجتہد عصر اور علامہ تفضل حسین خاں جیسے عالموں سے اکتساب کیا تھا اور خان علامہ کے عہدِ نیابت میں وہ بخشی گری کے عہدے پر فائز ہوئے تھے ۔

۲۔ غالب کی خط و کتابت ناسخ سے باقاعدہ تھی ، مگر فارسی میں ۔ اس قصے کو غالب نے اپنے اُس خط میں لکھا ہے جو انھوں نے منشی ہر گوپال تفتہ کے نام ۱۹ اگست ۔ ۱۸۶۱ع کو لکھا تھا ۔ خط کا

[بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر]

اصل میں ناسخ اس وقت کی سیاست میں بالواسطہ یا بلا واسطہ شریک ہو چکے تھے اور مرزا حاجی کی قربت جہاں سود مند ثابت

[بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ]

ضروری حصہ سارے قصے کو واضح کر دیتا ہے ۔ لکھتے ہیں :

"۔ ۔ ۔ بڑا پرانا قصہ تم نے یاد دلایا ۔ داغ کہنہ حسرت کو چمکایا ۔ یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ (کے) پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین حیدر کے پاس گزرا ۔ اور جس دن گزرا اسی دن پانچ ہزار روپیہ بھیجنے کا حکم ہوا ۔ متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفر الدولہ مرحوم لکھنؤ سے آئے ، انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا ، خدا کے واسطے میرا نام منشی محمد حسن کو نہ لکھنا ۔ ناچار میں نے شیخ امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کرکے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گزری ۔ انھوں نے جواب لکھا کہ پانچ ہزار ملے ۔ تین ہزار روشن الدولہ نے کھائے ، دو ہزار منشی محمد حسن کو دیے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب جانو غالب کو بھیج دو ۔ کیا اس نے ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا ؟ اگر نہ بھیجا ہو تو مجھ کو لکھو ۔ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپے بھی نہیں پہنچے ۔ اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو ۔ اس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور یہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ قصیدہ حضور میں گزرا ، مگر میں نے نہیں جانا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا ۔ میں کہ ناسخ ہوں ، اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر ان کا کھایا ہوا روپیہ ان کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا ۔ بھائی ! یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ کیا ۔ آج خط روانہ ہوا ، تیسرے دن شہر میں خبر اڑی کہ نصیر الدین حیدر مر گیا ۔ اب کہو میں کیا کروں اور ناسخ کیا کرے ۔" (اردوئے معلیٰ ، جلد اول ، مجلس ترقی ادب لاہور ، ۱۹۶۹ء ، ص ۱۲۹) ۔

بھی وہاں وزارت کے امیدواروں میں سے ایک امیدوار کی چھاپ بھی ان پر نمایاں ہو گئی تھی ۔ حکیم مہدی اور مرزا حاجی ، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ، دونوں ہی امور سلطنت میں کسی نہ کسی حد تک شریک تھے اور غازی الدین حیدر کی تخت نشینی کے بعد دونوں میں سے کسی ایک کا وزیر ہونا یقینی تھا ۔[1]

۱۔ "یہ بات یقینی اس لیے تھی کہ غازی الدین حیدر کی تخت نشینی میں دونوں باپ بیٹوں یعنی مرزا حاجی اور مرزا جعفر کا ہاتھ تھا ۔ حالانکہ نواب سعادت علی خاں نے اشارۃً ہی سہی ، اپنے بعد جسے تخت نشینی کے لائق خیال کیا تھا وہ شمس الدولہ نواب احمد علی خاں تھے ۔ لہٰذا نواب سعادت علی خاں کی موت کے بعد رات کو چپکے چپکے تخت نشین ہونے کی ساری تیاری شمس الدولہ کر چکے تھے ۔ ریذیڈنٹ کرنل بیلی کو اطلاع ہو چکی تھی اور وہ ڈاکٹر ونسن اور کیپٹن فارجن اور سپاہیوں کے ہمراہ فرح بخش پہنچ چکے تھے ۔ سب دروازے بند تھے ، ہر طرف پہرہ تھا ۔ شمس الدولہ کو نماز کا خیال آیا ۔ وہ مصاحب کے روکنے کے باوجود نماز ادا کرنے اندر مکان میں چلے گئے ۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ کسی نے غازی الدین حیدر کو اطلاع پہنچا دی اور وہ کمند ڈال کر دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گئے ۔ اس سے پہلے آغا میر کسی طرح پہنچ چکے تھے اور مرزا حاجی اور مرزا جعفر تو خود انگریزوں نے بلوا رکھے تھے کہ وہ ان سے بھی قریب تھے ۔ بہرحال غازی الدین حیدر کے آنے پر ریذیڈنٹ سوچ میں پڑ گیا ۔ آغا میر نے مرزا حاجی کو اشارہ کیا کہ اس وقت دونوں میں تعلق تھا ۔ مرزا حاجی نے اپنے والد مرزا جعفر سے کہا اور مرزا جعفر نے جان بیلی کو اس بات پر آمادہ کرنے میں پورا زور لگا دیا کہ قانون اور ضابطے کے مطابق بڑی اولاد کو ریاست کا حق ہے ۔ جان بیلی نے دوسرے انگریزوں سے مشورہ کرکے غازی الدین حیدر سے اپنے مفاد میں عہد و پیمان بھی کر لیے اور دیگر بہت سے چھوٹے بھائیوں کو

[بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر]

ہر چند کہ مرزا حاجی باقاعدہ منصب نہ ملنے کے باوجود امور وزارت سرانجام دیے رہے تھے کہ حالات نے پلٹا کھایا اور وہ ہوا جو کسی کے گمان میں نہ تھا - یعنی ۱۸۱۴ء میں ہی آغا میر[۱] کو وزارت سونپ دی گئی -[۲]

[بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ]

بھی غازی الدین کے حق میں راضی کر لیا - پھر شمس الدولہ کو طلب کیا اور کہا کہ ریاست بڑے بیٹے کا حق ہے - وہ رئیس ہوئے، آپ نائب - شمس الدولہ غصے میں آ گئے اور نامنظور کردیا اور یوں غازی الدین حیدر مسند نشین ہوگئے - ان کی تخت نشینی کی تاریخ ''وزیر نامے میں ۳ رجب ۱۲۲۹ھ مطابق ۲۴ جون ۱۸۱۴ء لکھی ہے - اور مشہور یہ ہے کہ اس دن ۱۲ جولائی ۱۸۱۴ء مطابق ۲۲ رجب ۱۲۲۹ ہجری تھی -'' (تاریخ اودھ، از نجم الغنی، جلد چہارم، مطبع نولکشور، ۱۹۱۹ء، ص ۱۱۴) -

ظاہر ہے اس تخت نشینی میں مرزا حاجی اور مرزا جعفر کا جو کام تھا اس کے مطابق سب کے خیال میں لازم یہی تھا کہ دونوں میں سے کوئی ایک وزیر ہوگا -

۱- آغا میر کا نام سید محمد تھا، معتمد الدولہ مختار الملک ضیغم جنگ خطاب تھا - غازی الدین حیدر کی شہزادگی کے زمانے میں ان کے معتمد خاص تھے -

۲- نجم الغنی کے مطابق معتمد الدولہ آغا میر کو نیابت ملنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کا انگریزوں سے بھی ربط تھا اور غازی الدین حیدر سے بھی - قصہ یوں ہوا کہ گورنر جنرل کو یہ اطلاع ملی کہ نواب غازی الدین حیدر ریذیڈنٹ کرنل جان بیلی سے ناخوش ہیں - گورنر نے جان بیلی کو حکم دیا کہ نواب سے صفائی کرکے راضی نامہ کریں اور مجھے بھجوائیں - جان بیلی کو جب یقین ہوگیا کہ راضی نامے کے بغیر چارہ نہیں تو اس نے منشی علی نقی خاں سے مشورہ کیا جس کی

[بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر]

ہرچند کہ اس عہد پہلے وہ کسی شمار میں نہ تھے یعنی مرزا حاجی، حکیم مہدی اور میر فضل علی جیسے جہاندیدہ اور باصلاحیت نہیں سمجھے جاتے تھے مگر طبعی طور پر وہ سیاسی جوڑ توڑ اور سازشوں کے ماہر تھے، جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا - وزارت انھیں ملنا تھی کہ مرزا حاجی نے صدمے کے باعث گوشہ نشینی اختیار کرلی - اقتدار سے محروم ہوتے ہی پہلی سی چہل پہل تو نہ رہی تھی مگر ناسخ نے مرزا حاجی سے اپنے تعلقات کم نہ کیے تھے - بلکہ برابر ملتے رہنے اور وضع داری نبھانے کی پوری کوشش کی - ناسخ انھیں نظر انداز کیسے کر سکتے تھے - مرزا حاجی کی مصاحبت میں ہی ناسخ نے شعر کا عشق پالا اور بہت کچھ سیکھا تھا - زبان کی اصلاح اور تحقیقی مباحث کا ذوق و شوق اور سارے کام انھی کے ساتھ بیٹھ کر سرانجام دیے تھے - لہٰذا برے دنوں میں ربط توڑنا اور یوں الگ

[بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ]

آمد و رفت غازی الدین حیدر کے پاس تھی - علی نقی نے، آغا میر کا مشورہ دیا - بہرحال جب ریذیڈنٹ، آغا میر سے ملا تو اس سے کہا کہ اگر وہ نواب سے صفائی کا کاغذ لکھوا دے تو اُسے نیابت دلا دی جائے گی - لہٰذا آغا میر کسی اچھے موقع کی تلاش میں رہا اور جب یہ موقع ملا تو اس نے غازی الدین حیدر کو مشورہ دیا کہ صلح کر لی جائے - شاید غازی الدین حیدر کو اس میں تامل تھا کہ آغا میر نے اندیشے کا اظہار کیا اور عرض کی کہ کہیں ریاست شمس الدولہ کی طرف منتقل نہ ہو جائے - یہ بات نواب کو اثر کرگئی، اس نے فوراً فیصلہ کیا اور راضی نامہ اپنی مُہر سے مکمل کرکے آغا میر کے حوالے کیا اور اس کے صلے میں جان بیلی نے آغا میر کو نیابت کا عہدہ دلایا -

(تاریخ اودھ، حصہ چہارم، ص ۱۱۷ - ۱۱۸ - بضمن ''معتمد الدولہ آغا میر کو نیابت ملنے کی وجہ'') -

ہو جانا ان کی دوست داری کے خلاف تھا ، لہٰذا وہ اپنی وضع پر قائم رہے ۔ مگر آغا میر ، حکیم مہدی اور مرزا حاجی کے درمیان کشمکش جاری تھی ۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ماہ بعد ہی پانسا پلٹ گیا اور ۱۸۱۵ع میں آغا میر وزارت سے معزول کر دیے گئے اور وزارت مرزا حاجی کو مل گئی ۔ ناسخ کے لیے یہ بہت ہی خوش کن بات تھی کیوں کہ مرزا حاجی ، ناسخ کے زیادہ قدردان ہو گئے تھے ۔ حقِ دوستی نبھانے کے جواب میں اس مرتبہ مرزا حاجی نے انھیں اپنا ہم راز اور مشیر بنا لیا اور اس طرح ناسخ امور سلطنت میں کسی حد تک دخیل ہو گئے ۔ آغا میر یہ سب دیکھ رہے تھے ۔ اقتدار سے الگ ہو کر گوشہ نشین ہونے کے بجائے انھوں نے سیاسی جوڑ توڑ جاری رکھے ۔ اس سیاسی جوڑ توڑ کے باعث ہی آغا میر نے بادشاہ بیگم[1] سے سفارشی پروانہ اور خوشنودی حاصل کرلی ، جس کے نتیجے میں ۱۸۱۸ع میں ہی انھیں دوبارہ وزارت مل گئی[2] اور ایسی ملی کہ دو برس بعد جب نوابی ،

۱۔ غازی الدین حیدر کی ملکہ جو اپنے عملے اور فوج کے ساتھ شاہی ٹھاٹھ سے علیحدہ رہتی تھیں اس لیے کہ دونوں میں موافقت نہ تھی ۔

۲۔ حکیم نجم الغنی کے مطابق بھی دوبارہ وزارت ملنے کی وجہ بادشاہ بیگم ہی تھیں ۔ وہ لکھتے ہیں "معتمد الدولہ نے خیال کیا کہ بادشاہ بیگم کی آزردگی اپنے منصبِ نیابت کی بربادی ہے ۔ اس فکر و تدبیر میں عرق ریزی شروع کی کہ ان کا دل صاف ہو جائے ۔ کوئی دقیقہ سحر و افسوں و طلسم و دعا و تعویذ وغیرہ مذہب اہلِ سنت و امامیہ سے باقی نہ رہا کہ جو ظہور میں نہیں آیا ۔ آخرکار سبحان علی خاں نے بی بی قطبی کے ذریعے سے بادشاہ بیگم کا آئینۂ دل ، زنگِ آزردگی سے صاف کیا اور صفائی کی صورت ہو کر آغا میر اٹھارہ ماہ معطل رہنے کے بعد پھر خلعتِ نیابت سے مع نوبت و نقارہ سرفراز ہوئے" (تاریخِ اودھ، از نجم الغنی ، حصہ چہارم ، مطبع نولکشور ۱۹۱۹ع ، ص ۱۲۹) ۔

بادشاہی میں بدل گئی تو ان کا عہدہ نائب سلطنت کے بجائے وزیر اعظم ہو گیا ۔ مگر آغا میر کے لیے یہ سب بھی اطمینان کا باعث نہ تھا ۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ابھی ان کے سامنے تین کانٹے تھے جو ہر وقت ان کے دل میں کھٹکتے تھے : یعنی حکیم مہدی ، مرزا حاجی اور میر فضل علی[1] ۔ لہٰذا آغا میر نے دوبارہ وزیر ہونے کے بعد پہلا کام تو یہ کیا کہ مرزا حاجی کو گھر میں قید کر دیا اور حکیم مہدی اور میر فضل علی پر برابر نگاہ رکھی ۔ آغا میر نے زیادتی یہ کی کہ مرزا حاجی کے مقربین کے ساتھ بھی برا سلوک کیا اور ناسخ چونکہ مرزا حاجی سے بہت قریب تھے لہٰذا بڑی کشمکش میں تھے اور مقرب ہونے کے سبب برابر نظروں میں تھے اور کسی حد تک معتوب ٹھہر چکے تھے ۔ انھیں معلوم تھا کہ آغا میر چین سے بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہیں ۔ جو سلوک انھوں نے مرزا حاجی کے متعلقین سے کیا ہے ، کسی وقت بھی ان سے ہو سکتا ہے ۔ وہ بہت متوازن ہو چکے تھے ۔ تاہم اس برے وقت کے انتظار میں خاموش رہے ۔ یہی زمانہ ناسخ جیسے وضع دار اور بے ضرر انسان کے لیے مشکل تھا ۔ وضع داری کے باوجود ان کی نگاہ حقائق پر تھی ۔ ایک طرف آغا میر کا جبر تھا تو دوسری طرف مرزا حاجی سے تعلقات ۔ مگر ناسخ فوری طور پر مرزا حاجی کی دوستی سے کنارہ کش نہ ہو سکے ۔ ہرچند کہ میل ملاقات کم تھی اور یہ تعلق مرزا حاجی سے دلی ہمدردی کے سوا اور کچھ نہ تھا ،

۱۔ میر فضل علی ، بادشاہ بیگم سے منسلک تھے اور بہت باصلاحیت آدمی تھے اور وزارت کے برابر درجے کے عہدے کے مالک تھے ۔ اس پہ طرہ آغا میر سے انھیں سخت عناد تھا ، لہٰذا آغا میر کے لیے وہ ایک خطرے سے کم نہ تھے ۔

مگر آغا میر تو آغا میر تھے ۔ ناسخ ان کی نگاہ سے زیادہ دیر اوجھل نہ رہے ۔[1]

انھی حقائق کے پیش نظر انھوں نے کسی طریقے سے آغا میر سے ربط بڑھانے کی کوشش کی ۔ شروع میں تو یہ ربط اتنا تھا کہ بس جی سکیں اور جب ۱۸۱۹ع میں اودھ کی نوابی بادشاہت میں بدل گئی تو ناسخ نے اس جینے کی جد و جہد میں غازی الدین حیدر کی شان میں قطعہ کہا اور کچھ اشعار آغا میر کی تعریف میں بھی لکھے جو ظاہر ہے کس لیے لکھے ہوں گے ۔

۲۰ - ۱۸۱۹ع کے لگ بھگ حکیم مہدی کسی طریقے سے آغا میر کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ، لکھنؤ سے نکل گئے ۔

---

۱ - منصب وزارت سنبھالنے کے بعد غالباً ۱۸ - ۱۸۱۷ع میں ہی آغا میر نے ناسخ کو بلانے کے لیے چوب دار بھیجا ۔ ناسخ کو معلوم تھا کہ گڑبڑ ہونے والی ہے ، لہٰذا وہ چوب دار کو بہلا کر طرح دے گئے اور خود آغا توکل کے ہاں پناہ لینے پہنچ گئے اور کہا ''تین روز کے لیے مجھے چھپا لو'' آغا توکل ، آغا میر کے ظلم سے ڈرتے تھے ۔ انھوں نے چھپانے کی حامی نہ بھری ۔ دوسری طرف ناسخ نہ ملے تو آغا میر نے میر اسد کو حکم دیا کہ اعلان کرادیں کہ شاید ناسخ کو بخش دیا جائے مگر چھپانے والے کی خیر نہیں ۔ ناسخ آغا توکل کے ہاں سے نکل کر سیدھے میر اسد کے ہاں پہنچے جو آغا میر کے قریبی عزیز بھی تھے ، شاعر بھی تھے ، صبر تخلص تھا اور یہ کہ ناسخ کے شاگردوں میں سے تھے ۔ ناسخ کے آنے کی اطلاع پا کر میر اسد ننگے پاؤں باہر آئے ، بڑی عزت سے بٹھایا اور کہا اطمینان رکھیے ، میرا سر آپ کی عزت کے ساتھ ہے ۔ بعد میں میر اسد ہی کی سفارش پر سزا کم ہو کر فی الحال گھر میں بند رہنے تک محدود کردی گئی ۔ سو دوسرے دن ناسخ گھر لوٹ آئے مگر دقت یہ تھی کہ گھر کے ساتھ لکھنؤ سے بھی نکل جانے کی ممانعت تھی۔

آغا میر کو اپنے ایک دشمن کے بچ کر نکل جانے کا بہت دکھ تھا۔ ہرچند کہ آغا میر کے مقربین اس فرار کو آغا میر کے لیے نیک شگون کہتے رہے مگر آغا میر کے لیے یہ ایک صدمہ تھا ۔ لہٰذا ناسخ نے رابطے کی دوسری کوشش یوں کی کہ حکیم مہدی کے جانے کی تاریخ نکالی اور چند شعر ہجو کے سے انداز میں لکھ دیے جو سراسر آغا میر کی خوشنودی حاصل کرنے اور زندہ رہنے کا سامان تھا ۔ اور یہ ہوا بھی ۔ کیوں کہ آغا میر اور ناسخ کے درمیان تعلقات بہتر ہو گئے تھے ۔ (روایت ہے کہ یہ اشعار محمد خاں قوال نے آغا میر کو گا کر سنائے تھے اور انعام بھی پایا تھا) ۔

وقتی طور پر یہ حربہ کارگر ثابت ہوا اور ناسخ آغا میر کے دوستوں میں شمار ہونے لگے ۔ بقول حکیم نجم الغنی :

"چونکہ شیخ ناسخ ، آغا میر کے دوست تھے ، حکیم صاحب کے (حکیم مہدی) چلے جانے کی انھوں نے تاریخ کہی جس کا مادہ "گریختہ" (۱۲۳۵) ہے اور پچھلا مصرع یہ ہے : "کاشو برائے پختنِ شلغم گریختہ ۔"[1]

یہ الگ بات کہ جب حکیم مہدی کا زمانہ آیا تو ناسخ کو کیا کچھ بھگتنا پڑا مگر وہ تو بعد کی بات ہے ۔ اس وقت تو آغا میر کی نگاہ مرزا حاجی پر مرکوز تھی ، جنھیں وہ اپنا قریبی دشمن سمجھتے تھے اور قید میں ہونے کے باوجود یاد رکھے ہوئے تھے ۔ اور کسی اچھے موقعے کی تلاش میں تھے کہ اس مبینہ سازش کا انکشاف ہوا ۔ یہ سیاست تھی یا واقعی سازش تھی ، اس کا انحصار چند

۱۔ تاریخِ اودھ ، حصہ چہارم ، ص ۲۴۸ ۔

تاریخی کڑیاں درست طریقے سے ملانے ہو ہے ۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ناسخ کو بھی اس سازش میں ملوث بتایا گیا ہے ، یہ سراسر ناجائز اور ناقابلِ یقین ہے ۔ ناسخ سازشی آدمی تھے ہی نہیں ۔ تاہم یہاں دو روایتیں ملتی ہیں ، ایک آغا میر کو قتل کرانے سے متعلق ہے اور دوسری مرزا حاجی کو ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹانے کے بارے میں ۔ پہلی روایت یوں ہے کہ مرزا حاجی[1] نے آغا میر کو قتل کرانے کی سازش کی تھی اور کرانے پر کسی شخص کو راضی کر لیا تھا اور وہ عین موقع پر پکڑ لیا گیا اور راز کھل گیا ۔ اور یہ بھی کہ ناسخ اس واقعے کو پہلے سے جانتے تھے مگر چونکہ انھوں نے یہ راز فقیر محمد خاں گویا پر ظاہر کر دیا تھا جس نے آغا میر کو مطلع کرکے انھیں بچا لیا لہٰذا ناسخ سزا سے بچ گئے ۔ دوسری روایت یہ ہے کہ سارا کھیل خود آغا میر نے ترتیب دیا تھا تاکہ وہ مرزا حاجی کو مجرم ثابت کرکے ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹا سکیں ۔ اور غالباً یہی روایت درست معلوم ہوتی ہے ۔ اور اس عہد میں بھی بہت سے لوگوں کا یہی خیال تھا مگر آغا میر کے خلاف کچھ کہنا ، موت کو دعوت دینے والی بات تھی اس لیے کھل کر کہنے کی کسی میں ہمت نہ تھی ۔ بہر حال مقدمہ چلا اور بطور گواہ ناسخ کو طلب کیا گیا ، اور ناسخ کی مجبوری تھی

۱۔ نجم الغنی اس کے یوں راوی ہیں : ”انھوں نے (مرزا حاجی نے) میر غلام علی پسر میر حامد علی کی صلاح سے ایک برہمن یا راجپوت کو ، جیسا کہ محتشم خوانی میں لکھا ہے اور بقول خود میر غلام علی کو کئی ہزار روپے دینا کہہ کر معتمد الدولہ کے قتل پر آمادہ کیا تھا . . . شیخ امام بخش ناسخ نے ، جن کے معتمد الدولہ با اخلاص شاگرد تھے ، اس بھید سے مطلع ہوکر فقیر محمد خاں کی معرفت معتمد الدولہ کو خبردار کردیا ۔“ (تاریخ اودھ ، حصہ چہارم ، ص ۱۰۹) ۔

کہ انھیں پیش ہونا پڑا۔ حالانکہ وہ مرزا حاجی کو مجرم نہ سمجھتے تھے مگر گواہی دینے سے انکار خود ان کے لیے صعوبتوں کا باعث تھا۔

ناسخ کے لیے یہ بڑا ہی سخت جان مرحلہ تھا مگر وہ گواہی کے لیے گئے اور کچھ اس طرح سے گواہی دی کہ مرزا حاجی کے سازش میں ملوث ہونے کی تصدیق نہ ہو سکی اور گواہی بھی ہو گئی۔

باوجود اس کے کہ مرزا حاجی کا جرم ثابت نہ ہو سکا، ان کی سب جائداد ضبط کرلی گئی اور لکھنؤ سے نکال دیا گیا۔ اب ناسخ اور بھی زیادہ محتاط ہو گئے۔ ان کی تمام کوشش اس بات پر مرکوز تھی کہ آغا میر ان سے زیادہ ناراض نہ ہونے پائیں اور یہ بھی کہ مرزا حاجی کی کم از کم جان بچی رہے اور اپنی جان تو بہرحال انھیں بچانا تھی۔ سو مرزا حاجی کے لکھنؤ سے چلے جانے کے بعد ناسخ نے معتمد الدولہ آغا میر کے قریب ہونے کی دانستہ کوشش کی مگر اس طرح کہ خودداری کے تقاضے بھی مجروح نہ ہونے پائیں۔ یعنی باقاعدہ درباداری کے جھنجٹ میں نہ پڑے، نہ ہی حلقۂ مصاحبین میں بیٹھے اور نہ انھوں نے اس طرح کا خصوصی لباس زیب تن کیا۔ حاضری بھی نہ دی مگر یہ کمال ہے کہ ربط بھی قائم رکھا۔ نہ صرف قائم رکھا بلکہ آہستہ آہستہ اسے بڑھایا بھی۔

اور اس کے بعد جب ۲۳ - ۱۸۲۲ء میں میر فضل علی بھی مرزا حاجی کی طرح لکھنؤ سے نکل گئے تو میدان بالکل ہی صاف ہو گیا اور ناسخ کھل کر آغا میر کے ساتھ ہو گئے۔ اس کے علاوہ

وہ کر بھی کیا سکتے تھے ۔ ناسخ کے لیے یہ زمانہ (۱۸۲۰ تا ۱۸۲۷) سکون و اطمینان کا تھا ۔ اس زمانے میں وہ کسی خاص حادثے سے دوچار نہ ہوئے سوائے اس بات کے کہ غازی الدین حیدر کی بادشاہت تھی اور آغا میر کی سخاوت ۔ آغا میر شاعر بھی تھے اور ناسخ کے شاگرد بھی ہو گئے تھے اور کچھ ماہوار بھی مقرر کر دیا تھا ۔ اسی زمانے میں ناسخ کو وہ قصیدہ نما نظم لکھنے کا زہر پھانکنا پڑا ۔ ایک روایت ہے کہ آغا میر نے سوا لاکھ روپے کا انعام دیا جو ناسخ نے اپنے دوست مرزائی صاحب کے پاس اس لیے رکھوا دیا کہ چور نقب لگا کر لوٹ نہ لیں ۔ چنانچہ واقعہ یہ ہوا کہ چوروں نے اطلاع پا کر نقب لگائی مگر انھیں نامراد لوٹنا پڑا ۔ بہرحال ناسخ کو آغا میر سے قرب حاصل کرنے کا شاید اس قدر شوق نہ ہو جس قدر اپنی زندگی کو آلام سے بچانے اور بچائے رکھنے کا خیال تھا ۔ حکیم مہدی کی ہجو بھی آغا میر کے دل سے کدورت دھونے کی ایک کوشش تھی ۔ کدورت تو ضرور دھل گئی مگر یہ ہجویہ اشعار ، جو حکیم مہدی کے لیے لکھے گئے تھے ، ناسخ کی آئندہ زندگی میں مصیبتیں بھی لائے ۔

اسی طرح وہ قصیدہ نما نظم[1] بھی جو کلیات میں موجود نہیں مگر مخطوطات میں مل جاتی ہے ، یہ جانے بغیر کہ آئندہ کیا مصائب لا سکتی ہے ، جان بچانے ہی کی ایک کوشش معلوم ہوتی ہے ۔ ان حالات میں کہ جو اوپر بیان کیے گئے ہیں ، اگر ناسخ قصائد کا

۱۔ سید شبیہ الحسن نے بھی اپنے کتابچے ''ناسخ'' میں اس قصیدے کو ''قصیدہ سا'' لکھ کر بات واضح کر دی ہے کہ وہ کوئی باقاعدہ روایتی قصیدہ نہ تھا جو اُس عہد کے شاعر ہر وقتے نہیں تو ہر ماہ ضرور لکھتے تھے ۔

البلر بھی لگا دیتے تو میرے خیال میں مضائقہ نہ تھا ۔ جبر کی وہ صورتِ حال جس کے تحت یہ دو چیزیں لکھی گئیں ، اگر سمجھ لی جائے تو ناسخ کی شخصیت وضع دار ، دوست دار اور زیرک انسان کے روپ میں اُبھر کر سامنے آتی ہے ۔

ظاہر ہے اگر یہ قصیدہ ان کی دلی آسودگی اور جذباتی وابستگی کے تحت وجود میں آتا تو وہ اسے کسی دیوان میں ضرور شامل کرتے ، جبکہ تیسرا دیوان بھی ان کی زندگی میں ہی مرتب ہو چکا تھا ۔

یہ زمانہ ، جس کا ذکر اوپر کیا گیا (۲۷ — ۱۸۲۱ء) ، ناسخ کی آسودہ حالی اور کسی قدر اطمینان کا زمانہ تھا اور یہ اطمینان بڑی مشکلات کے بعد حاصل ہوا تھا ۔

لکھنؤ مکمل طور پر ادبی مرکز کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور اس ادبی مرکز میں ناسخ کی حیثیت بڑے شاعر اور بڑے استاد کے علاوہ مستند مصلحِ زبان کے طور پر بڑی معتبر تھی ۔ زبان ہو یا شعر ، ان کا فیصلہ مقدم سمجھا جاتا تھا ۔ یہ زمانہ ان کی مقبولیت اور معیار کی معراج تھا ۔ مگر یہ دور بھی گزر گیا ۔ غازی الدین حیدر کے انتقال اور نصیر الدین حیدر کی تخت نشینی نے سب کچھ اُلٹ پلٹ دیا ۔ اصل میں غازی الدین حیدر کی موت آغا میر کے لیے بھی بڑا حادثہ تھا ۔ یہ موت ان کا زوال ثابت ہوئی اور ظاہر ہے ناسخ کے لیے آغا میر کا زوال سانحے سے کم نہ تھا ۔ حالات کی بے یقینی نے ایک مرتبہ پھر غلبہ پا لیا تھا ۔ غازی الدین کی موت[1]

۱۔ حکیم نجم الغنی کے مطابق :

"چھ گھڑی رات رہے ، ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو دیوالی کے دن چودہ برس حکومت کرکے دنیا سے کوچ کیا ۔" (تاریخ اودھ ، حصہ چہارم ، ص ۲۰۳)

پر ناسخ نے یہ تاریخی مصرع کہا :

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ[1] (۱۸۲۷ع / ۱۲۴۳ھ)

نصیر الدین حیدر نے تخت نشین[2] ہونے کے بعد فوری ردِ عمل کا اظہار نہ کیا بلکہ آغا میر کے ساتھ بہتر سلوک کیا ۔ مگر اندر ہی اندر سارے انتظامات کر لینے کے بعد جنوری ۱۸۲۸ع کو آغا میر کو نہ صرف معزول کردیا بلکہ گرفتار بھی کر لیا ۔ روایت ہے کہ نصیر الدین حیدر پہلے سے ہی آغا میر کے خلاف تھے ، لہٰذا معزولی اور گرفتاری سے پہلے انہوں نے آغا میر کو مطمئن رہنے کا یقین دلایا اور غافل کر دیا ۔ اور پھر مناسب موقع پر معزولی بھی ہوئی ، گرفتاری بھی اور یہ سب کام سلیقے سے کیا گیا ۔ دوسری مصیبت یہ ہوئی کہ منصبِ وزارت بھی میر فضل علی کے سپرد ہو گیا ۔ میر فضل علی کو اعتماد الدولہ کا خطاب بھی دیا گیا ۔ میر فضل علی ، آغا میر کے سخت دشمن تھے ۔ اور ممکن ہے آغا میر کی گرفتاری میں انھی کی مشاورت بھی شامل ہو ، اس لیے کہ جس شخص کو ناسخ سے اس بنا پر رنجش ہو کہ وہ آغا میر سے قریب

۱۔ یہ قطعہ تاریخ پانچ اشعار پر مشتمل ہے :

از وفاتِ جنابِ شاہِ زمن گوئیا عالمی ہلاک شدہ
دہر گردید بہر ما دوزخ بہ بہشت آں جناب پاک شدہ
دیدہ ھا* شد ہمہ‌اش غمناک سینہ ھا آہ دردناک شدہ
رفت دامان صبر از دستم جیبِ صبر و شکیب چاک شدہ
گشت تاریخ مصرع ِ اوستاد اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

(کلیاتِ ناسخ ، طبع ۱۲۵۸ھ ، ص ۳۵۴)

۲۔ نجم الغنی کے مطابق "۲۸ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ مطابق ۲۰ ۔ اکتوبر ۱۸۲۷ع کو نصیر الدین حیدر نے ۲۵ سال کی عمر میں تختِ سلطنت کو رونق بخشی ۔" (تاریخِ اودھ ، حصہ چہارم ، ص ۲۰۲) ۔

* نولکشور میں "دیدہ ہاشد ہمہ‌اش غمناک" ہے ۔

تھے ، وہ آغا میر کے لیے اس سے بھی سخت سزا کا مشورہ دے سکتا ہے ۔ لہٰذا آغا میر کے مقرب ہونے کی تھوڑی سی سزا ناسخ کو بھی بھگتنا پڑی ۔ اس طرح کہ انھیں گھر میں نظر بند کر دیا گیا مگر اندرونِ خانہ کیا کوششیں یا معاہدہ ہوا کہ اسی سال ناسخ کی رہائی بھی ہو گئی ۔ کہتے ہیں کہ رہائی مشروط تھی اور غالباً شرط یہ تھی کہ لکھنؤ سے نکل جائیں ۔[1] لہٰذا ۱۸۲۸ء ان کی قید ، رہائی اور لکھنؤ سے نکلنے کا سال ہے ۔ اور یہ ان قطعاتِ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے جو انھوں نے اسی سال الہ آباد میں نظم کیے تھے ۔ بہرحال میر فضل علی زیادہ نہ جی سکے اور اپریل ۱۸۳۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا ۔ یقیناً ناسخ اس خبر سے خوش ہوئے ہوں گے ۔ میر فضل علی کی وفات گویا ان کے لکھنؤ لوٹ آنے کا پروانہ تھی ۔ مگر ابھی لکھنؤ میں واپس آنا خطرے سے خالی نہ تھا اس لیے کہ آغا میر ابھی تک قید میں تھے اور انھیں مشروط طور پر بھی نہ رہائی ملی تھی نہ لکھنؤ سے جانے کی اجازت ۔ تاہم ناسخ محتاط طریقے سے واپسی کا راستہ دیکھ رہے تھے کہ چند ماہ بعد ایک اور بری خبر انھیں پہنچی اور وہ تھی حکیم مہدی کو وزارت مل جانے کی خبر ۔ ناسخ کی پریشانی بڑھ گئی کیونکہ حکیم مہدی ، آغا میر کے تو سخت خلاف تھے ہی ، ناسخ کو بھی انھوں نے معاف نہیں کیا تھا ۔ اور آغا میر کی خوشنودی کے لیے جو ہجویہ اشعار ناسخ نے لکھے تھے حکیم مہدی کے دل میں کانٹا بنے ہوئے تھے ۔ وہ آغا میر سے زیادہ ناسخ کے دشمن ہو چکے تھے ، لہٰذا لکھنؤ لوٹنے کی کوئی صورت

۱۔ حکیم نجم الغنی کے الفاظ میں ”آغا میر کی کمان گر گئی تو ناسخ کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا ۔ یہ واقعہ نصیر الدین حیدر کے عہد کا ہے ۔“
(تاریخِ اودھ ، جلد چہارم ، ص ۲۰۶)

لہ تھی۔ دو برس اور جلا وطنی میں گزار گئے اور اس طرح کل ملا کر وہ تقریباً پانچ برس لکھنؤ سے جلا وطن رہے اور زیادہ تر الہ آباد میں قیام کیا ۔ غم و اندوہ کے باوجود یہ پانچ برس کا عرصہ انھوں نے تحقیقی کاموں میں بھی صرف کیا اور اپنے اضطراب کو ، جو ظاہر ہے لکھنؤ اور دوستوں کی جدائی ، مشکلات اور غیر یقینی حالات کے سبب سے پیدا ہوا تھا ، زیادہ با معنی بنایا کہ وہ سارے تجربے اور جس کرب سے وہ دوچار ہوئے تھے ، اس کا رنگ ان کی غزلوں میں شامل ہونے لگا ۔ کسک ، دکھ ، غم و اندوہ کے ساتھ جذبہ بھی ناسخ کے اشعار میں اس طرح آیا کہ وہ بے ساختہ اور سچا تھا ۔ غم و اندوہ کی تصویریں بھی پہلے دیوان کی غزلوں کے مقابلے میں اب زیادہ حقیقی اور زیادہ با معنی ہو گئی تھیں ۔ لہجہ بھی تبدیل ہوا اور معنی میں بھی تبدیلی آئی جو اس سے پہلے کم کم تھی ۔ خیالی صنعتوں سے گریز بھی ملتا ہے ، جتیٰ کہ بعض ایسے اشعار بھی ناسخ کے قلم سے نکلے جو تشبیہ اور استعارے کا سہارا لیے بغیر لکھے گئے ۔ دیگر صنائع بدائع سے بھی وہ پاک ہیں ۔ ان میں مشکل پسندی کا تانا بانا بنا گیا نہ ہی کسی پیچیدگی کا ۔ مثلاً یہ شعر بے ساختہ پن اور تاثیر کا حامل ہے اور اس میں صنائع بدائع اور مشکل ترکیبیں منہا ہو کر رہ گئی ہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں سچا اور کھرا جذبہ ہے کہ یہ شعر جذبے کی تصویر بھی ہے ، تفسیر بھی :

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں[1]

۱۔ کلیاتِ ناسخ ، مطبع مجتبائی ۱۲۵۸ھ ، ص ۱۹۷

پہلی مرتبہ تو یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ ناسخ کا شعر ہے۔ اِسی طرح ایک اور شعر بھی، جو سادہ اور پر اثر ہے، درج کرنے کو جی چاہ رہا ہے:

تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں[1]

پہلا شعر دیوانِ دوم میں سے ہے جبکہ دوسرا دیوان اول میں سے۔ دیوانِ دوم میں خصوصاً پریشانیوں اور دکھوں کی گہری تصویریں ملتی ہیں۔ بعض اشعار اور غزلیں تو ایسی ہیں جن پر مصائب، رنج و الم اور حسرتوں کی گہری چھاپ ہے اور یہ چھاپ دیوان دوم کے نام تک میں ہے۔ ہرچند کہ "دفتر پریشاں" ایک تاریخی نام ہے اور اس سے ۱۲۴۸ھ - ۱۸۳۲ع کی تاریخ نکلتی ہے، مگر غم کا ایک دبا اظہار بھی ہے۔ باقی صعوبتوں کی داستان اندر کے اشعار میں مل جاتی ہے، اس لیے کہ مرتب کرتے وقت ناسخ نے عہدِ جلا وطنی میں کہی ہوئی غزلوں کی بہت کافی تعداد اس میں شامل کی تھی۔

یوں بھی وہ لکھنؤ سے جدا ہو کر دل برداشتہ رہے۔ یہ جدائی ان کے لیے دکھوں کا پہاڑ تھی۔ یہ جبر کی جدائی تھی۔ اس جدائی کے جبر کو وہ کبھی بھولتے ہی نہ تھے۔ بہت سی رباعیوں اور قطعات میں اس ہجر سے ان کے والہانہ عشق کا اظہار ملتا ہے۔ وہ بے چین ہیں مگر بے بس۔ واپسی کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس بے بسی نے ان کے اندر لکھنؤ کی محبت اور بھی توانا کر دی تھی کہ غزلوں میں کھل کر اس کا اعلان کرتے ہیں اور اس قدر

۱- کلیاتِ ناسخ، مطبع نامی، ۱۲۵۸ھ، ص ۲۸۶ -

برملا کہ بعض غزلوں کا موضوع تو لکھنؤ ہے ہی ، ردیف بھی "لکھنؤ" ہے :

آسماں کی کیا ہے طاقت جو چھڑائے لکھنؤ
لکھنؤ مجھ پر فدا ہے ، میں فدائے لکھنؤ
پچھم اور اُتر کے کونے سے چلی آتی ہے روز
بوئے زلفِ یار لے کر ہوائے لکھنؤ
دشتِ غربت میں نظر آتی ہے جب مہماں سرا
یاد آتی ہے مجھے عشرت سرائے لکھنؤ
کب ہوا ہے ساکن و مسکن میں ایسا ارتباط
میں نہ جاؤں تو مرے پاس آپ آئے لکھنؤ

مرے دم سے تھا بوستاں لکھنؤ
مگر ہو گیا اب خزاں لکھنؤ
یہ اعلیٰ مرے لکھنؤ کی ہے شان
زمیں ہے جہاں ، آسماں لکھنؤ
ملاقات باہم رہی حشر پر
کہاں میں ، کہاں تو ، کہاں لکھنؤ
مریں گے تو پہنچیں گے بے شبہہ ہم
کہ فردوس ہے بے گماں لکھنؤ
الٰہی یہ ناسخ کی ہے التجا
مرے دم سے ہو شادماں لکھنؤ

یاد ہیں سب گل عذارِ لکھنؤ
جو تصور میں بہارِ لکھنؤ

یاد آ جاتی ہے اسے داغِ جنوں
کیا نسیمِ مشک بارِ لکھنؤ
گل سے رنگیں تر ہیں خارِ لکھنؤ
نشے سے بہتر خمارِ لکھنؤ
سارے نقشے سامنے آنکھوں کے ہیں
نقش ہیں ، نقش و نگارِ لکھنؤ

چند شعر اور بھی ہیں جو ناسخ کی لکھنؤ سے والہانہ محبت کا اظہار اور لکھنؤ میں اپنے نہ ہونے پر ماتم بھی ہیں اور نوحہ بھی :

ہم صفیر ! اپنا وطن ہے لکھنؤ
ہم تو بلبل ہیں ، چمن ہے لکھنؤ
کر دیا ہے بے قضا نے کیا فراق
جان میں ہوں اور تن ہے لکھنؤ
گلیوں میں ہر سنگ ریزہ ہے عقیق
راست کہتا ہوں یمن ہے لکھنؤ
میں حزیں آوارۂ غربت جو ہوں
ان دنوں بیت الحزن ہے لکھنؤ
میں نہیں ناسخ تو کیا تاریک ہے
شمع ہوں میں ، انجمن ہے لکھنؤ[1]

لکھنؤ کے ہجر و فراق[2] کا بیان دیکھ کر وہ ایک سچے

۱- کلیاتِ ناسخ ، مطبع مجیدی ، ۱۲۵۸ھ ، ص ۲۰۶ ، ۲۰۷ ، ۲۰۸ (حاشیہ) -

۲- ''گلشنِ ہمیشہ بہار'' میں اس فراق کے متعلق نصراللہ خاں خویشگی لکھتے ہیں : ''. . . گویند کہ در ایام فراق لکھنؤ و اتفاق مہاجرت احباب او اشعار درد آمیز عشق انگیز می گفت و طاقتش طاق و زندگی او شاق بود ، دمے بے ہمدمے نمی آسود و کاهش تن می فزود'' - (''گلشنِ ہمیشہ بہار'' ، انجمن ترقی اردو ، ۱۹۶۷ع ، ص ۲۱۲) -

عاشقِ لکھنؤ اس لیے نظر آتے ہیں کہ اس طرح کے اشعار میں جذبے کی صداقت جھلکتی ہے ۔ فنی تراش خراش نہ سہی ، زبان کا وہ چٹخارا اور بھول بھلیاں بھی نہ سہی ، مگر ایک تحیّر کی فضا ضرور ہے جو قاری کو سحر زدہ کر دیتی ہے ۔ حسرت و اندوہ کے رنگ کہیں گاڑھے اور کہیں ہلکے ہیں ، مگر جذبہ اتنا سادہ اور بے ساختہ ہے کہ امنڈا پڑتا ہے ۔ اور قاری کے دل کو ، مصنوعی ہجر و فراق کے اظہار کے مقابلے میں کہیں زیادہ اثر انداز ہو کر گداز کر دیتا ہے ۔

بہرحال ناسخ کے نوحے رنگ لائے اور حالات نے ایک مرتبہ پھر پلٹا کھایا ۔ ۱۸۳۲ء میں حکیم مہدی معزول ہوئے اور لکھنؤ سے نکل گئے ۔ اب وزارت روشن الدولہ کے سپرد ہوئی جو آغا میر کے دور کے رشتہ دار بھی تھے اور ان کا ناسخ سے بھی تھوڑا بہت تعلق تھا ۔ ہرچند کہ آغا میر لکھنؤ سے کانپور آ چکے تھے اور ان کا انتقال بھی کچھ عرصہ پہلے ہو چکا تھا ، ناسخ کے لیے روشن الدولہ کی وزارت لکھنؤ لوٹنے کا پروانہ تھی ۔ وہ اس پر خوش اور جذباتی بھی ہوئے ۔ ایسا کیوں نہ ہوتا ، پانچ برس کی جلا وطنی اور جبر کے بعد وہ اپنے لکھنؤ لوٹ رہے تھے ۔ حالانکہ اس سے ذرا پہلے وہ اس قدر مایوس تھے کہ واپسی کی کوئی امید دکھائی نہ دیتی تھی :

دشت سے کب وطن کو پہنچوں گا
کہ چھٹا اب تو سال آ پہنچا[۱]

اب واپسی کی امید پیدا ہوئی اور پھر وہ اپنی پہلی جلا وطنی سے ۱۸۳۲ء ہی میں لوٹے ۔ اتنے برسوں بعد وطن لوٹے تو خوشی

۱- کلیاتِ ناسخ ، ۱۲۵۸ء ، ص ۴۴ (حاشیہ)

جذباتی ہو جانا فطری تھا ۔ بے ساختہ ایک غزل لکھی :

دوں اور غربت ! وطن نزدیک ہے
مرغِ جاں خوش ہو ، چمن نزدیک ہے

ہے شکستہ گر عقیقِ دل تو کیا
اور لے لیں گے ، یمن نزدیک ہے

نو بنو ہو جائیں گے زخمِ کہن
غم نہیں اے دل ختن نزدیک ہے

دور سے آواز آتی ہے مجھے
آج بوئے پیرہن نزدیک ہے

جوئے اشک آنکھوں سے جاری ہے یہاں
کیا مزارِ کوہ کن نزدیک ہے

کر وضو ناسخ برائے فاتحہ
روضہ شاہِ زمن نزدیک ہے[۱]

لکھنؤ کا وصال ان کے لیے راحتِ جاں تھا ، مگر زمانہ بدل گیا تھا ۔ اور پھر نہ آغا میر تھے نہ وہ محفلیں نہ ان محفلوں کا وہ رنگ کہ جو تھا ۔ لہٰذا مشاعروں میں شرکت ختم تو نہیں کی ، مگر بہت حد تک کم کر دی تھی ۔ اب اس امید پر کہ باقی زندگی وطن میں ہی چین سے رہوں گا ، وہ خوش اور پرسکون تھے ۔ مگر کچھ ہی سال بعد نصیرالدین حیدر کی موت (جولائی ۱۸۳۷ء) نے ایک مرتبہ پھر حالات کو تلپٹ کر دیا جب تخت پر محمد علی شاہ متمکن ہوئے ۔ محمد علی شاہ کی تخت نشینی تک تو بات ٹھیک تھی مگر محمد علی شاہ

۱۔ کلیاتِ ناسخ ۱۲۵۸ھ ، ص ۳۵۲ (حاشیہ) ۔

کا ایک زمانے میں حکیم مہدی سے بہت ربط رہا تھا اور یہ بالتیم ناسخ
کے لیے ایک اور مصیبت کا باعث ہو سکتی تھی۔ اور ہوا بھی یہی کہ
محمد علی شاہ نے تخت نشینی کے بعد روشن الدولہ کو معزول کر دیا اور
حکیم مہدی کو فرخ آباد سے بلایا اور منصبِ وزارت دوبارہ ان کے
سپرد کر دیا گیا۔ ناسخ کے لیے پھر سے حالات غیر یقینی ہو گئے۔
حکیم مہدی سے ایک مرتبہ تو وہ بچ چکے تھے مگر ان کے وزارت
میں آنے کے بعد ناسخ نے فرار کی کوشش نہ کی۔ وہ چاہتے تھے کہ
کسی طریقے سے حالات ہموار ہو جائیں اور وہ معتوب ہونے سے بچ
جائیں، مگر حکیم مہدی ان ہجویہ اشعار کو نہیں بھولے تھے۔
موصوف نے اسی طرح چوبدار بلانے کو بھیجا جس طرح آغا میر نے
کبھی بھیجا تھا اور ناسخ نے اسی طرح، طرح دے دی جس طرح
کہ آغا میر کے چوبدار کو دی تھی۔ چوبدار کو اچھی خاصی رقم دی
خاطر مدارت کی اور ایسا شربت پلایا جس میں نشہ بھی تھا، اور
خود تیاری کے بہانے نکل آئے۔ چوبدار فوراً ہی سو گیا اور ناسخ
فقیر محمد خاں گویا کے ہاں پہنچے، وہیں سے سواری کا انتظام ہوا اور
لکھنؤ سے نکل گئے۔ پہلے ملیح آباد، پھر کانپور ہوتے ہوئے الہ آباد
آ گئے۔ ہر چند کہ یہ ان کے لیے جان لیوا صدمہ تھا مگر اس کے
سوا چارہ نہ تھا۔

مگر اس مرتبہ خدا نے کرم کیا اور حکیم مہدی کو زیادہ
مہلت نہ دی۔ لہٰذا وہ ۲۵ دسمبر ۱۸۳۷ء کو انتقال کر گئے،
اور یوں ان کا عہدِ وزارت چندہ ماہ سے زیادہ طویل نہ ہو سکا۔
گویا ناسخ کی جلا وطنی مختصر ہو گئی۔ اس خبر نے دوبارہ ناسخ
کو زندگی دی اور وہ چند ماہ کی جلا وطنی بھگت کر حکیم مہدی

کے منوبہ کے چند روز بعد ہی لکھنؤ آ گئے ۔ یعنی جنوری ۱۸۳۸ع کے شروع میں ۔ ان کے دل پر جو بوجھ اور ذہن پر صدمہ تھا ، شاید اسے کم کرنے کے لیے ہی حکیم مہدی کا مصرع تاریخ بھی کہا :

شبِ ولادتِ عیسٰی بمرد ابن دجال

دو مرتبہ کی جلا وطنی اور اس کے ذہنی صدمے ، لمحہ بہ لمحہ خوف اور بے یقینی نے انہیں نڈھال کر دیا تھا ۔ ہر چند کہ انہوں نے محمد علی شاہ کے لیے بہت مدحیہ قطعات لکھے تھے اور اب فوری طور پر انہیں کوئی خطرہ بھی لاحق نہ تھا تاہم وہ بیمار رہنے لگے تھے ۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ چچا نے جائداد کے لالچ میں زہر دیا تھا جس کے باعث بیمار رہنے لگے تھے اور بیسن کی روٹی کھاتے تھے ۔ وجہ کچھ بھی ہو ، مگر عروج اور اس کے بعد جلا وطنی اور اس کی صعوبتوں نے ، جو ان کے لیے ذہنی صدمے اور اعصابی تناؤ کا سبب بنیں ، انہیں بے بس کر دیا تھا ۔ مشاعروں میں شرکت تقریباً ختم ہو گئی تھی ۔ مگر اس دورِ زوال میں بھی انہوں نے اپنی مثنوی سراج نظم مکمل کی ۔ تیسرا دیوان جو کہ مختصر تھا انہوں نے اپنی زندگی میں ہی (۱۸۳۸ع) ترتیب دیا ۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ ناسخ اپنی بیماری اور اس کی علامات کے بارے میں جان گئے تھے ، ورنہ تیسرا دیوان اتنے اختصار کے باوجود مرتب نہ کرتے ۔ ناسخ جو دبستانِ لکھنؤ کے بڑے شاعر ہی نہیں ، بلکہ اس دبستان کی مرکزی شخصیت بھی تھے ، ۱۵- اگست ۱۸۳۸ع/۱۲۵۴ھ کو انتقال کر گئے اور جس مکان میں رہتے تھے اسی میں دفن ہوئے ۔

رشک اور دیگر شاگردوں نے بہت سی تاریخیں کہیں ۔ رشک کی تاریخیں درج کی جاتی ہیں کہ فارسی تاریخ میں دن مہینہ سال بھی

درج ہے اور کوئی مغالطہ نہیں رہتا :

(۱) اٹھا مرگِ ناسخ کا غل چار سُو سے
گیا لطف تحقیق کا گفتگو سے
کہا رشک نے مصرعِ سالِ رحلت
دلا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے

۱۲۵۴ھ

(۲) وا دریغا ! کرد رحلت ناسخِ معجز بیان
انتقالش داد عالم را غمِ جاں کاہ وائے
بود پنجاہ و چہارم بعد یک الف و دو صد
بود از ماہ محرم پنجمیں اے ماہ وائے
ماہ و تاریخ و سنین و روز مرگش گفت رشک
بود پنجم بست و چارم پنجشبہ آہ وائے[۱]

سید شبیہ الحسن نے اس تاریخ کو ذرا مختلف درج کیا ہے ۔ بہرحال دونوں تاریخیں رشک کی ہیں ، اور چونکہ رشک تاریخ گوئی میں بڑے باکمال شاعر تھے لہٰذا اسے بھی درج کرتا ہوں :

وا دریغا ! کرد رحلت ناسخِ معجز بیاں
انتقالش داد عالم را غمِ جاں کاہ وائے
یک ہزار و دو صد و پنجاہ و چا سال بود
از محرّم بود ماہ پنجمیں ، آں ماہ وائے
رشک روز مرگ و تاریخ و سنین و ماہ گفت
بود پنجم بست و چارم پنجشنبہ آہ وائے

۱- تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا ، جلد دوم ، مجلس ترقی ادب ، ص ۲۰۶ ۔

(۲)

ناسخ کا بڑا اثاثہ ایک کلیات پر مشتمل ہے ۔ اس کلیات میں دو بڑے اور ایک مختصر دیوان اور ایک مثنوی شامل ہے ۔ اس کے علاوہ فردیات ، مدحیہ قطعات ، رباعیات اور تاریخی قطعات بھی ہیں ۔ مثنویات الگ بھی چھپی ہیں ۔ مثلاً ایک طویل مثنوی ''سراج نظم'' کے نام سے الگ چھپی ہے اور ایک مختصر مثنوی ''مثنوی ِ ناسخ'' کے نام سے ۔ اس کے علاوہ بھی تین مثنویاں ان سے منسوب کی جاتی ہیں : (۱) مثنوی معراج ۔ (۲) مثنوی شہادت نامہ آل نبی اور (۳) مثنوی مولدِ رسول مختار ۔ ان کے علاوہ ایک رسالہ قافیہ بھی ناسخ سے منسوب ہے ۔ مگر پہلے کچھ کلیات کے بارے میں ۔

کلیات کی پہلی اشاعت ان کے انتقال کے تقریباً چار برس بعد یعنی ۱۸۴۲ع / ۱۲۵۸ھ میں ہوئی ۔ یہ اشاعت لکھنو کے مطبع محمدی میں ہوئی تھی جس کے مالک و مہتمم میر حسن رضوی تھے اور اس اشاعت کی نگرانی کا کام ناسخ کے شاگرد علی اوسط اشک نے کیا تھا ۔

کلیات میں تین دیوان ہیں مگر بظاہر دو دیوان معلوم ہوتے ہیں ۔ پہلے دیوان کا نام ''دیوانِ ناسخ'' تاریخی نام ہے جو شاگرد ناسخ میاں غنی نے رکھا ۔ یہ دیوان ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ - ۱۸۱۶ع میں مرتب ہوا ۔ دوسرے دیوان کا نام ''دفتر پریشاں'' ہے جو خود ناسخ کا رکھا ہوا ہے اور اس کا بڑا حصہ عہدِ جلا وطنی میں کہی ہوئی غزلوں پر مشتمل ہے ۔ یہ دیوان ۱۲۴۷ھ مطابق ۳۲ - ۱۸۳۱ع میں مرتب ہوا تھا ۔ یہ زمانہ جلا وطنی کا ہے ۔ ناسخ ابھی واپس لکھنؤ نہ آئے تھے ۔ تیسرے دیوان کا نام ''دفترِ شعر'' ہے جو ناسخ کے عزیز شاگرد رشک کا رکھا ہوا ہے ۔ یہ بھی تاریخی نام ہے جو ہجری حساب سے ۱۲۵۵ھ اور عیسوی

حساب سے ۳۹ - ۱۸۳۸ بنتا ہے - مگر یہ ۱۸۳۸ء ہی میں مرتب ہو چکا تھا کیونکہ یہی سال ناسخ کی وفات کا ہے اور یہ دیوان ان کی زندگی میں مرتب ہو گیا تھا - یہ دیوان مختصر ہے - اگر اس کے چند ایک علیحدہ مخطوطے دستیاب نہ ہوتے تو یہ (تیسرا دیوان) غلط فہمیوں کا شکار رہتا - (اور بہت عرصہ رہا بھی) یہی سمجھا جاتا رہا کہ ناسخ کے دو ہی دیوان ہیں - یہ غلط فہمی اشاعتِ اول سے دور ہوئی اور معلوم ہوا کہ شائع کرتے وقت رشک نے اس کے مختصر ہونے کے باعث اس کو ردیف وار ملا کر چھپوا دیا تھا - اشاعتِ اول یعنی مطبع محمدی سے چھپنے والے کلیات کے آخر میں واضح طور پر یہ عبارت درج ہے :

"... الحمد للہ کہ بفرمائش سید صاحب ممدوح کلیاتِ مذکور بطرزِ دلکش با حجمِ قلیل کہ دیوانِ اول مسمی بدیوانِ ناسخ در متن و دیوان دوم مسمی بدفتر پریشان بر حاشیہ ، دیوان سوم مسمی بدفتر شعر بر حاشیہ در ہر ردیف بضمیمہ د - دفتر پریشان و مثنوی و رباعیات و تاریخہا نیز در متن و بعضی از تاریخہا و رباعیات بر حاشیہ بتاریخ بست و یکم ذالحجہ سنہ یک ہزار و دو صد و پنجاہ و ہشت ہجری در مطبع محمدی -"[1]

جانے کیوں رشک نے دیوان سوم کو دیوان دوم میں ضم کر دیا اور تین دیوانوں کو دو کی صورت دے دی - قیاس یہی ہے کہ "دفتر شعر" کو اختصار کے پیش نظر "دفترِ پریشان" میں کھپا دیا گیا مگر یہ بہت ہی غیر مناسب بات تھی - اگر

۱- کلیاتِ ناسخ ، مطبع محمدی ۱۲۵۸ھ ، ص ۴۰۲ (پنجم) -

"دفتر شعر" کا مخطوطہ علیحدہ نہ ملتا تو یہ گتھی کبھی نہ سلجھ پاتی اور یہ معلوم کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا کہ دیوان دوم کی ہر ردیف میں کہاں دیوان دوم کا اختتام ہوتا ہے اور کہاں سے دیوان سوم کا آغاز۔

نسخۂ مطبع محمدی ۱۲۵۸ھ سے جو شہادت ملتی ہے اس سے کم از کم تیسرے دیوان کے وجود پر شبہ باقی نہیں رہتا حالانکہ ناسخ نے اسے اپنی زندگی میں ترتیب دیا تھا جس کا ثبوت وہ شعر ہے جس میں ناسخ نے نئے دیوان کے مرتب ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اور غالباً اسی تیسرے دیوان کا حصہ بھی ہے:

پھر کسی محبوب معنی فہم سے الفت ہوئی
پھر نیا دیوان ناسخ کا مرتب ہو گیا[1]

البتہ رشک نے اس دیوان کا نام رکھا تھا جو تاریخی نام ہے اور جس سے ہجری حساب سے ۱۲۵۴ حاصل ہوتے ہیں (یعنی سنہ ۱۹۳۸ - ۱۸۳۹ء)۔

مثنویات:

کلیات کے آخر میں دواوین کے بعد حاشیے پر ایک مثنوی بھی ہے جس کا کوئی نام نہیں ہے۔ مگر علیحدہ ایڈیشن میں اس کا نام "مثنوی ناسخ" درج ہے۔ یہ ایڈیشن ۱۹۳۱ء میں حبیب اللہ خاں غضنفر نے مرتب کرکے الہ آباد سے شائع کیا تھا جس پر اشاعتی ادارے کا نام "کتابستان" درج ہے۔ یہ مثنوی خوبصورت ٹائپ میں چھاپی گئی ہے جو اس زمانے میں مروج تھا۔ "مثنوی ناسخ"

۱۔ کلیات ناسخ، مطبع محمدی ۱۲۵۸ھ، ص ۶۲، حاشیہ۔

بعد کی بعض اشاعتوں میں شامل رہی مگر پھر اسے حذف کر دیا گیا ۔ سید شبیہ الحسن کے مطابق ''ناسخ کے کلیات کا جو ایڈیشن ۳ ۱۸۴ء میں چھپا اس میں یہ مثنوی موجود ہے ۔ پھر بعد میں جو ایڈیشن نول کشور کے چھاپہ خانے سے چھپے ان میں سے یہ مثنوی حذف کردی گئی ۔''[۱]

یہ بات اس حد تک تو درست ہے کہ نولکشور کے ایڈیشنوں میں اس مثنوی کو شامل نہیں کیا گیا ۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ ۱۸۶۳ء (بمطابق ۱۲۷۹ء) تک کلیات کے جو ایڈیشن شائع ہوئے ان سب میں اسے شامل رکھا گیا ہو ۔ مطبع نولکشور کے علاوہ بھی یہ مثنوی بعض اشاعتوں میں شامل نہیں ۔ اس سلسلے میں میں نسخۂ مصطفائی کا ذکر خصوصی طور پر کروں گا جوکہ نسخۂ مطبع محمدی (۱۲۵۸ھ) کی صفحہ بہ صفحہ نقل ہے اور جسے مطبع سلطانی نے ۱۲۶۷ھ میں شائع کیا تھا مگر ''مثنوی ناسخ'' اس میں شامل نہیں ہے ۔ لہٰذا سید صاحب کا یہ کہنا کہ صرف نولکشور کے ایڈیشنوں میں اسے حذف کر دیا گیا ، درست نہیں ہے ۔

''مثنوی ناسخ'' دراصل بعض عربی روایتوں کا ترجمہ ہے ۔ حبیب اللہ خاں غضنفر نے مقدمے میں وہ عربی روایتیں بھی درج کردی ہیں جن پر ناسخ نے ترجمے کی بنیاد رکھی :

''مقدمے میں اس امر کا اہتمام کیا گیا ہے کہ جن روایتوں کا شیخ نے ترجمہ کیا ہے وہ درج کردی جائیں ۔''[۲]

۱۔ ناسخ ، از سید شبیہ الحسن ، ص ۴۷ ۔

۲۔ مثنوی ناسخ ، مرتبہ حبیب اللہ خاں غضنفر ۱۹۳۱ء ، عرض حال ، صفحہ ب ۔

مگر مرتب کو بعض روایتیں دستیاب نہ ہو سکی تھیں۔ خصوصاً ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۳۰، ۳۳ اور ۴۰۔ تاہم ان میں سے چار روایتیں بعد میں دستیاب ہو گئیں، لہٰذا ان کا اندراج مقدمے کی بجائے "عرضِ حال" کے تحت کیا گیا۔ ان میں ۲۶، ۳۰، ۳۳ اور ۴۰ نمبر کی روایتیں ایسی تھیں جو بعد میں دستیاب ہوئیں۔ مگر سب نہ مل سکیں۔ روایتوں کی کل تعداد ۴۴ ہے مگر پہلی اور دوسری میں حمد اور نعت ہونے کے سبب چھوڑدی گئی ہیں اور روایت نمبر ۳ سے اندراج کیا گیا ہے۔ لہٰذا مندرج روایتوں کی تعداد ۳۷ رہ جاتی ہے اس لیے کہ روایت نمبر ۱۸ اور نمبر ۴۴ پر "کسی خاص روایت کا ترجمہ نہیں ہے" لکھ دیا گیا ہے۔ مقدمے اور روایتوں کے بعد ص ۲۵ سے مثنوی کا آغاز ہوتا ہے اور ص ۵۷ پر اختتام۔ سائز $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ ہے۔ آخری تین صفحات پر مشکل الفاظ کی شرح بھی درج کردی گئی ہے۔ زیر طبع کتابوں کے اشتہار میں "دفترِ شعر" کا اشتہار بھی درج ہے اور "دفترِ شعر یا دیوانِ ناسخ سوم" لکھا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیوان سوم الگ سے شائع کرنے کا اہتمام ضرور ہوا تھا۔ حبیب اللہ غضنفر نے اس مثنوی کے مآخذ کے لیے کلیاتِ ناسخ، مطبع مولائی، لکھنؤ ۱۲۶۲ھ اور کلیاتِ ناسخ (مخطوطہ) مکتوبہ ۱۲۶۶ھ سٹیٹ لائبریری رام پور کا حوالہ دیا ہے اور لکھتے ہیں: "یہ نسخہ ۱۲۶۶ھ میں حافظ محمد بخش نے نواب سید احمد عباس صاحب خلف نواب سید حیدر حسین خاں صاحب کے واسطے لکھا تھا۔ ہر صفحے پر تیرہ سطریں ہیں۔ خط بہت صاف اور واضح ہے۔ دوسرا نسخہ مطبع مولائی (لکھنؤ) کا چھپا ہوا ہے۔ یہ نسخہ مصنف کے انتقال سے آٹھ سال کے بعد

۱۲۶۲ھ میں چھپا تھا۔"[1]

بہر حال "مثنوی ناسخ" میں سات سو اشعار ہیں۔ زبان صاف ستھری اور بندشیں پختہ ہیں۔ مگر وہ حسن اور صفائی جو ناسخ کے لیے مخصوص ہے، موجود نہیں ہے۔ اگرچہ متفرق روایات کا ترجمہ بامحاورہ ملتا ہے مگر وہ لفظی صنعتیں، جو طرز لکھنؤ کا خاصہ اور ناسخ کا حصہ ہیں اس میں نہیں ہیں۔ تاہم عربی کے ثقیل الفاظ ضرور استعمال ہوئے ہیں جو شعریت کو متاثر کرتے ہیں۔ مثلاً تشکیک، مسترشد، لحم، شحم، مختن، مرتاض وغیرہ۔

"مثنوی ناسخ" کا آغاز ایک حمد سے ہوتا ہے اور اس کے بعد نعت ہے۔ موضوع حضرت علی علیہ السلام کی ولادت اور اس سے متعلق مختلف واقعات ہیں۔ حمد سمیت ۴۴ عنوانات ہیں یعنی روایتوں کے مساوی۔

محسوس یہ ہوتا ہے کہ "مثنوی ناسخ" نہ تو بالکل ابتدائی دور کی ہے اور نہ آخری دور کی۔ تاہم ناسخ اس پر شاید پوری توجہ نہیں دے سکے جیسی کہ انھوں نے "سراج نظم" پر دی ہوگی۔

سراج نظم :

"سراج نظم"[2] ناسخ کی وفات کے سال یعنی ۱۸۳۸ع میں مکمل ہو گئی تھی۔ یہ مثنوی پہلی مرتبہ ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ع میں شائع ہوئی تھی۔ تیسرے دیوان کی طرح رشک نے ہی اس کا تاریخی

۱۔ مثنوی ناسخ، مرتبہ حبیب اللہ خان غضنفر، کتابستان الہ آباد، ۱۹۳۱ع، صفحہ الف۔

۲۔ نظم سراج: آب حیات، وکٹوریہ پریس لاہور ۱۸۸۳ع، ص ۳۶۵۔

نام رکھا تھا - مثنوی کے نام سے سنہ تصنیف ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء ہی نکلتا ہے اور یہ سب ناسخ کی زندگی میں ہوا - اس مثنوی میں اشعار کی تعداد ۲۶۹۵ ہے اور ذیلی عنوانات ۱۶۳ ہیں اور یہ عنوانات چار مجلسوں میں تقسیم کر دیے گئے ہیں - اس مثنوی کا موضوع حدیثِ مفضّل ہے - مفضّل امام جعفر صادق علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے جو ان کی احادیث کے معتبر راوی خیال کیے جاتے ہیں - اصل حدیث عربی زبان میں ہے مگر اس کا فارسی ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور قیاس یہی ہے کہ ناسخ نے فارسی ترجمے کو ہی اس مثنوی کی بنیاد بنایا ہوگا -

"سراج نظم" ناسخ کی وفات کے دس گیارہ برس بعد شائع ہوئی اور لکھنؤ میں حاجی حرمین محمد حسین کے مطبع میں چھپی جو اس دور کا مشہور چھاپہ خانہ تھا - "سراج نظم" دیگر تمام منسوبہ مثنویوں میں طویل بھی ہے اور معیاری بھی - مگر ناسخ کے اس خاص اسلوب کی جھلک اس میں بھی نہیں جو ناسخ کی پہچان ہے - شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ مثنوی تخیل کی بنیاد پر نہیں لکھی گئی جس میں ناسخ اپنے تخلیقی عمل اور زورِ کلام کا اظہار کر سکتے - یہ ایک مقدس حدیث اور کلامِ امام کے ترجمے اور خلاصے کی بات تھی جس کا تقاضا تھا کہ اسے خاص حدود کے اندر رہ کر شعری قالب میں ڈھالا جائے - ناسخ نے اس تقاضے کو مد نظر رکھا اور تخیل اور بلند پروازی سے گریز کیا - بقول مولانا محمد حسین آزاد :

"نظم سراج کی نظم لوگوں کی رائے میں ان کے رتبہٗ عالی سے گری ہوئی ہے اور چونکہ پابندی ترجمۂ حدیث کی

ہے ، اس لیے اس پر گرفت بے جا ہے ۔

تاہم ناسخ کا اسلوب خاص نہ ہونے کے باوجود یہی دو مثنویاں قابلِ ذکر ہیں ۔ دوسری تین مثنویاں جو ان سے منسوب ہیں ، ان دونوں کے مقابلے میں کمزور بھی ہیں اور مشکوک بھی ۔ ان مثنویوں کے نام ''مولد شریف رسول مختار''، ''مثنوی معراج'' اور ''مثنوی شہادت نامہ آلِ نبی'' ہیں ۔ ان میں سے دو مثنویوں کا ذکر صرف تذکرۂ ''سراپا سخن'' میں محسن علی نے کیا ہے اور ''مثنوی معراج'' کا تو ذکر بھی کہیں نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ ان مثنویوں کا ذکر کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا ۔ محسن علی نے ''سراپا سخن'' میں یوں تو ناسخ کا ذکر اٹھارہ سے زیادہ مرتبہ کیا ہے ، یعنی دیباچے کے علاوہ صفحہ ۵۵ ، ۹۹ ، ۱۲۱ ، ۱۲۳ ، ۱۳۳ ، ۱۳۹ ، ۱۴۸ ، ۱۶۰ ، ۱۶۴ ، ۱۶۹ ، ۱۷۶ ، ۱۹۸ ، ۲۹۷ ، ۳۲۳ ، ۳۴۵ ، ۳۵۹ ، ۳۷۷ اور ۳۸۳ پر ۔ مگر تین دواوین کا ذکر تقریباً ہر جگہ موجود ہے ، سوائے دیباچے اور صفحہ ۱۷۶ ، ۲۹۷ پر ۔ مگر مثنویوں کا ذکر نہ تو تفصیل سے ملتا ہے اور نہ پورے یقین کے ساتھ ۔ ترجمہ حدیثِ مفضّل (سراج نظم) کا ذکر البتہ پانچ مرتبہ ہے مگر باقی مثنویوں کے بارے میں تین چار جگہ اشارۃً ذکر ملتا ہے ۔ پانچوں مثنویوں کا ذکر کسی جگہ ایک ساتھ بھی موجود نہیں ہے ۔ مثلاً ایک جگہ لکھا ہے :

''شیرِ بیشہ سخنوری شیخ امام بخش مرحوم ناسخ خلف شیخ خدا بخش ۔ وطن بزرگوں کا لاہور ، ان کا مولد و مسکن لکھنؤ ۔ تین دیوان ، ایک ترجمہ حدیثِ مفضّل ، ایک

۱۰۔ آبِ حیات ، طبع دوم ۱۸۸۳ع ، وکٹوریہ پریس لاہور ، ص ۳۴۶ ۔

مولد شریف رسولِ مختار اور ایک حال مولا علی مرتضیٰ علیہ السلام ان سے یادگار ہیں ۔"[1]

دوسری جگہ ایک مثنوی کا ذکر مزید شامل کر دیا گیا ہے :

"۔ ۔ ۔ تین دیوان ، ایک ترجمۂ حدیثِ مفضّل ، ایک رسالہ مولد شریف ، ایک رسالہ شہادت نامۂ جناب سید الشہدا اور ایک رسالہ جنابِ امیر علیہ السلام ان سے یادگار ہیں ۔"[2]

ان میں "مثنوی معراج" کا ذکر نہیں ہے ۔ حالانکہ اس جگہ انھوں نے سب سے زیادہ تفصیل درج کی ہے ۔ پھر ایک جگہ لکھا ہے :

"تین دیوان ، تین مثنویاں و مولد شریف ان سے یادگار ہیں ۔"[3]

لگتا یہی ہے کہ باقی تین مثنویاں سہواً ان سے منسوب کردی گئی ہیں ۔ خصوصاً مولد شریف رسول مختار کیونکہ محسن علی کے علاوہ کسی اور نے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا ۔ ایک شبہ یہ بھی ہے کہ اگر اس نام کی کوئی مثنوی تھی تو وہ شروع عہد میں ہی ضائع ہو گئی ہوگی ۔

دوسری مثنوی "مثنویِ معراج" ہے ۔ اس کا حال تو یہ ہے کہ اس کا ذکر محسن علی نے بھی نہیں کیا ۔ البتہ سید شبیہ الحسن

۱۔ تذکرۂ سراپا سخن ، مطبع نامی نولکشور لکھنؤ ۱۸۹۸ع ، ص ۱۶۴ ۔
۲۔ ایضاً ، ص ۳۴۳ ۔
۳۔ ایضاً ، ص ۳۴۵ ۔

کے حوالے سے اتنی بات معلوم ہوئی ہے کہ اس کا جو مخطوطہ ملا تھا وہ ناقص تھا جس کا ذکر ڈاکٹر رشید حسن خاں نے اپنے مضمون مطبوعہ رسالہ اردو کراچی میں کیا تھا ۔ جو اوراق دستیاب ہوئے تھے ان میں اشعار کی تعداد ۳۴۵ ہے اور یہ ناسخ کی وفات کے بعد تیار کی گئی تھی ۔[1] زیادہ امکان یہی ہے کہ یہ مثنوی ناسخ کی نہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ ناسخ شیعہ عقائد پر سختی سے کاربند تھے ۔ ہرچند کہ ان کے والد سنّی قبرستان میں دفن ہیں مگر ناسخ کے عقائد بالکل واضح ہیں ۔ اور مثنوی کے اندر چونکہ شیعی عقائد کے خلاف باتیں ملتی ہیں لہٰذا یہ مثنوی مشکوک ہو جاتی ہے ۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے یہ ناسخ نے اس وقت لکھی ہو جب انھوں نے شیعی عقائد اختیار نہ کیے ہوں ۔ اگر ایسا ہے تو ناسخ نے اسے اس حد تک تو نظر انداز کر دیا کہ ان کا حلقۂ احباب اور شاگرد بھی اس کی خبر نہ پا سکے ۔ تو پھر ناسخ نے اسے ضائع کیوں نہ کردیا ؟ لہٰذا قرین قیاس یہی ہے کہ یہ مثنوی بھی محض ناسخ سے منسوب کردی گئی ہے ۔ تیسری مثنوی "شہادت نامہ آل نبی" ہے جس کا موضوع واقعات کربلا سے متعلق ہے اور یہ مثنوی مطبع نول کشور سے کئی مرتبہ چھپ چکی ہے ۔ مگر اس کے وجود کی شہادت بھی محسن علی کے تذکرۂ سراپا سخن میں ملتی ہے ۔ نولکشور والوں نے اسے ناسخ ہی سے منسوب کیا ہے ۔ مگر یہ اتنی کمزور ہے کہ زبان کے سقم بھی اس میں موجود ہیں اور یہ بات طے ہے کہ ناسخ سے زبان کی غلطی ناممکنات میں سے

۱۔ "ناسخ" از سید شبیہ الحسن کے صفحہ ۲۷ پر مثنوی معراج کے حوالے سے درج ہے : "ترقیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسے ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۳ء یعنی ناسخ کی وفات کے کئی سال بعد تیار کیا گیا تھا ۔"

ہے ۔ اگر ہم اسے ابتدائی عہد کی مثنوی بھی کہیں تب بھی ناسخ جیسے شاعر سے زبان کی اغلاط کی توقع نہیں کی جا سکتی ۔ اس بارے میں سید شبیہ الحسن کا یہ خیال :

"۔ ۔ ۔ یہ بھی امکان ہے کہ مثنوی کسی غیر معروف شاعر کی ہو جس کا نام امام بخش ہو اور لوگوں نے اور مطبع والوں نے بھی اس کو نام کے اشتراک کی وجہ سے ناسخ کی طرف منسوب کر دیا ہو ۔"[۱]

درست معلوم ہوتا ہے ۔ لہٰذا یہ مثنوی بھی ناسخ سے منسوب مثنویوں کی فہرست سے خارج ہو جاتی ہے ۔

اس طرح یہ تینوں مثنویاں اپنے اسقام اور غیر معیاری ہونے کے سبب مشکوک ہو جاتی ہیں ۔ البتہ "مثنوی ناسخ" اور "سراج نظم" یقیناً ناسخ کی مثنویاں ہیں اور معیار میں ، منسوبہ ان تین مثنویوں کے مقابلے میں بہت بہتر ہیں ۔

تاریخ گوئی :

ناسخ چونکہ مشکل پسند شاعر تھے لہٰذا تاریخ گوئی کی طرف ان کا رجحان فطری تھا ۔ آغاز سے آخری عہد تک وہ تاریخ گوئی کے مشغلے کو جاری رکھے رہے ۔ ان کے کلیات میں بہت سی تاریخیں موجود ہیں جو اہم واقعات سے بھی متعلق ہیں اور غیر اہم یا بے حد معمولی واقعات سے بھی ، مگر ان میں جدت موجود ہے ۔

تاریخ گوئی کا ذوق ناسخ اور ان کے تلامذہ کے حوالے سے اور بھی عام ہو گیا تھا اور اس حد تک کہ غزل کا مقطع تک تاریخی کہا

۱۔ "ناسخ" از سید شبیہ الحسن ، ص ۲۳ ۔

جانے لگا ۔ میر علی اوسط رشک کو جو ان کے شاگردوں میں بہت نمایاں ہیں ، تاریخ گوئی میں ملکہ حاصل تھا ۔

رباعیات :

ناسخ نے رباعیات تو لکھی ہیں مگر یوں جیسے پوری توجہ نہ دے سکے ہوں ، کیونکہ یہ رباعیات نہ تو تعداد کے اعتبار سے بہت زیادہ ہیں ، نہ معیار کے لحاظ سے اتنی اعلیٰ کہ انھیں فارسی یا اردو رباعی لکھنے والوں کے مقابلے پہ رکھا جا سکے۔ ناسخ اگر رباعیات پر توجہ دے سکتے تو یقیناً وہ ان میں اعلیٰ معیار قائم کر سکتے تھے ، مگر محسوس یہی ہوتا ہے کہ ان کا پسندیدہ میدان غزل تھا ۔ جس پر انھوں نے اپنی زیادہ توجہ مرکوز رکھی ۔

ان رباعیوں میں ناسخ اپنے رنگ سے ہٹے ہوئے بھی ہیں ۔ اس لیے کہ رباعیات میں صنعت گری اور لفاظی کے بجائے زیادہ تر سادہ زبان استعمال کی ہے ، مگر موضوع پھیکا ہونے کے سبب زیادہ موثر نہیں ہیں ۔ ہرچند کہ زیادہ تر رباعیاں جلا وطنی کے زمانے کی ہیں اس کے باوجود تاثیر سے خالی ہیں ۔ مگر ان کو نظم سلیقے سے کیا گیا ہے ۔ تاہم چند اچھی اور مضمون آفرینی والی رباعیوں کے حوالے سے ناسخ کو اس صنف میں کوئی بڑا مقام نہیں دیا جا سکتا ۔ اور یہی بات قطعات کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جو زیادہ تر مدحیہ ہیں اور سماجی طور پر ان کے روابط اور امراء سے ان کے تعلقات کا پتہ دیتے ہیں ۔ مگر شاعری میں ان کا کچھ مقام نہیں ہے ۔

مجموعی طور پر یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ ناسخ نے اپنے آپ کو ہیئت اور اس کے مسائل تک محدود رکھا ۔ ان کے ہاں زندگی کا کوئی بھرپور پہلو ، کوئی نیا شعور ، کوئی نظریہ نہیں ملتا ۔ بلکہ کسی جگہ

جب کوئی زندگی آمیز شعر نظر آتا ہے تو قاری چونک جاتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ عموماً اُن کا رنگ، تخیل ہی کی بنیاد پر جھلکتا ہے۔ جذبات اگر کہیں ہیں بھی تو روکھے پھیکے سے۔ زیادہ زور زبان کی گرہیں کھولنے یا اسلوب کو مانجھنے پر ہے۔ ہرچند کے وہ الفاظ کا انتخاب خوب سے خوب تر کرتے ہیں، الفاظ کی ترتیب بھی عمدہ اور مناسب ہوتی ہے، مگر موضوع نہ ہونے کے سبب، سارا کھیل بے جان ہو جاتا ہے۔ اگر کہیں موضوع ملتا بھی ہے تو زندگی کی ہماہمی سے دور، الگ تھلگ اور بے رس۔ اور وہ اس لیے کہ جب مبالغہ، تمثیل نگاری، مشکل پسندی اور سخت سے سخت زمین میں شعر ڈھالنے کا جنون ہوگا تو نتیجہ یہی نکلے گا۔ اور انھی باتوں سے ناسخ کا کلام بھرا پڑا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ مبالغے کو شاعری سے خارج نہیں کیا جا سکتا، مگر وہ مبالغہ جس میں توازن ہو، جو ناسخ کے ہاں اکثر موجود نہیں۔ اس دور میں اسی مبالغے کے تحت قصیدہ لکھنے کا رواج بھی عام ہوا تھا اور اس قدر غیر متناسب کہ مبالغے کو غیر معتدل کرنا ہی فن ٹھہر گیا تھا۔ اور یہ سب علامتیں جاگیردارانہ نظام کا عطیہ تھیں اور اسی سے غزل میں بھی قصیدے کا مبالغہ در آیا۔ یہ وبا اس قدر پھیلی کہ بڑے سے بڑا غزل گو بھی اپنا دامن نہ بچا سکا اور ناسخ تو پھر ناسخ تھے۔ قصیدہ نہ لکھنے کے باوجود ان کی غزل میں سارے لوازمات قصیدے کے مزاج سے قریب تر تھے۔ اور یہ بات ان کی اپنی ہی نہیں اس عہد کی بھی پسند تھی۔

اسی وبا کے پھیلاؤ کے باعث ہم اس عہد کی مجموعی غزل کی ساکھ کو اکثر مجروح ہوتا بھی دیکھتے ہیں۔ مثالیں ہر شاعر کے ہاں سے دی جا سکتی ہیں۔ مگر ناسخ کا کلام اس قسم کی مثالوں سے

بھرا پڑا ہے ۔ مثلاً :

لاغر ہیں ہم ایسے کہ نکل جائے جو چوٹی
اٹکے نہ ہمارا بدنِ زار گلے میں

پھر مہندی سے ہے شعلہ قدم اس رشک پری کا
باہوش نے سیکھا ہے چلن کبک دری کا

آتشِ رنگِ حنا سے مچھلیاں جلنے لگیں
آپ نے دھوئے جو دریا کے کنارے ہاتھ پاؤں

دن سیہ ، رات سیہ ، ماہ سیہ ، سال سیہ
دل سیہ ، بخت سیہ ، نامۂ اعمال سیہ
ایک میں اور ہیں یہ چار بلائیں کالی
خط سیہ ، زلف سیہ ، چشم سیہ ، خال سیہ

ناسخ لفظ لفظ جمع کرتے اور ان میں سے پسندیدہ الفاظ کو چھان کر الگ کرتے ہیں ۔ ان لفظوں کو ترتیب دیتے ہوئے زبان کے ترکش کے سارے تیر آزماتے ہیں اور خالص زبان کا لطف پیدا کرنے پر قادر نظر آتے ہیں ۔ اس سے زبان کا لطف تو پیدا ہوتا ہے مگر معنی آفرینی اور غزل کی جمالیات تنکا تنکا ہو جاتی ہیں ۔ البتہ اس کے برعکس بھی مثالیں ملتی ہیں ۔ مگر یوں کبھی کبھار ہی ہوتا ہے کہ خیال آفرینی ، تمثیل اور توجیہ کو ساتھ لے کر ان کے فن کو خوبصورت نمونے میں ڈھال دیتی ہو ۔ ایسے اشعار گو کم تعداد میں ملیں گے مگر ملیں گے ضرور ۔ اور بعض مصرعے تو ضرب المثل کی ذیل میں آتے ہیں :

۵۶

سب زخم مرے جلتے ہیں شعلے کی طرح سے
بجلی کی طرح ہے تری تلوار میں گرمی

کسی کا کب کوئی روزِ سیہ میں ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

مگر یہ مثالیں ناسخ کے ہاں اس وقت ملتی ہیں جب وہ صورت حال کو ڈرامائی موڑ دیتے ہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ایسے شعر پڑھنے والے کے لیے خوشگوار تجربہ بن جاتے ہیں۔

تاہم ان کا اصل فن وہی سنگلاخ زمینوں میں تیشہ چلانا ہے۔ ہرچند کہ اس کے لیے بڑی ریاضت اور محنت درکار ہوتی ہے، جذبے کے بغیر یوں بھی یہ کام پتھر کوٹنے اور بت گری کے سوا کچھ نہیں۔ پھر بھی انھیں یہی پسند ہے۔ زبان کی مانج دھانج، مشکل پسندی اور زود نویسی میں جان لڑا دینا ہی ان کے لیے زیادہ اعتبار کا باعث ہے۔ ان کا اپنا ایک شعر ان کے اسلوب کے پیچھے کارفرما ریاضتوں کا غماز ہے:

جی لڑا دیتا ہے کیسی ہی زمیں ہو سنگلاخ
خامہ تیشہ ہے تو ناسخ کوہ کن سے کم نہیں

حالانکہ کوہ کنی سے بت ہی بنائے جا سکتے ہیں، جان نہیں ڈالی جا سکتی۔ اور حیرت اس وقت ہوتی ہے جب وہ معتقدِ میر ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں:

شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

اور اس کے باوجود بے تاثیر شاعری کو مقصدِ فن ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ جہاں کہیں انھوں نے سادہ اور سلیس زبان میں شعر کہے

ہیں ، وہ نمایاں دکھائی دیتے ہیں ۔ اس بات کو اصلاحِ زبان کی مثال دے کر واضح کیا جا سکتا ہے کہ ہرچند انھوں نے زبان کی اصلاح بڑے سلیقے اور قرینے سے کی ، ان کی متروکات مثالی تھیں ۔ جو الفاظ انھوں نے اختیار کیے وہ مستند ٹھہرے ۔ مگر یہی شوق جب خبط کی حد کو چھونے لگتا ہے تو وہ کئی خوبصورت تراکیب اور خوشنما الفاظ زبان سے خارج ہی کر دیتے ہیں ۔ یہی حال ان کی ریاضت اور مشکل پسندی کے جنون کا ہے کہ جس اسلوب کو مشکل جانا ، اسی کے ہو رہے ۔ تاہم بہت سے اشعار سادہ اسلوب اور معنی آفرینی کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ درج کیے جائیں :

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں
جس سرزمیں کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں
دشمن اگر وہ دوست ہوا ہے تو کیا عجب
یاں ، اعتمادِ دوستیِ جسم و جاں نہیں

اس نے لکھا ہے اپنے ہاتھ سے خط
قاصدا ! مجھ کو اعتبار نہیں

یہ آدمی ہے کہ برسوں جہاں رہتا ہے
وگرنہ ماہ کو یک شب کہاں رہتا ہے

فرقت قبول ، رشک کے صدمے نہیں قبول
کیا آئیں ہم ، رقیب تری انجمن میں ہے

چاک کرنے کے لیے اے ناصح
ہم گریباں سیا کرتے ہیں

زندگی ، زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل ، خاک جیا کرتے ہیں
جن کی رفتار کے پامال ہیں ہم
وہی ، آنکھوں میں پھرا کرتے ہیں

صحن کوچہ ترا ہے اور میں ہوں
یہ زندانِ وفا ہے اور میں ہوں
یہی کہتا ہے جلوہ میرے بت کا
کہ اک ذاتِ خدا ہے اور میں ہوں
گیا وہ چھوڑ کر رستے میں مجھ کو
اب اس کا نقشِ پا ہے اور میں ہوں

آتشِ عشق وہ ہے جس سے سمندر جل جائے
اک شرر جائے جو پتھر میں تو پتھر جل جائے

اپنی اہمیت کے اعتبار سے وہ جلد ہی تسلیم کر لیے گئے تھے اور کوئی بھی قابلِ ذکر تذکرہ ان کے ذکر اور منتخب اشعار سے خالی نہیں ۔ مصحفی نے تو انھیں اپنے تذکرے ریاض الفصحا میں عزت سے جگہ دی تھی ۔ شیفتہ جیسے استاد اور دہلوی شاعر نے پہلے دیوان کو دیکھنے پر ہی انھیں خراج تحسین پیش کیا ۔

اگر ناسخ کے بارے میں قدیم و جدید تذکروں میں سے آرا اکٹھی کی جائیں (حق میں اور خلاف) تو بہت مواد اکٹھا ہو سکتا ہے ۔ مگر سب کا ذکر ضروری نہیں ۔ البتہ چند اہم آرا ایسی ہیں جن سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا ۔ مثلاً نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جو ناسخ کے معاصر بھی تھے اور تنقید کا بہت ستھرا مذاق

رکھتے تھے اور شاعر بھی اچھے تھے ، دلی والے ہونے کے باوجود غیر جانب دار اور سیاست یا گروہ بندی سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں وہ اپنے تذکرہ ''گلشنِ بے خار'' میں ناسخ پر اچھی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

''. . . والا مایہ ، عالی پایہ بلند اندیشہ نازک خیال است و در تلاشِ مضمونِ تازہ و معنی سیراب ۔ بے مثل و مثال از اقسام سخنوری . . . ۔''[۱]

نہ صرف رائے اچھی دی بلکہ (عمدۂ منتخبہ کے بعد) اس صدی کے تقریباً سب اہم تذکروں سے زیادہ اشعار کا انتخاب بھی درج کیا ہے ، حالانکہ ان کے پاس صرف پہلا دیوان پہنچا تھا ، انھوں نے ۱۰۰ اشعار درج کیے ۔ وہ ناسخ کے باب میں آگے جا کر لکھتے ہیں کہ تذکرہ مکمل ہو چکا تھا تو مجھے دوسرے دیوان کی اطلاع ہوئی جو مرتب ہو کر دہلی پہنچ گیا تھا ۔ لہٰذا میں اس دیوان سے اشعار کا انتخاب نہ کر سکا ، ہاں البتہ ان کی تازہ غزلوں سے کچھ اشعار منتخب کرکے درج کر دیے ہیں جو دوستوں نے تحفتاً بھجوائی تھیں ۔

تحفتاً غزلیں بھجوائے جانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناسخ اتنے اہم شاعر سمجھے جاتے تھے کہ ان کا کلام اہلِ علم کو تحفے کے طور پر بھجوایا جاتا تھا اور خصوصاً دہلی میں ۔ اس کے علاوہ شیفتہ کا انھیں ''بلند اندیشہ ، نازک خیال اور معنیِ تازہ کی تلاش میں بے مثل'' ، لکھنا ایک ایسی سند ہے جو ہر قسم کے اعتراضات کو رد کر دیتی ہے ۔

۱۔ تذکرۂ گلشن بے خار ، اکتوبر ۱۸۷۴ء ، مطبع نامی نول کشور لکھنؤ ص ۲۲۲ ۔

ان کی زندگی میں دوسری اہم رائے مصحفی کی ہے ۔ مصحفی جو ایک باکمال شاعر اور اہم تذکرہ نگار ہیں اور جنھوں نے ناسخ کو ۳۸ برس کی عمر میں اہم جانا جو کہ ان کا بالکل نہ سہی مگر ابتدائی دور تھا ، اپنے تذکرے ''ریاض الفصحا'' میں نہ صرف انہوں نے ناسخ کو جگہ دی ، بلکہ مہذب ، حلیم الطبع اور اردو کا شاعر لکھا اور یہ بھی کہ ناسخ معنیِ تازہ کی تلاش میں رہتے ہیں ۔ مصحفی لکھتے ہیں :

''جوان سیمن و سپاہی وضع ، حلیم الطبع و مہذب الاخلاق دیدمش ۔ عمرش سی و ہفت سالہ است ۔ از سنِ بست سالگی بمقتضائے موزونیِ طبع ، فکرِ شعرِ ہندی میکند و در تلاش ہائے معنیٔ تازہ می نماید ۔''[۱]

''ریاض الفصحا'' میں ہی مصحفی میرزا حسین علی خاں اثر کے بارے میں لکھتے ہوئے ناسخ کے بارے میں ایک مرتبہ پھر رائے کا اظہار کرتے ہیں :

''از نظر شیخ امام بخش ناسخ کہ در معنی بندیٔ تازہ علم استادی برافراشتہ اند و بہ فقیر ہم از تہِ دل دوستی دارند ۔''[۲]

مگر ناسخ کے بارے میں زیادہ کھل کر رائے انہوں نے اپنے دیوانِ ششم کے دیباچے میں دی ہے ۔ جہاں انہوں نے لکھنؤ کے

۱۔ ریاض الفصحا (تذکرۂ ہندی گویاں) مؤلف غلام ہمدانی مصحفی ، مرتبہ : مولوی عبدالحق ، طبع اول ، ۱۹۳۴ء ، ص ۳۴۴ ۔
۲۔ ایضاً ، ص ۲۲ ۔

نئے اسلوب اور نئے رنگ کا تذکرہ کیا ہے، وہیں لکھا ہے کہ اس اسلوب کا (زیادہ) حصہ شیخ امام بخش ناسخ کے حصے میں آیا جو محمد عیسیٰ تنہا کے دوست ہیں اور مجھ سے بھی دلی رسوخ رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی لکھا کہ ناسخ اپنے تخلص کی مناسبت سے اسم بامسمیٰ بنے اور سادگی کو پسند کرنے والے شعرا کے طرز بیان پر خط تنسیخ کھینچ دیا۔ مصحفی کی رائے کے بعد ''تذکرۂ سرور'' کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ بہت سے تذکرہ نگاروں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ اس کے مولف نواب میر محمد خاں ہیں۔ اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں تخلص سرور امرائے دہلی میں سے تھے۔ اچھے شاعروں میں شمار تھا۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے۔ ''عمدۂ منتخبہ'' یعنی تذکرۂ سرور ان کی گراں قدر تالیف ہے۔ یہ تذکرہ شیفتہ کے تذکرے ''گلشن بے خار'' سے پہلے لکھا گیا۔ کریم الدین کی یہ بات کہ ''عمدۂ منتخبہ دہلی میں بہت مشہور ہے، بڑی احتیاط سے لکھا ہے اور شیفتہ اور دوسرے تذکرہ نویسوں نے اس سے استفادہ کیا ہے'' درست ہے۔ کیونکہ ''گلشن بے خار'' ۱۲۵۰ھ میں مکمل ہوا جو سرور کا سال وفات ہے۔

اس تذکرے میں ناسخ کا پہلا بڑا انتخاب ملتا ہے جو ۱۳۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد شیفتہ کا انتخاب ہے جو ۱۰۱ اشعار کا ہے۔

ناسخ کے بارے میں سرور کی رائے گو مختصر ہے۔ مگر ناسخ کی طرز خوب اور شعر گوئی کے سلیقے کو وہ نظر انداز نہیں کر سکے۔ اشعار کو بھی دلکش لکھا ہے:

''سلیقۂ شعر گوئی بہ طرز خوب بہ دستش افتادہ، لہٰذا

اغطرش دلکش سامعان ست ۔''[1]

ایک اور تذکرہ جو ناسخ کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا ، ''گلشن ہمیشہ بہار'' ہے ۔ ''گلشن ہمیشہ بہار'' ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ع میں شائع ہوا تھا ، جس کے مؤلف نصراللہ خاں خویشگی ہیں ۔ اوسط درجے کا تذکرہ ہونے کے باوجود ، تذکرہ نگاری کے ارتقا میں اس کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا کسی بھی دوسرے تذکرے کا ۔ ہر چند کہ مؤلف نے ''گلشن بے خار'' سے استفادہ کیا ہے مگر نصراللہ خاں خویشگی کی اپنی تحقیق بھی اس میں موجود ہے ۔ البتہ ناسخ کے بارے میں خویشگی کی رائے شیفتہ سے قریب تر ہے ۔ لکھتے ہیں :

''شاعریست غرّا و کلامش از سقم معرّا ۔ چمنِ طبعش نکہت انگیز و شمیمِ فکرش رنگ ریز ۔ والا مایہ ، عالی پایہ ۔ بلند اندیشہ ، نازک پیشہ . . .''[2]

ناسخ کی زندگی میں ان کے بارے میں دی گئی آرا کے بعد وہ آرا بھی ضروری ہیں جو ان کی وفات کے بعد دی گئیں ۔ ناسخ کی وفات کی بعد جن تذکرہ نگاروں نے ان کے بارے میں (حق میں یا خلاف) آرا دی ہیں ، ان میں اہم نام کریم الدین ، سعادت خاں ناصر ، قطب الدین باطن ، احمد حسن سحر ، قادر بخش صابر اور عبدالغفور نساخ کے ہیں ۔

۱۔ عمدۂ منتخبہ (تذکرۂ سرور) ، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی ، مارچ ۱۹۶۱ع ، ص ۲۸۲ ۔

۲۔ گلشنِ ہمیشہ بہار ، مرتبہ اسلم فرخی ، انجمن ترقی اردو کراچی ، ۱۹۶۷ع ، ص ۲۱۲ ۔

کریم الدین اس لیے بھی اہم ہیں کہ انھوں نے اپنا تذکرہ "طبقات الشعرائے ہند" ناسخ کی وفات کے تھوڑے عرصے بعد ہی مرتب کر لیا تھا ۔ ناسخ کے بارے میں انھوں نے کھل کر دو ٹوک رائے دی ہے اور ان کی وفات کے بعد دی ہے ۔ لکھتے ہیں :

"ناسخ کی استادی اور بلند فکری میں کوئی شک نہیں ۔ ان کے تبحر اور بلند پروازی اور پُر گوئی میں کسی کو کلام نہیں ۔"

کریم الدین کے علاوہ سعادت خان ناصر مؤلف "تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا" کا نام اس لیے اہم ہے کہ وہ طرف دارِ ناسخ نہ تھے ، مگر ناسخ کے بارے میں رائے دیتے ہوئے انھوں نے ڈنڈی نہیں ماری ۔ لکھتے ہیں :

"ناسخِ رسمِ کہن ، مجتہدِ علمِ شعر و سخن ، صاحب رائے سلیم ، یادگارِ صائب و کلیم ، خلاقِ معانی ، شیریں بیان (مفتیِ مسائلِ سخنوران) مرحوم و مغفور شیخ امام بخش ناسخ ۔"[1]

حیرت ہے کہ ایسا تذکرہ نگار جو ان کے موافق بھی نہ تھا ، انھیں رسمِ کہن کا ناسخ اور علمِ شعر و سخن کا مجتہد لکھے اور اردو شاعر کو صائب و کلیم جیسے شعرا کے برابر لا بٹھائے اور رائے بھی اس کی وفات کے بعد دے تو گویا ناسخ کے کمالِ فن سے منحرف ہونا اتنا آسان بھی نہ تھا ۔ اس سے بھی زیادہ کھلی رائے احمد حسن سحر کی ہے ۔ وہ اپنے تذکرے "بہارِ بے خزاں" میں رقم طراز ہیں :

۱۔ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا ، (جلدِ دوم) ، مرتبہ مشفق خواجہ ، مجلس ترقی ادب لاہور ، ص ۱۰۴ ۔

"ناسخ اپنے عہد کے نزاکت پسند شاعروں کے استاد تھے۔ انھوں نے اطرافِ عالم اور عالمیان میں اپنی شاعری کا غلغلہ بلند کیا اور اپنی استادی کا نقارہ بجوا دیا۔ تازہ اور نیا مضمون جتنا ان کے حصے میں آیا، دوسرے شعرا کو خواب میں بھی اس کا پرتو نہیں نصیب ہوا۔"[۱]

قطب الدین باطن ہر چند کہ آتش کے زیادہ قائل ہیں مگر اپنے تذکرے "گلستانِ بے خزاں" میں ناسخ کے بارے میں لکھتے ہوئے فیصلہ کن رائے سے گریز نہیں کر سکے:

"زمینِ فکر سیرابی استعداد وسعت بیاناتِ مضمون سے گل خیز، غنچہ باوصف تنگ دہانیِ زبان ہر برگ سے ثنا خواں و گلریز نوبادہ ہائے مضارع رنگیں اہتزاز نسیم فکر سے نشو و نما پاتے ہیں، جن کے رشک سے گلہائے باغ پژمردہ ہو جاتے ہیں۔۔۔ شاعر ذہنِ رسا کی شاگردی سے شاد ہیں، کسی کے شاگرد نہیں اور سب کے استاد ہیں۔ جس کا اعتقاد راسخ ہے، وہ معتقدِ ناسخ ہے۔ شیخ کا کلام ہے، اعجاز لا کلام ہے۔ صفحۂ کاغذ دراز داستان کا بند ہے جو ارشاد ہے عاشقانہ استادانہ وعظ و پند ہے۔"[۲]

یہ بہت کھلی، صاف اور غیر جانب دارانہ رائے ہے۔ قطب الدین باطن کے علاوہ نواب سید علی حسن نے بھی اپنے تذکرے "بزمِ سخن" میں ناسخ کے بارے میں اچھی رائے درج کی ہے۔ لکھتے ہیں:

۱۔ تذکرۂ بہار بے خزاں (مخطوطہ ندوہ)، بحوالہ "ناسخ" سید شبیہ الحسن ص ۸۳ - ۸۴۔

۲۔ گلستان بے خزاں معروف بہ نغمۂ عندلیب، از قطب الدین باطن، مطبع نامی نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۵ء، ص ۲۴۸۔

"روشے کہ او تراشیدہ و نقشے کہ بر صفحۂ ایجاد کشیدہ بر غایت رسائیِ ذہنِ او دال است ۔ شکے نیست کہ ناسخ بہ طرز خویش شاعر ممتاز بودہ است ۔ مضامین بلند می یابد و الفاظ دلپسند می آرد ۔"[۱]

یہ سب اچھی آرا ہیں ۔ سبھی تذکرہ نگار ناسخ کی نازک خیالی اور بلند پروازی کے مداح اور ان کی ممتاز حیثیت پر تقریباً متفق ہیں ۔ تاہم بہت کچھ ناسخ کے خلاف بھی لکھا گیا ۔ مخالفانہ رائیں زیادہ تر بلکہ تمام تر جانب دارانہ دی گئیں اور یہ جانب داری ان کی اپنی تحریروں سے چھلکی پڑتی ہے ۔ مثال کے طور پر مولوی عبدالغفور نساخ اور قادر بخش صابر کی آرا پیش کی جا سکتی ہیں ۔ قادر بخش صابر کی رائے جانب دارانہ بھی ہے اور کسی حد تک غیر ذمہ دارانہ بھی ۔ مگر عبدالغفور نساخ تو ان سے کہیں آگے بڑھ کر رکیک حملوں پر اتر آتے ہیں ۔ ان کی رائے کا زیادہ حصہ درج کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے کمزور پہلو خود بخود سامنے آ جائیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

"ناسخ تخلص شیخ امام بخش لکھنوی کا ۔ تذکرۂ سراپا سخن سید محسن علی محسن نے ان کو ولد شیخ خدا بخش تاجر لاہوری کر کے لکھا ہے ۔ لیکن یہ تاجر مذکور کے غلام مشہور تھے ۔ چنانچہ خود شیخ ناسخ نے اس اس کے مندفع کرنے کے لیے رباعی مرقومہ ذیل کہی ہے ۔ واللہ اعلم بالصدق و الصواب :

۱۔ تذکرہ رشک چمن ، مسمی بہ بزم سخن ، مطبع نامی مفید علم۔ آگرہ ۱۸۸۱ء، ص ۱۰۰، ۱۱

(۱)

کہتے رہے اعمام عداوت سے غلام
میراثِ پدر میں نے مگر پائی تمام
اس دعویٔ باطل سے ستم گاروں کو
حاصل یہ ہوا ، کر گئے مجھ کو بدنام

(۲)

مشہور ہے گرچہ افترائے اعمام
پر کرتے نہیں غور خواص اور عوام
وارث ہونا دلیلِ فرزندی ہے
میراث نہ پا سکا کبھی کوئی غلام[۱]

اس کے باوجود کہ نساخ ان کے سراسر مخالف تھے، یہ کہے بغیر نہیں رہ سکے کہ ''اشعار ان کے بیشتر مثالیہ اور پُر مضمون ہوتے ہیں'' تاہم وہ ناسخ کے فارسی سے ترجمہ شدہ اشعار اور ان کی شاگردی کے بارے میں رائے دیتے ہوئے لفظوں کا انتخاب بھی بہتر نہیں کر سکے ۔ لکھتے ہیں :

''اکثر اشعارِ شعرائے متقدمین و متاخرینِ فارسی گو کو بہت اچھی طرح سے ترجمہ کیا ہے ۔ مشہور ہے کچھ روزوں محمد عیسیٰ تنہا شاگردِ مصحفی سے اصلاح لے کر منحرف ہوگئے تھے ۔ سوائے غزل اور رباعی کے اور کسی صنفِ سخن میں دخل نہیں رکھتے ۔''[۲]

نساخ کھلے مخالف ہیں مگر اشعار کا انتخاب ۱۲۹ اشعار سے

---

۱ ، ۲ ۔ سخنِ شعرا ، مطبع نامی نولکشور لکھنؤ ، ۱۸۷۴ع ، ص ۴۹۱ ۔

کم درج نہیں کر سکے ۔ دوسرے قابلِ ذکر مخالف مرزا قادر بخش صابر ہیں ۔ اپنی عبارت آرائی کے الجھاوؤں میں الجھاتے ہوئے ناسخ کا ذکر البتہ تفصیل سے کرتے ہیں اور عیوب گنواتے ہوئے محاسن سے انکار بھی نہیں کر سکے ۔ وہ ناسخ کو لکھنؤ کے مشاہیر شعرائے خوش سخن میں سے گردانتے ہیں اور نام آور اور کاملِ فن بھی کہتے ہیں ۔ مگر الزام یہ لگاتے ہیں کہ ناسخ نے آخری عمر میں کم دماغی سے مغلوب ہو کر جرأت کا رنگ اختیار کر لیا تھا اور ایسے اشعار لکھے کہ بعض اشعار بے معنی ہو کر رہ گئے ۔ ان کے اپنے الفاظ میں :

"وحشیِ مضمون ہنوز دامِ خرد میں صید نہیں ہوا کہ اس کے اندیشے کی کمندِ نیم تاب کے کشاد میں صحرائے عدم کی اس سرحد میں پہنچ کر حائل گردن ہو جاتی تھی اور طائر معانی اب تک عقل فعال قفس میں قید نہیں کہ اس کی طبیعت کی رسائی ایک پرواز میں آشیانۂ غیب مطلق سے شکار کر لاتی تھی ۔ معنی پست اس کی طبع کی اوج بخشی سے بلند اور الفاظِ مکروہ اس کی تراکیب کے حیلے سے دل پسند . . ."[۱]

اس کے بعد وہ اپنا دوسرا اعتراض کرتے ہیں :

"اخیر عمر میں غلبۂ خرافت سے جرأت کی وضع کو اختیار اور معاملہ بندی کا قصد کیا اور ایک دیوان "دفترِ پریشان" اسی طرز کے اشعار اور اسی ڈھنگ کے ابیات سے

۱۔ گلستان سخن ، از قادر بخش صابر ، مطبع ثانی نولکشور لکھنؤ ۱۸۸۲ء/ ۱۲۹۹ھ ، ص ۳۳۸ ۔

> مالا مال لکھا:- ہر چند جرأت کی شاعری کا حال جیسا ہے اہلِ بصیرت اور اربابِ بصارت کہ کامل استعداد اور سکۂ سخن کے نقاد ہیں ، خوب جانتے ہیں - لیکن جو کہ ہمیشہ مضامینِ بوس و کنار اس کے منہ چڑھے ہوئے اور مدام اس کی فکر سے ہم کنار تھے - یہ اس ہوس کے دام میں تو گرفتار، یہ تقلید خوب بن نہ آئی اور بعض مقام میں یہ تو ناز و انداز میں محو ہوا اور شاہدِ معنی نے اس کو غافل کر کے بیباکانہ حجلہ گاہِ ابیات سے اپنے گھر کی راہ لی -"[1]

دیکھا جائے تو قادر بخش صابر کے دونوں اعتراضات ہی غلط ہیں - تعصب اور حسد کے سوا ان کی کوئی بنیاد نہیں ہے - ناسخ اور جرأت کے مزاج ہی مختلف نہ تھے ، شاعری کا انداز ، مضامین اور اسلوب بھی مختلف تھا - زمین آسمان کا فرق کہیہ کہ اس بُعد کو بیان کیا جا سکتا ہے ، لہٰذا جرأت کی چھاپ والا اعتراض بے معنی ہو جاتا ہے - رہی اشعار کے مہمل اور بے معنی ہونے کی بات تو یہ اعتراض نہیں الزام ہے - ایسا الزام جو ناسخ کے مخالف ترین شخص نے بھی ان پر عاید نہ کیا تھا - اس اعتراض اور الزام کی شدت اس قدر تھی کہ اس کی گونج بہت دیر تک سنائی دیتی رہی - ردِ عمل کے طور پر جواب لکھے گئے اور پھر جواب الجواب کے طور پر بہت کچھ لکھا گیا - مگر ان جانب دارانہ آرا کی اتنی اہمیت نہ ہو سکی جتنی ناسخ کے حق میں لکھی گئی آرا کی ہوئی - شاید اس لیے کہ شاعر کا سب سے بڑا وکیل اس کا کلام ہوتا ہے - اچھی آرا بری

۱- گلستان سخن ، از قادر بخش صابر بہ اہتمام حافظ محمد غیاث الدین ۱۸۵۵ء/ ۱۲۷۱ھ ، ص ۳۵۳ - ۳۵۴ -

شاعری کو زندہ نہیں رکھ سکتیں تو بری آرا بھی اچھی شاعری کو کم درجے پر نہیں لا سکتیں۔ بہرحال یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا۔ ناسخ کے حق میں ایک جواب سید مرتضیٰ گستاخ نے اپنی کتاب "گستاخی معاف" میں درج کیا ہے کہ:

"قادر بخش صابر نے ناسخ کو بے معنی اور مہمل گو قرار دیا ہے۔ یہ اعتراض تو کبھی کسی نے ان پر نہیں کیا۔ اس دعویٰ بے دلیل کا کیا جواب دیا جائے؛ ہاں یہ ضرور پتہ چل گیا کہ ناسخ کے اشعار آپ کی سمجھ سے باہر ہیں۔"

اسی طرح حکیم نجم الغنی نے اپنی کتاب "بحرالفصاحت" میں اس الزام کو نامناسب قرار دیا ہے۔ قادر بخش صابر کے علاوہ وہ دیگر معترضین کا جواب بھی دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"صاحبِ تذکرۂ گلستانِ سخن نے لکھا ہے کہ ناسخ بے معنی گو ہے اور اس کے اشعار مہمل ہیں، مگر یہ کلام نہایت نامناسب ہے اور اپنے زعم میں ازالۂ ثقالت طعن اور اور تخفیفِ شدتِ اعتراض کے لیے اس مطلب کو گویا پردۂ لطیفہ و کنایہ میں بیان کیا ہے۔"[1]

اس کے بعد نجم الغنی دیگر معترضین کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

"ایک دشمنِ کمال نے اپنے دیوان میں ناسخ کو خود ستا اور بے مرشدا لکھا ہے۔ ارمغانِ گوکل پرشاد میں . . . منشی شیو پرشاد وہبی لکھتا ہے کہ شیخ امام بخش ناسخ نے

۱۔ بحر الفصاحت، نجم الغنی، مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۱۲ء ج ۳ ص ۲۸۔

سرقۂ مضامین سے متقدمین کے فارسی دیوانوں کو خراب کیا ہے ۔ اور امیر اکبر آبادی نے اپنے تذکرے میں شیخ صاحب کے ہر شعر کے مقابل ایک شعر لکھ دیا ہے ۔ میں کہتا ہوں کہ ناسخ کا سا اعتبار کسی کو نصیب نہ ہوا ۔ دشمنوں نے بھی عاجز ہو کر اپنے استادوں کی زبان چھوڑ کر انھی کی پیروی کی اور ناسخ کے دیوانوں کے طفیل زبان دان بن گئے . . . ہاں نااہلدانِ کوچۂ شعر فہمی ان کے اشعار صحیح المعانی کو بے معنی کہہ کر نادانوں کو دھوکہ دیتے ہیں ، کیونکہ ان کے ادراک و فہم سے دور ہیں ۔''[۱]

حکیم نجم الغنی نے اسی حوالے سے تذکرہ نگاروں کو تذکرہ لکھتے وقت نیک نیتی اور انصاف کا مشورہ بھی دیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

''اہلِ تذکرہ کو چاہیے کہ شاعر کا اصلی حال بغیر رعایت و طرف داری کے لکھیں اور عداوت کا اظہار بھی تذکرہ نویسی میں نہ کریں ۔ اول سے آخر تک نیک نیتی اور انصاف پر نظر رکھیں ۔''[۲]

ناسخ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے حکیم نجم الغنی کی رائے دیکھیں تو وہ واقعی غیر جانب دارانہ اور انصاف پر مبنی ہے :

''ناسخ کا کلام عموماً شاعری کے ظاہری عیبوں اور لفظی سقموں سے بہت پاک ہے ۔ اصول کبھی ہاتھ سے نہیں جانے

---

۱ ، ۲ ۔ بحرالفصاحت ، نجم الغنی ، مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۱۷ء ، ص ۴۸ ۔

دیا ۔ صائب کی تشبیہہ و تمثیل کو اپنی صنعت میں ترکیب دے کر ایسی خوبی سے نہاں کیا کہ بعض موقع پر کلام میں بیدل اور ناصر علی کا رنگ آ گیا اور اردو میں وہ اس سے صاحبِ طرز قرار پائے ۔ انہیں ناسخ کہنا بجا ہے کیونکہ ناہموار طرزِ قدیم کو نسخ کیا ہے ۔ ان کی طرف سرقہ مضامین کی نسبت کرنا اپنی نادانی دکھانا ہے ۔ ایسا صاحبِ کمال جس کی تصنیفات کمال نازک خیالی اور مضامین عالی کے ساتھ کئی دیوانوں میں موجود ہیں ، وہ سرقہ کا قصد کرتا ؟ اور تواردِ مضامین سے کوئی بشر خالی نہیں ۔ پس ان جزوی باتوں پر توجہ بے حاصل ہے ۔"[۱]

حکیم نجم الغنی کی بہت بعد میں دی گئی ان آرا کی روشنی میں بہت سی باتوں کا جواب مل جاتا ہے ۔ مثلاً ان پر سرقے کا الزام نادانی ہے ، اور ان کے اشعار کو بے معنی کہنا اپنی کم علمی ۔ حکیم صاحب کے بقول بھی وہ طرز قدیم کے ناسخ ہیں ۔ اس کے علاوہ یہ کہ ''ناسخ جیسا اعتبار کسی کو نصیب نہ ہوا'' ، بہت درست اور جامع تبصرہ ہے ۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ، ناسخ کے بارے میں اگر آرا ہی جمع کرنا شروع کر دیں تو بہت مواد اکٹھا ہو سکتا ہے ۔ ان میں نکتہ چیں بھی ملیں گے ، معترف و مداح بھی ۔

جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر اس کا جواب بھی لکھا گیا ۔ اور پھر اس جواب کا جواب ۔ حتیٰ کہ یہ عمل اور ردِ عمل کچھ اس قدر بڑھتا چلا گیا کہ لب و لہجہ تک تہذیب سے گرنے لگا ۔

۱۔ بحر الفصاحت ، نجم الغنی ، مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۱۷ء ، ص ۳۸ ۔

اس سلسلے کی چند چیزوں میں منیر شکوہ آبادی کی "سنانِ دل خراش"، سید مرتضیٰ گستاخ کی "گستاخی معاف"، سید محمد تقی کی "مسکت شائستہ" اور مولوی آغا علی کی "جوابِ اعتراضات" کے علاوہ کتابوں اور رسائل کی صورت میں بہت کچھ مل جائے گا۔

مباحث کا یہ سلسلہ ۱۸۷۷ء سے ۱۸۸۵ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اور انجام اس کا بھی وہی ہوا جو بالآخر ہوا کرتا ہے کہ لوگ صداقت اور سچ کی کھوج میں نکلیں تو آسے پا ہی لیتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ناسخ کی اہمیت آج بھی موجود ہے جبکہ اعتراض کرنے والے معدوم ہو چکے ہیں۔

یونس جاوید
حرفِ آخر
۲۳۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء
مجلس ترقی ادب، لاہور

• • •

کتابیات

آبِ حیات : مولانا محمد حسین آزاد، وکٹوریہ پریس لاہور، ۱۸۸۳ع -

تاریخِ اودھ : حکیم نجم الغنی ، مطبع نامی نولکشور لکھنؤ، ۱۹۱۹ع -

ریاض الفصحا : مصحفی ، مرتبہ مولوی عبدالحق ، برق پریس دہلی ، ۱۹۳۴ع -

تذکرۂ سراپا سخن : محسن علی محسن ، مطبع نامی نولکشور لکھنؤ ، ۱۸۹۸ع -

گلِ رعنا : سید عبدالحی ، مطبع معارف اعظم گڑھ ، ۱۳۷۰ھ -

تذکرۂ رشک چمن مسمی بہ بزمِ سخن : نواب سید علی حسن ، مطبع نامی مفید عام آگرہ ، ۱۸۸۱ع -

تذکرۂ گلستانِ بےخزاں معروف بہ نغمۂ عندلیب : قطب الدین باطن ، مطبع نامی نولکشور لکھنؤ ، ۱۸۷۵ع -

جواہرِ سخن : مرتبہ مولوی محمد مبین کیفی ، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد -

اردوئے معلیٰ : غالب ، مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل ، مجلس ترقی ادب لاہور ، ۶۹-۱۹۶۹ع -

خوش معرکۂ زیبا : سعادت خان ناصر ، مرتبہ مشفق خواجہ ، مجلس ترقی ادب لاہور ، ۱۹۷۲ع -

مثنوی ناسخ : ناسخ ، مرتبہ حبیب اللہ خان غضنفر ، کتابستان الہ آباد ، ۱۹۳۱ع -

تذکرۂ گلشن بے خار : شیفتہ ، مطبع نامی نولکشور لکھنؤ ، ۱۸۷۴ع -

گلستانِ سخن : قادر بخش صابر ، بہ اہتمام حافظ محمد غیاث الدین لکھنؤ ، ۱۸۵۵ع / ۱۲۷۱ھ -

گلستانِ سخن : قادر بخش صابر ، مطبع نامی نولکشور لکھنؤ ، ۱۸۸۲ع / ۱۲۹۹ھ -

بحرالفصاحت : حکیم نجم الغنی ، مطبع نولکشور لکھنؤ ، ۱۹۱۷ع / ۱۳۳۵ھ -

گلشنِ ہمیشہ بہار : نصراللہ خان خویشگی ، مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی ، انجمن ترقی اردو کراچی ، ۱۹۶۷ع -

عمدۂ منتخبہ (تذکرۂ سرور) : نواب میر محمد خان سرور ، مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی ، ۱۹۶۱ع -

سخنِ شعرا : عبدالغفور نساخ ، مطبع نامی نولکشور لکھنؤ ، ۱۸۷۴ع -

بہارِ بے خزاں : احمد حسن سحر ، مخطوطہ ۔

ناسخ : سید شبیہ الحسن ، ساہتیہ اکادمی دہلی ، ۱۹۸۴ع -

مجموعۂ نثر غالب : غالب ، مرتّبہ خلیل الرحمان داودی ، مجلس ترقی ادب لاہور ، ۱۹۶۷ع -

کلیاتِ ناسخ : ناسخ ، مطبع محمدی لکھنؤ ، ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ع -

کلیاتِ ناسخ : ناسخ ، مطبع سلطانی لکھنؤ ، ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ع -

کلیاتِ ناسخ : ناسخ ، مطبع نولکشور کانپور ، ۸۹-۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۲ع -

• • •

۱

بلبل ہوں بوستانِ جنابِ امیرؓ کا
روح القدس ہے نام مرے ہمصفیر کا

بیعت خدا سے مجھ کو ہے بے واسطہ نصیب
دستِ خدا ہے نام مرے دستگیر کا

تن پروروں کی تیغِ زباں سے نہ تھی پناہ
گو درعہ تھا دراعہ نقوشِ حصیر کا

ایثار دیکھنا کہ عیاں اہل اتی میں ہے
مسکیں کے بعد ذکر یتیم و یسیر کا

کیوں جو فروش کرتے تھے گندم نمائیاں
خود ذوق تھا جناب کو نانِ شعیر کا

انگشتر اپنی دے کے سلیماںؑ کر دیا
طاعت میں بھی سوال سنا گر فقیر کا

گر سلسلہ ہے گیسوے مشکینِ مصطفیٰؐ
بے سایہ سرو شجرہ ہوا میرے پیر کا

جس کو کیا نشانہ ، ہوا دم میں بے نشاں
ہر پر ہے شہپرِ ملک الموت تیر کا

پوچھا جو حال تختِ سلیماں سے ایک نے
بولا کہ زینہ ہے یہ علیؓ کے سریر کا

بخشش کی ہے امید علیِ کبیر سے
ہوتا ہوں مرتکب جو گناہِ کبیر کا

جب تک نہ آبِ پاکِ دہانِ نبیؐ پیا
اُس شیر کے نہ دل میں خیال آیا شیر کا

اہلِ نفاق کفرِ خفی کرتے ہیں[1] نہاں
تھا علم بابِ علم کو ما فی الضمیر کا

کیونکر قسیمِ نار و جناں ہو نہ مرتضٰیؑ
نائب ہے وہ جنابِ بشیر و نذیر کا

جو کچھ کہ دل میں ہے وہی[2] جاری زبان پر
ہے نشّہ مجھ کو بادۂ خمِّ غدیر کا

حکمِ خدا سے حق ہے اُدھر ہے جدھر علیؑ
کیا غم سقیفہ بندیٔ جمِّ غفیر کا

یارب! حصارِ امن میں رکھیو مجھے مدام
مدّاح ہوں ازل سے شہِ قلعہ گیر کا

ناسخ کا ادّعا ہے یہی، روزِ بازپُرس
میں ہوں غلام شاہِ رُسل کے وزیر کا

۱- نسخۂ مطبع مصطفائی طبع دوم (۱۲۶۷ھ) - نسخۂ مطبع محمدی طبع ۱۲۵۸ھ:
''اہلِ نفاق کفر خفی کرتے گیا نہاں؟''

۲- نسخۂ مطبع مصطفائی طبع دوم - نسخۂ مطبع محمدی طبع ۱۲۵۸ھ:
''جو کچھ کہ دل میں ہے وہ ہے جاری زبان پر''

۲

دکھا اس کو ، جہاں میں غل ہے جس کی آمد آمد کا
الٰہی ہوں بہت مشتاق دیدارِ محمدؐ کا
بہارِ گلشنِ دینِ محمدؐ اب دکھا یارب!
ترصّد بلبلِ دل کو ہے فصلِ گل کی آمد کا
گھسے مثلِ قلم پائے طلب ، لیکن نہ ہاتھ آیا
بسانِ سایۂ احمدؐ نشاں تصویرِ احمدؐ کا
شجاعت میں ، کرم میں ، عدل میں ، صورت میں ، سیرت میں
امامِ آخری ہے مثل اپنے جدِّ امجد کا
عبور اللہ نے اس کو دیا ہے علمِ باطن پر
لیا ہرچند ظاہر میں نہ درس اک حرفِ ابجد کا
نفاق اس سے نہاں کیا ہو ، چھپے شرکِ خفی کیونکر
محک ہے اس کا سنگِ آستانہ نیک اور بد کا
کرے گا جب کہ وہ اتمام آ کر حجّتِ حق کو
زمانے میں رہے گا نام ملحد کا ، نہ مرتد کا
مسیحا بہرِ بیعت آئے گا چرخِ چہارم سے
نہیں موسیٰؑ سے کم رتبہ ، ترے جلوے کے بیخود کا
جو نزدیک اس سلیمانِ زماں کا دور آئے گا
بیابانوں میں ہوگا ایک مسکن دام اور دد کا
خدا تیرا معرّف ہے ، ملک تیرے موصّف ہیں
نہیں حدِّ بشر کہنا ترے اوصافِ بے حد کا
بنا اے مہرِ تاباں قصرِ یاقوت اپنے جلوے سے
سیہ خانہ نظر آتا ہے یہ گنبد زبرجد کا

نہ سوئے جاہِ دنیا منہ کیا اے شاہِ دیں تو نے
سریرِ سلطنت تکیہ ہے گویا تیری مسند کا
گرائے رکنِ دیں یاجوج و ماجوج آ کے دنیا میں
جو پشتیبان تو ہوتا نہ ذوالقرنین کی سد کا
نمازوں میں مسیحا[۲] سا پیمبر مقتدی ہوگا
وہی رتبہ ہے تیرا بھی جو رتبہ تھا ترے جد کا
بھرا تجھ میں یہ حق نے علمِ رطب و یابسِ عالم
کہ جلد و جسم کو رتبہ ہے قرآنِ مجلد کا
جو کندے ناتراشیدہ ہیں ان کو فیضِ صحبت کیا
سوا اس کے کہ پایا مرتبہ چوبِ مسند کا
معانی قل ھو اللہ احد کے ہیں عیاں ناسخ
برائے قافیہ رکھا ہے میں نے میم احمد[۳] کا

۳

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا
ازل سے دشمنی طاؤس و مار آپس میں رکھتے ہیں
دلِ پر داغ کو کیونکر ہے عشق اس زلفِ پیچاں کا
کسی خورشید رو کو جذبِ دل نے آج کھینچا ہے
کہ نورِ صبحِ صادق ہے غبار اپنے بیاباں کا
شگفتہ مثلِ گل، ہر فصلِ گل میں داغ ہوتے ہیں
بنا ہے کیا ہمارا کالبد خاکِ گلستاں کا
شفق سمجھا ہے اس کو ایک عالم وائے بیدردی
فلک کو گر بگولا جا لگا خاکِ شہیداں کا

سیہ خانہ مرا روشن ہوا ویران ہونے سے
کیا دیوار کے رخنوں نے یاں عالم چراغاں کا

وہ شوخِ فتنہ انگیز اپنی خاطر میں سمایا ہے
کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جس کے داماں کا

چمکنا برق کا لازم پڑا ہے ابرِ باراں میں
تصوّر چاہیے رونے میں اس کے روئے خنداں کا

کفن کی جب سفیدی دیکھتا ہوں کنجِ مرقد میں
تو عالم یاد آتا ہے شبِ مہتابِ ہجراں کا

نہیں آتا نظر، مرہم لگائے کس جگہ کوئی
دہانِ یار گویا منہ ہے میرے زخمِ پنہاں کا

دیا میرے جنازے کو جو کاندھا اس پری رو نے
گماں ہے تختۂ تابوت پر تختِ سلیماں کا

مرا ویرانہ مثلِ آئینہ معمورِ حیرت ہے
یقیں ہر رخنۂ دیوار پر ہے چشمِ حیراں کا

جنوں میں ہجر کی شب، ہاتھ دوڑایا ہے جب اپنا
کیا ہے چاک تا جیبِ سحر اپنے گریباں کا

جو سرخی آتی ہے عکسِ شفق سے بھی مرے منہ پر
حسد سے رنگ ہوتا ہے مبدّل چرخِ گرداں کا

صریرِ کلک کو اب شیر کا نعرہ سمجھتے ہیں
یقیں اعدا کو ہے میرے قلمداں پر نیستاں کا

کسی سے دل نہ اس وحشت سرا میں میں نے اٹکایا
نہ الجھا خار سے دامن کبھی، میرے بیاباں کا

تہِ شمشیرِ قاتل کس قدر بشاش تھا **ناسخ**
کہ عالم ہر دہانِ زخم پر ہے روئے خنداں کا

۴

جس جگہ ہے حُسن فوراً قدرداں پیدا ہوا
چاہ میں یوسف گرا تو کارواں پیدا ہوا

سخت دل جو ہیں اُنھیں محروم رکھتا ہے فلک
بیضۂ فولاد سے بچہ کہاں پیدا ہوا

جب نہ تھا تجھ پر یہ عالم تھی یہی تو بھی حیا
باغ کی خلقت سے اول باغباں پیدا ہوا

خانۂ دل میں چراغِ شام آیا صبح دم
عالمِ پیری میں عشقِ نوجواں پیدا ہوا

شیر سے تا شربتِ مرگ ایک سی تلخی ہے یاں
غم لگا کھانے وہیں ، انساں جہاں پیدا ہوا

ہوں وہ دریا جس میں ہے اک عرشِ اعظم ہر حباب
ہل گئی اک لہر جس دم ، اک جہاں پیدا ہوا

یہ دہن ہے تنگ اُس کا جو تولد ہوتے ہی
سب لگے کہنے یہ لڑکا بے دہاں پیدا ہوا

رشک سے میرے سخن پر خلق ہوتی ہے ہلاک
حیف دنیا میں نہ کیوں میں بے زباں پیدا ہوا

وصل کی شب غل مؤذن نے مچایا قبلِ صبح
کیا خُروسِ بے محل بھرِ اذاں پیدا ہوا

وادیٔ ہستی میں آتے ہی عدم کی راہ لی
ساتھ اپنے توسنِ عمرِ رواں پیدا ہوا

بے گنہ کرتا ہے اے ناسخ ہزاروں کے وہ خوں
دوسرا دنیا میں اب چنگیز خاں پیدا ہوا

۵

گل فشاں عکس ہوا کس کے رخِ رنگیں کا !
جو آئینے میں عالم سبدِ گل چیں کا

خاک ہو جائیں گے ہم شوق ہو کیا تزئیں کا
سرمہ[1] خاکِ لحد دیدہ ہے آخر بیں کا

مانگی باراں کی جو ہم بادہ پرستوں نے دعا کا
رعد نے سنتے ہی اک نعرہ کیا آمیں کا

فرقتِ یار میں کیا ہوش اڑے جاتے ہیں
شہپرِ خواب ہے جو پر ہے مری بالیں کا

آج ہوتا ہے دلا ! درد جو میٹھا میٹھا
دھیان آیا ہے تجھے کس کے لبِ شیریں کا

بیٹھ جائے جو گل اندام ہمارا اک دن
عطر کھینچیں ابھی عطار گلِ قالیں کا

چاند کی طرح ہے خرمن میں وہ دہقاں زادہ
کیوں نہ ہر خوشے میں ہو نور عیاں پرویں کا

دیکھ کر طاقِ حرم کو جو چڑھاتا ہے بھویں[2]
عشق ہے مجھ کو دلا اس صنمِ بے دیں کا

اشتیاقِ گلِ خورشید شبِ ہجر میں ہے
کیا فلک مجھ کو دکھاتا ہے چمن نسریں کا

قبر پر بہرِ خدا نام بتوں کے لینا
دوستو ! وقت اگر آئے مری ”تلقیں“ کا

۱۔ نسخۂ مطبع مصطفائی طبع دوم ۔ نسخۂ مطبع محمدی ص ۲۵۸ ؛
”سرمہ ہے خاک لحد دیدۂ آخربیں کا“

۲۔ نسخۂ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع محمدی : ”بھوں“ ۔

۸

بت پرستی ہے مری اور خدا شاہد ہے
زاہدا! کفر ہے بس عشقِ بتِ سنگیں کا

شعرِ تر ہے[1] جو مرا اک گلِ تر ہے ناسخ
نہیں قرطاس، یہ دامن ہے کسی گل چیں کا

۶

منہدی[2] سے ہے شعلہ قدم اس رشکِ پری کا
پاپوش نے سیکھا ہے چلن کبکِ دری کا

طرفہ چمنِ حسن میں ہے نخل ترا قد
کرتہ ہے جو اے سروِ رواں مولسری کا

کس مرتبہ مجھ کو غمِ فرقت نے سکھایا
اشکوں میں نہیں مثلِ گہر نام تری کا

پاکانِ ازل کو نہیں پروائے مربی
عیسیٰ کو ضرر کچھ نہ ہوا بےپدری کا

ہو کیسی[3] نسیمِ سحری لائی چمن میں
ہر گل میں ہوا رنگ چراغِ سحری کا

نکلے جو ہوادار پہ وہ برقِ تجلی
کیونکر نہ ہو عالم کو گماں تختِ پری کا

ہر غنچۂ گل فرقتِ جاناں میں ہے پیکاں
ہر شاخ میں عالم نظر آتا ہے سری کا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی: "شعر تر جو ہے مرا" ۔
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی: "مہدی" ۔
۳۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ ہدی: "ہو کیسی کی" ۔

پُر رعب زمیں کوچۂ قاتل کی ہے ایسی
ٹھہرے نہ جہاں نقشِ قدم رہ گزری کا
ہے گلشنِ خوبی وہ پری رو یہ[۱] سلیماں
خاتم میں نہ کیوں لگ ہو عقیقِ شجری کا
دیوان میں سادی ہی جگہ چھوڑ دی میں نے
مضمون یہ باندھا تری نازک کمری کا
پیری میں کسے زیست کی امید ہے **ناسخ**
ناداں کوئی جھونکا ہے نسیمِ سحری کا

۷

زلف سے کیجیو شانے کو نہ زنہار جدا
کاٹ کھاتا ہے جو ہوتا ہے سرِ مار جدا
آنکھ بے لطف ہے، پلکیں ہوں جو اے یار جدا
کس طرح آبلۂ پا سے کروں خار جدا
دل کو مجھ سے کریں گے ابروئے خم دار جدا
عضو کو عضو سے کر دیتی ہے تلوار جدا
لوں جو بوسہ، نہ لبوں سے ہوں لبِ یار جدا
ہے وہ بلبل بھی[۲] جو غنچوں سے ہو منقار جدا
سرِ عشاق یہاں بکتے ہیں، معشوق وہاں
کوئے قاتل ہے جدا، مصر کا بازار جدا
آدمی آدمی ہے اور ہے حیواں، حیواں
تیری رفتار جدا، کبک کی رفتار جدا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجدی: ''یہ سلیماں''۔
۲- مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مجدی: ''ہے وہ بلبل ہی''۔

لاکھوں نے کاٹ کے سر رکھ دیے قاتل کے حضور
انگلیاں ہو گئیں یوسف پہ جو دو چار جدا

تیغ ابرو ہے جو بے قبضہ کرے خوں ریزی
ورنہ مہمل ہے جو قبضے سے ہو تلوار جدا

کیا ہی دلچسپ ہے واللہ[1] بدن اُس بت کا
مثلِ رگ ہوتے نہیں رشتۂ زنّار جدا

ہم بغل ہوتے ہی میں جزوِ بدن ہو جاؤں
نہ تنِ یار سے ہو میرا تنِ زار جدا

نام رکعت ہے کہیں ، لغزشِ مستانہ کہیں
نہیں شغلِ حرم و خانۂ خمار جدا

عیش ہے عاریت اس باغ میں اور رنج مدام
کیا ہوں گلبن سے بھلا گل کی روش خار جدا

سر و ساماں پہ ہے کیا کبر کہ غافل اک دن
جسم سے سر ہے جدا ، سر سے ہے دستار جدا

بوجھ اپنا کبھی ڈالا نہ کسی پر میں نے
ہوئی تعمیر مری سقف سے دیوار جدا

سبزۂ خط سے ہوئے تیرے حواشی روپوش
کرتی ہے حاشیوں کو جدولِ زنگار جدا

تخلیہ چاہیے جس وقت میسّر ہو وصال
قبر میں رکھتے ہی کیونکر نہ ہوں غم خوار جدا

مثلِ ناقوس لبِ جام فغاں کرتے ہیں
منہ سے کرتا ہے جو وہ کافرِ مے خوار جدا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : ''اللہ'' ۔

گل چلے جاتے ہیں تو کہتے ہیں برگِ گلبن
ہم تہی دستوں سے کیونکر نہ ہوں زردار جدا
راست گو کون ہے ایسا کہ زباں میں نہ ہو فرق
شمع کی طرح مرا سر ہو جو سو بار جدا
فصل کیونکر کروں دونوں میں گوارا ناسخ
کہ محمدؐ سے نہیں حیدرِ کرّارؓ جدا

۸

خلق کی تسخیر کو ہر نقشِ پا افسوں ہوا
سایہ دیکھا اُس پری کا جس نے وہ مجنوں ہوا
فرقتِ خالِ سیہ میں مردہ میں محزوں ہوا
موت افیونی کی آئی جب کہ بے افیوں ہوا
اس ادا سے دھوئے ہیں دستِ حنائی آپ نے
ہر حبابِ آبِ جُو اک دیدۂ پُر خوں ہوا
نکلوں گا مثلِ شرر سنگِ صنم سے روزِ حشر
زیرِ دیوارِ حرم گو آج میں مدفوں ہوا
بوسۂ خالِ سیہ دیتے نہیں صاحب اگر
ایک دن سننا کہ بندہ کشتۂ افیوں ہوا
ماہِ تاباں پھن ہؤا ، ہالہ ہؤا مارِ سیاہ
چودھویں شب گر خیالِ کاکلِ شبگوں ہوا
چین کی جا کوئی دنیا میں نہیں جز غمکدہ[1]
کیا ہی دانا ہے کہ ساکن خم میں افلاطوں ہوا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع محمدی : ''غمگدہ'' ۔

توڑے بندوقوں کے تارے چاند جنگی ماہتاب
اے شبِ فرقت ترا آنا مجھے شبخوں ہوا

ہم شہیدوں کی جو خاک اُس کی سواری سے اڑی
ایک دم میں توسنِ بادِ صبا گلگوں ہوا

طوق ہالے کا پڑا اُس کے گلے میں کس لیے
چاند بھی شاید اُسی کے عشق میں مجنوں ہوا

ہے وہ تیغ اس کی نگہ، دیکھے اگر میری غزل
طائرِ بسمل وہیں ہر طائرِ مضموں ہوا

باغ میں تقطیع اُس سروِ رواں کی دیکھ کر
سرو کا مصرعہ مری نظروں میں ناموزوں ہوا

ساتھ زر کے پستیٔ ہمت بھی ہوتی ہے زیاد
ورنہ مائل سوئے اسفل کس لیے قاروں ہوا

اژدھے بھی بارہا آئے دفینوں پر[1] نظر
کیا ہوا گر نیک کے نزدیک بد مدفوں ہوا

مے کدے میں ہے مزے ہر انقلابِ روزگار
جام سے سیدھا ہوا، شیشہ اگر واژوں ہوا

میکشو! روزِ ازل سے میں وہ صاحب ظرف ہوں
جس کے اک[2] پیمانے سے خالی خمِ گردوں ہوا

بیتِ ابرو میں اسیر ایسا ہوا چھوٹا نہ پھر
طائرِ دل بھی ہمارا طائرِ مضموں ہوا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ـ نسخۂ مطبع مجیدی : ”میں نظر“ ـ
۲- مصطفائی طبع اول و دوم ـ نسخۂ مطبع مجیدی : ”یک“ ـ

لڑکھڑاؤں گا عروجِ نشہ میں تو دیکھنا
ایک ٹھوکر میں کئی ٹکڑے خمِ گردوں ہوا

کیونکر اے ناسخ خوارِ عجلِ دشمن ہو نہ خوار
کیسے موسیٰ[۳] کا علیؓ شیرِ خدا ہاروں[۴] ہوا

۹

اپنے ابرو آئنے میں دیکھ کر بسمل ہوا
کھینچ کر تلوار اپنا آپ وہ قاتل ہوا

بھاگ کر کب تجھ سے جاں بر کوئی اے قاتل ہوا
اڑ چلا گر ہوش اپنا طائرِ بسمل ہوا

اب کہاں نالے کہ اس لیلیٰ کا مسکن دل ہوا
تھا جرس جو پیش ازیں وہ ان دنوں محمل ہوا

نامِ نیک اہلِ حکومت کو کہاں حاصل ہوا
خلق میں مشہور اک نوشیرواں عادل ہوا

سر سے پا تک ہر صنوبر ہی فقط کیا دل ہوا
دیکھ کر اس سرو قد کو سرو بھی مائل ہوا

اس ادا سے باڑھ دیکھی آپ نے تلوار کی
طائرِ رنگِ حنا بھی طائرِ بسمل ہوا

دھیان[۱] اس کے بند کرنے کا اگر آتا تجھے
کیوں نہ تیرا رخنۂ در میرا چاکِ دل ہوا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ بھدی :
''دھیان اس کے بند کرنے کا کبھی آتا تجھے''

ہے یہ غم جانکاہ خالِ ابروئے خمدار کا
کعبے میں کاہیدہ ہو کر سنگِ اسود دل[1] ہوا

جو یہاں مغلوب ہے عقبیٰ میں غالب ہے وہی
مرکبِ مقتول ہے اک روز جو قاتل ہوا

دھوئے ہیں دھوبی نے دریا میں جو کپڑے یار کے
آج کوسوں تک معطّر دامنِ ساحل ہوا

دلبری کا جب ہوا اُس سرو قامت کو خیال
عضو عضو اپنا وہیں مثلِ صنوبر دل ہوا

سب کے خالق نے بنائے کاسۂ سر واژگوں
آدمی اس پر بھی پیشِ آدمی سائل ہوا

بجھ گیا میرا چراغِ داغ وصلِ یار میں
نورِ مہ نزدیکیٔ خورشید سے زائل ہوا

جو پری رو بیٹھتا ہے آکے، اٹھ سکتا نہیں
اب تو نقشِ بوریا کا خوب میں عامل ہوا

جذبِ جنسیت بہم رہنے نہیں دیتا فراق
گل بنا جو جسمِ خاکی آج ِگل در ِگل ہوا

ہائے کس قاتل ادا سے کی شروع اس نے نماز
نکلی جب تکبیر اس کے منہ سے، میں بسمل ہوا

کہتے ہیں زاہد مری دیوانگی کو دیکھ کر
بت پرستی کے سبب قہرِ خدا نازل ہوا

جب تصور یار کا باندھا ہم آپ آئے نظر
سامنے آنکھوں کے آئینہ ہمارا دل ہوا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع جعفری : ''تل ہوا''۔

عاشقِ بے ننگ سے ہوتا ہے معشوقوں کو ننگ
پیرہن مجنوں کا پھٹ کر پردۂ محمل ہوا

سامنے میرے رہا گر شام سے لے تا سحر
حسن میں گر مثلِ ماہِ چاردہ کامل ہوا

روحِ ناسخ ہے اسی کی روحِ اقدس پر نثار
بارہا جس کے لیے روح القدس نازل ہوا

۱۰

روئے جاناں کا تصوّر میں جو نظّارا ہوا
دل میں تھا جو داغِ حسرت عرش کا تارا ہوا

وہ مہِ خالہ نشیں گلیوں میں آوارا ہوا
اے منجّم دیکھنا ثابت میں[1] سیّارا ہوا

کس ادا سے تو نے شانہ اپنے بالوں میں کیا
سر بہ سر محبوب کے خطِ مانگ کا آرا ہوا

محفلِ مے میں جو تو[2] آیا برائے مے کشی
تھا جو شیشہ ، جوشِ مے سے ایک فوّارہ ہوا

گرم ہے کیا عکس تیرے روئے آتش ناک کا
آئنے کی پشت کا معدوم سب پارا ہوا

رات غائب ہو گئی ظاہر ہوئے[3] آثارِ صبح
وصل میں خورشید گویا شام کا تارا ہوا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : "بھی" ۔
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : "جو آیا تو" ۔
۳۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : "حاضر ہوئے" ۔

چشمِ بد دور آج آتے ہیں نظر کیا گال صاف
سبزۂ خط کیا غزالِ چشم کا چارا ہوا

ابر کو نسبت بھلا کیا چشمِ دریا بار سے
ایک دم رونے کنارے پر جو ہم ، دھارا ہوا

شب ہوا سے ہل گئی اس کی جو زلفِ عنبریں
دم میں مومِ شمع سارا عنبرِ سارا ہوا

اس قدر ہے تیز ظاہر[1] آتشِ رنگِ حنا
سنگِ پا لگتے ہیں بس تلووں سے انگارا ہوا

قد ترا سرو ، آنکھیں نرگس ، زلف سنبل ، رخ ہے گل
کون ہے اک پشتِ گل میں جو چمن آرا ہوا

جوشِ وحشت تیری آنکھوں پر یہ خوش چشموں کو ہے
مثلِ آہو دشت میں ہر ایک آوارا ہوا

ہو گئی ہے شمع تیرے سامنے خجلت سے آب
شمع داں گویا تری محفل میں فوّارا ہوا

چین سے سویا نہ دنیا میں کبھی جز خوابِ مرگ
بعد مرنے کے جنازہ مجھ کو گہوارا ہوا

زاہدا ! ہم جانتے ہیں عشق بازی ہے گناہ
گھر لٹایا ہے جو وحشت میں وہ کفّارا ہوا

ہو رہا ہے بت پرستی کا یہ دنیا میں عذاب
مجھ کو ہر داغِ جنوں دوزخ کا انگارا ہوا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی : ''کس قدر ہے تیز ظالم'' ۔

پشت پیچھے میرے بد کہنے سے زاہد یہ ملا
پشت پر بارِ گنہ سے[1] جمع پشتارا ہوا
دور پھینکا ساقیا ، لیتے ہی تیرے ہجر میں
ہاتھ میں جامِ بنے گلرنگ انگارا ہوا
ہجرِ ساقی میں نہیں اے میکشو آوازِ رعد
فوجِ غم میں بہرِ خوں ریزی یہ نقارا ہوا
جب نہانے کو ہوا عریاں وہ پتلا نور کا
حوض میں روشن برنگِ شمع فوارا ہوا
دوستو ! جلدی خبر لینا کہیں ناسخ نہ ہو
قتل آج اس کی گلی میں کوئی بیچارا ہوا

۱۱

سبزۂ خط گورے گالوں پر نمایاں ہو گیا
یاسمن زا[2] صاف دیکھو سنبلستاں ہو گیا
آ گیا مجھ کو جو اس زلفِ پریشاں کا خیال
دم میں مجموعہ عناصر کا پریشاں ہو گیا
تنگیٔ محفل کی دولت بھڑ کے بیٹھا مجھ سے یار
رات اہلِ بزم کی کثرت کا احساں ہو گیا
منہ لگاتے ہی نے قلیاں بنی ہے نیشکر
دودِ تنباکو نسیمِ باغِ رضواں ہو گیا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجیدی : ''بار گنہ کا'' ۔
۲- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجیدی : ''یاسمن زار صباحت'' ۔

ہو کے خم تسلیم کرنے ہی کیا مجھ کو شہید
قد ترا ظالم کمانِ تیرِ مژگاں ہو گیا

خود بخود ہوتا ہے پُرزے آتے ہی فصلِ بہار
یاں گریباں اے جنوں گل کا گریباں ہو گیا

اس قدر مضموں ترے دستِ حنائی کے لکھے
جو قلمداں میں قلم تھا ، شاخِ مرجاں ہو گیا

چاند چُھپتا ہے جو دو دن ، ہوتی ہے مشتاق خلق
ہو گئی قدر اس کی جو نظروں سے پنہاں ہو گیا

بعد مردن بھی ہے باقی مجھ سے خوش چشموں کو ضد
سبزۂ تربت چراگاہِ غزلاں ہو گیا

پاؤں بھی اب اے جنوں کر دیجیے کانٹوں کی نذر
سر تو مدت سے نیازِ سنگِ طفلاں ہو گیا

ہو گیا وہ مصر ، ہے جس شہر میں تصویرِ یار
جس کنویں کو اس نے جھانکا چاہِ کنعاں ہو گیا

ہم وہ مجنوں ہیں کہ جو خورشید رو آیا نظر
صبح ساں اپنا دہن[۱] چاکِ گریباں ہو گیا

مشتعل ایسے ہیں اس کے دستِ نازک خود بخود
طائرِ رنگِ حنا بھی مرغِ بریاں ہو گیا

سر اٹھا کر جو چلا اس دشتِ وحشت خیز میں
پار تلووں سے وہیں خارِ مغیلاں ہو گیا

۱۔ نسخۂ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع محمدی : "صبح ساں اپنا وہیں" ۔

شمع[1] کافوری جلاتے تھے ، سو اُن کی گور پر
دیدۂ غول بیاباں سے چراغاں ہو گیا

کوئی دم پیری بھی اپنی ہے بسانِ صبح دم
مثلِ شب عہدِ شباب آنکھوں سے پنہاں ہو گیا

کیوں سلاطینِ زمانہ آ گئے ہیں باؤ پر
تختۂ تابوت جب تختِ سلیماں ہو گیا

ہر سحر سن کر ترے مجنوں کا غل کہتی ہے خلق
چاک کیا صبحِ قیامت کا گریباں ہو گیا؟

سرکشی کرتے ہیں مجھ سے جو کہ ہیں پامالِ خلق
شیرِ قالیں بھی مجھے شیرِ نیستاں ہو گیا

یار کے جاتے ہی بھر آئے مری آنکھوں میں اشک
جوش تاروں کا ہوا ، خورشید پنہاں ہو گیا

رشک جو آتا ہے ناسخ بختِ بلبل پر مجھے
جب کھلا غنچہ ، مرا ٹکڑے گریباں ہو گیا

۱۲

کیا کہیں مرگِ احبا میں جو ہم کو غم ہوا
گر موا دشمن کوئی ، اس کا بھی اک ماتم ہوا

بخل جتنا ہے زیادہ جود اتنا کم ہوا
آج تک پیدا نہ کوئی دوسرا حاتم ہوا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجتبائی : "شمعیں کافوری" ۔

خاکساروں سے ملا کرتے ہیں جھک کر سربلند
آسماں پیشِ زمیں بھر تواضع خم ہوا

ناتوانی سر اٹھانے دیتی ہے سجدے سے کب
شنگِ در تیرا نگینِ[1] حلقۂ خاتم ہوا

زیست بھر سوجھا نہ مجھ کو چارۂ سودائے عشق
بارے کافورِ حنوط اب داغ کو مرہم ہوا

ہو گیا گورِ غریباں میں عیاں حالِ جہاں
کاسۂ سر جو نظر آیا وہ جامِ جم ہوا

اپنے سر کو ٹھوکریں لگتی ہیں اپنی راہ میں
قد ہمارا ناتوانی سے نہایت خم ہوا

سبز آتے ہیں نظر اشجار مسموموں کی طرح
فرقتِ جاناں میں آنا فصلِ گل کا سم ہوا

نام ہے روشن زمانے میں مرا اشعار سے
سر جھکا جب فکر میں زانو پہ، میں حاتم ہوا

پاؤں میں اس پاک دامن کے تصدق سے نجات
جس کی پابوسی کو پیدا پنجۂ مریم ہوا

چھپ چلا منہ، کُھل گئی جب زلفِ جاناں کی گرہ
بڑھ گئی جب[2] رات تو اُس کے عوض دن کم ہوا

تا بہارِ عارضِ گلرنگ تھی، سب شاعری
اب وہ دفتر مثلِ اوراقِ خزاں برہم ہوا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع بھدی : "نگیں میں"۔
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع بھدی : "بڑھ گئی گر رات"۔

نشۂ مے میں نظر آتی ہے سیرِ کشاتین
ساقیا یہ ساغرِ مے رشکِ جامِ جم ہوا
آدمی[1] میں آدمی تم کیوں نہ ہو باہم ملاپ
حرف کو دیکھو تو کیا ہم جنس سے مدغم ہوا
نقد[2] جاں مانگے جو سائل کوئے جاناں کا تو دوں
ان دنوں میں عشق کی دولت بڑا حاتم ہوا
راز ہوشی میں ہؤا ناسخ مجھے ایسا کمال
یار بھی ہرگز نہ میرے عشق سے محرم ہوا

۱۳

کل شبِ فرقت میں اک ماتم کدہ عالم ہوا
چاند بھی ہالے میں شمعِ حلقۂ ماتم ہوا
جوش پر طوفانِ اشک اے دیدۂ پُر نم ہوا
آگے تھا اک ہجر کا غم اب غمِ عالم ہوا
دیکھ کر دورِ خطِ شبِ رنگ ، ایسا غم ہوا
حلقۂ گیسو بھی مجھ کو حلقۂ ماتم ہوا
ہے برنگِ برق ہنسنا آدمیت سے بعید
سال ہا بارانِ غم بھرِ گلِ آدم ہوا
اک پری کے عشق نے مجھ کو سلیماں کر دیا
لختِ دل تنگ ہے تو حلقہ چشم کا خاتم ہوا

۱- یہ شعر مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجیدی میں چھٹے نمبر پر ہے - (مرتب)
۲- یہ شعر مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجیدی میں تیسرے نمبر پر ہے - (مرتب)

مائل ابرو کی طرف مژگانِ برگشتہ نہیں
تیر بھی پیشِ کماں بہرِ تواضع خم ہوا

زندگی چشمِ جہاں میں خوار رکھتی ہے مدام[۱]
دوش پر سب نے لیا جب آدمی بے دم ہوا

مے کشی نے فرقتِ ساقی میں مارا ہے مجھے
شربِ مے، مانندِ اکلِ ناگوارا سم ہوا

آبلے چیچک کے جب نکلے عذارِ یار پر
بلبلوں کو برگِ گل پر شبہۂ شبنم ہوا

حرف سکہ کے ہوں کیسے پر ادب کرتے نہیں
زر سے جو چسپیدہ دل ہے اُس کا رتبہ کم ہوا

فاقے سے اپنے شکم پر سنگ باندھا جس گھڑی
وہ سلیمانِ زماں بھی صاحبِ خاتم ہوا

منتیں کر کر کے احساں کرتے ہیں ہم سے پرست
جام اگر خالی نظر آیا تو شیشہ خم ہوا

سب حسیں اے گل ترے آگے ہوئے خجلت سے آب
ہر ستارہ بھی فلک پر قطرۂ شبنم ہوا

خلق کو مارا عرق آلودہ زلفِ یار نے
اُس کا ہر اک قطرہ کامِ اژدہا میں سم ہوا

ہو گیا ہے جوشِ سودا سے مرا مشہور نام
حلقۂ زنجیر گویا حلقۂ خاتم ہوا

عشق اُس نورِ الٰہی کا ازل سے ہے مجھے
جس سے اے ناسخ ہزاروں سال بعد آدم ہوا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی : "خوار رکھتی ہے ولا"۔

۱۴

کیا اثر میری سیہ بختی کے آگے نور کا
ماہ ہے اک خالِ رخسارہ شبِ دیجور کا

مر گیا ہوں دیکھ کر جلوہ رخِ پُرنور کا
میری لوحِ قبر کو زیبا ہے پتھر طور کا

پاس ہوں یاروں کے جب تک مجھ کو گنتے ہیں بزرگ
خورد آتا ہے نظر انساں کو انسان دور کا

اس پری کے چہرے کو تشبیہ کس سے دیجیے
جس کا ہر نقشِ قدم دکھلائے نقشہ حور کا

ترکِ لذت کر دلا! پہنچے نہ تا مجھ[1] کو گزند
نوش تو پیچھے ہے، پہلے نیش ہے زنبور کا

شب جو دھیان اس ماہ کا آیا دمِ فکرِ سخن
صبح تک مضموں نہ ہاتھ آیا شبِ دیجور کا

مجھ سے اول خالۂ زنداں میں تھا مجنوں تو کیا
ہر محل میں پہلے ہوتا ہے گزر مزدور کا

ہجر میں ساغر سے آئی مجھ کو ساقی بوئے خوں
بادہ کھنچوایا ہے شاید زخم کے انگور کا

دل ہمارا اس قدر سوزش طلب پروانہ ہے
شمع سے بھاگے جو اس میں میل ہو کافور کا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع محمدی: "نہ تا تجھ کو گزند"۔

تیرہ بختی موذیوں پر کرتی ہے نازل بلا
شہد لٹتا ہے شبِ تاریک میں انگور[۱] کا

ہے بجا نزدیک والے مجھ سے گر واقف نہیں
میرے شہرے نے کیا ہے اب ارادہ دور کا

دعویٔ باطل سے ہو جاتے ہیں اکثر ناسور
شہرہ کیا بانگِ انا الحق نے کیا منصور کا

میں ترا عاشق ہوں اے عیسیٰ نفس ہے جائے رشک
گود لیتی ہے بغل میں لاشہ مجھ رنجور کا

اس قدر مشرب میں وسعت رکھتے ہیں ہم مے پرست
اپنے گلشن میں فلک اک خوشہ ہے انگور کا

رشک سے ہر دم جلاتی ہے جو تیری برقِ حسن
ہے گماں ہر سرو قد پر مجھ کو نخلِ طور کا

بارِ غم سے سایۂ گیسو میں ہے دل کو فراغ
شام کر دیتی ہے چھٹکارا ہر اک مزدور کا

خط سے زائل ہو گئی رخسارِ جاناں کی بہار
تھا چمن نازک اٹھا صدمہ نہ پائے مور کا

ہیں جو صاحب درد ان سے دور ہے سامانِ عیش
بادہ کھینچا ہے کسی نے زخم کے انگور کا

میرے سینے پر بتوں کی سرد مہری سے ہے داغ
مشک سے بدتر ہے پھاہا مرہمِ کافور کا

کوئے قاتل میں پہنچ کر سر ہوا مجھ کو وبال
بوجھ اترنے کی جگہ دم چڑھ گیا مزدور کا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع بھدی : "زنبور کا"۔

ہم نے جو چوٹی[1] بنائی ہے ترے موباف کی
نافۂ مشکیں ہوا ہے منہ پر اک ناسور کا
کب ہماری فکر سے ہوتا ہے **سودا** کا جواب
ہاں تتبّع کرتے ہیں **ناسخ** ہم اس مغفور کا

۱۵

روئے جاناں پہ ہوا خطِ معنبر پیدا
ہو گئے حسن کی پرواز کو شہپر پیدا
آتشیں رخ پہ ہوا خطِ معنبر پیدا
بدلے پانی کے ہوا آگ سے عنبر پیدا
سعی سے گوہرِ مقصد نہیں ہوتا حاصل
نہ کبھی آبِ رواں میں ہوئے گوہر پیدا
زلف کو دیجیے کیا مارِ سیہ سے تشبیہ
سایۂ زلف سے ہو جاتے ہیں اژدر پیدا
ایک[2] دل کیسا ہے، سو دل تری قامت پہ نثار
شکلِ دل کیوں نہ ہوں ہر شاخِ صنوبر پیدا
ہوں[3] میں وہ صید کہ ہیں جزو بدن تک دشمن
تیروں کے واسطے ہوتے ہیں مرے پر پیدا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : ’’ہم نے جو پٹی بنائی ہے‘‘ ۔
۲۔ مصطفائی طبع اوّل و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : ’’ایک دل گیا ہیں‘‘ ۔ مذکورہ نسخوں میں یہ شعر موخر ہے ۔ (مرتب)
۳۔ نسخۂ مطبع مجدی اور مصطفائی طبع اول و دوم میں یہ شعر بھی موخر ہے ۔ (مرتب)

آتشِ حسن سے خلقت ہے دلِ عاشق کی
جس طرح آگ سے ہوتے ہیں سمندر پیدا

ہوں[1] وہ گریاں کہ پس از مرگ مری تربت پر
سبزۂ تر کے عوض ہو مژۂ تر پیدا

سایہ میرے تنِ پُر داغ کا پڑ جائے اگر
مثلِ ہیزم ابھی گلبن سے ہوں اخگر پیدا

کیوں نہ آئینہ ہو حیراں کہ سکندر تو کہاں
نہیں ہوتا کہیں اب عکسِ سکندر پیدا

رنگ و داغِ گلِ لالہ سے یہ معلوم ہوا
حسن اور عشق ہوئے دونوں برابر پیدا

خبرِ مرگِ احبا نے کیا مجھ کو ہلاک
کیوں نہ یا رب میں زمانے میں ہوا کمتر پیدا

حرفِ سخت اس نے کہے مجھ کو لبِ رنگیں سے
جائے حیرت ہے ہوئے لعل سے پتھر پیدا

کیا ہی ہے خاک کے پتلوں کی سنہری رنگت
کبھی اکسیر سے ایسا نہ ہوا زر پیدا

دیکھنا ہستیٔ طالع کہ مرے گلشن میں
جائے اشجار ہوا فرشِ مشجّر پیدا

آتشِ رنگِ حنا سے وہ صنم کہتا ہے
ہاتھ میں مچھلیوں کی جا ہو سمندر پیدا

ہے ازل سے وہ مرا قبلۂ ایماں لاسخ
جس کو خالق نے کیا کعبے کے اندر پیدا

۱۔ نسخۂ مطبع مجدی اور نسخۂ مصطفائی طبع اول طبع دوم میں یہ شعر لیتھرا ہے۔ (مرتب)

۱۶

ماہِ نو ہے جو وہ خورشید مقابل ہوگا
یہ یقیں ہے کہ نظر آتے ہی کامل ہوگا

اس پر آفت نہیں منہ سوئے خدا ہے جس کا
طائرِ قبلہ نما کاہے کو بسمل ہوگا

مردمِ چشمِ ملائک ہیں ترے خالِ سیاہ
روئے خورشید پہ ایسا نہ کوئی تل ہوگا

شمس جانیں گے منجم تجھے اور اس کو قمر
آئنہ جب ترے چہرے کے مقابل ہوگا

مار ڈالا ہے جسے جان کے جوں قاتل نے
زلفِ مشکیں میں یقیں ہے وہ مرا دل ہوگا

غافلو نشۂ دولت سے نہ اتنا بہکو
دیکھنا کاسۂ سر، کاسۂ سائل ہوگا

آسماں کو نہ بہت ناز سے دیکھ او ظالم
ابھی بیہوش پر اک عرش کا حامل ہوگا

آتش ہے تجھ کو عبث لالہ رخوں سے ناسخ
داغِ حسرت کے سوا خاک نہ حاصل ہوگا

۱۷

کوئی غارت گر نہیں دیوانوں کے اسباب کا
خانۂ زنجیر کو کچھ غم نہیں سیلاب کا

ساقیا لا جامِ مے، درپیش ہے جنگِ سخن
ہے بجا تیغِ زباں پر آج ہونا آب کا

خلق کی پیشانیوں پر ہے یہی مضموں رقم
سجدہ واجب ہے ترے دروازے کی محراب کا

ہے مری دیوانگی کا باعث اک دریائے حسن
سلسلہ ہو موج کا اور طوق ہو گرداب کا

بن گیا ہر روزنِ دیوار چشمِ انتظار
شوق ہے کیا اپنے گھر کو آمدِ سیلاب کا

جس حسیں کو دیکھتا ہوں میں ابل آتے ہیں اشک
میری آنکھوں میں ہے عالم معدنِ سیماب کا

مے کشی کرتا نہ بربادی تنِ خاکی کی ہو
خاک کو اڑنے نہیں دیتا چھڑکنا آب کا

رہتی ہے ہر روشنی میرے سیہ خانے سے دور
تن رہا ہے شامیانہ چادرِ مہتاب کا

غفلتِ اہلِ جہاں تردامنی کی ہے دلیل
غلبہ ہوتا ہے رطوبت سے مقرر خواب کا

پاک طینت جو کہ ہیں ان سے تعلق دور ہے
خار سے کیا الجھے گوشہ چادرِ مہتاب کا

دیدۂ قاتل دیر تک کی ، گو ہوئی ایذا مجھے
ہوں بہت ممنونِ احساں خنجرِ بے آب کا

ملتی ہے عاشق کو لذت فرقتِ معشوق میں
اختیاری ہجر ہے سرخاب سے سرخاب کا

کیا گدازِ دل میں ہو جاتی ہے حدّت طبع کی
دیکھ لو تیزی میں ہے محتاج آہن آب کا

ہوں وہ گریاں بعد مردن کر ملے میرا غبار
گرد بطروں پر یقیں عالم کو ہو دولاب کا

عارفوں کو ہر در و دیوار ادب آموز ہے
مائلِ گردن کشی ہے انحنا محراب کا

عکس پڑتا ہے جو تیرا آئینوں[1] میں بیشتر
اضطراب اس واسطے جاتا رہا سیماب کا

ہے یہی خورشید کا رتبہ حضورِ روئے یار
سامنے خورشید کے رتبہ جو ہے مہتاب کا

نامۂ شرحِ جدائی یہ نہیں دستار میں
پر رکھے جاتا ہے مرغِ نامہ بر سرخاب کا

پانی پینے میں جو اُس شیریں دہن کا منہ لگے
قند کا کوزہ وہیں بن جائے کوزہ آب کا

ہے تنزل میں ترقی صاف دل کے واسطے
دیکھ لو بنتا ہے موتی خشک قطرہ آب کا

پاؤں جو رکھتا ہے کھاتا ہے سراُس کا ٹھوکریں
یہ حریمِ کوئے جاناں ہے مقام آداب کا

جورِ اعدا پر بھی کر سکتا نہیں ترکِ وطن
دھیان آتا ہے جو ناسخ فرقتِ احباب کا

۱۸

پھر قیامت زا ہوا ہلنا لبِ خاموش کا
پھر نظر آنے لگا موسم جنوں کے جوش کا

پھر مرے سر نے کیا ہے داغِ سودا کو کلاہ
پھر لیا کام آبلوں سے پاؤں نے پاپوش کا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم نسخہ مطبع ہمدی : ''آئینے'' ۔

شوقِ عریانی نے پھر کیں پیرہن کی دھجیاں
پھر اتروایا جنوں نے بوجھ میرے دوش کا

لگ گئی ہے پھر جو ان روزوں میں چپکی سی مجھے
آ گیا ہے دھیان پھر اک کافرِ خاموش کا

نعرہ‌زن جا جا کے گلزاروں میں پھرہوتا ہوں میں
برگ گل پر پھر گماں ہونے لگا ہے گوش کا

پھر پڑا رہتا ہوں میں بے ہوش بدمستوں کی طرح
پھر تصور بندھ گیا مجھ کو کسی مے نوش کا

آئے پھر ایامِ سرما ، پھر ہوا شوقِ وصال
چادرِ تربت سا پھر عالم ہے بالاپوش کا

کوبکو پھر دوڑتا پھرتا ہوں دیوانوں کی طرح
پھر کوئی اندازِ رم سیکھا ہے میرے ہوش کا

آ گئی ہے یاد مجھ کو وصل کی پھر مے کشی
پھر ہوا میرے لہو میں طور مے کے جوش کا

کر گیا ہے پھر کوئی خالی مری آغوش کو
پھر خیال آیا ہے مجھ کو گور کی آغوش کا

اس مسیحا نے کیا پھر قبر پر آنے کا قصد
پھر جنازہ بار ہوگا دوستوں کے دوش کا

پھر خدائی سے ہوئی منظور روپوشی مجھے
پھر ستاتا ہے نہ ملنا اک بتِ روپوش کا

ساحلِ دریا مرے رونے سے پھر آغوش ہے
رونا یاد آیا ہے پھر اک طفلِ ہم آغوش کا

پھر کھلونے کی طرح بے دم ہے میرا کالبد
کھیلنا یاد آیا پھر اک طفلِ بازی کوش کا

پھر ہوا ضبطِ فغاں دشوار اے ناسخ مجھے
پھر قیامت زا ہوا ہلنا لبِ خاموش کا

۱۹

دل سے لوں گا میں کام رہبر کا
کیا پتا چاہیے ترے گھر کا

حال لکھتا ہوں دیدۂ تر کا
موجِ دریا ہے تار مسطر کا

تھا جو یوسف ، ہوا نہ وہ بھی عزیز
کیا برادر کو غم برادر کا

مرغِ دل داغ کھائے گا جو یونہی
شبہ ہوگا گلی کبوتر کا

کرے یادِ خدا جو اک ہفتہ
بادشہ ہو وہ ہفت کشور کا

مست کہتے ہیں جس کو ابرِ بہار
گوشہ ہے میرے دامنِ تر کا

مثلِ مینا ہلوں[1] نہ کیوں جھک کر
آج ہے دور ، دور ساغر کا

کیوں نہ مصرع رہے قدِ موزوں
کہ نہ مصرع ملا برابر کا

جلد میرا پیامبر نہ پھرا
واسطہ گو دیا پیمبر کا

۱۔ مصطفائی طبع اول و طبع دوم ۔ نسخہ مطبع ھدی : "مثلِ مینا ہلوں"۔

مرغِ دل تب ہے آپ کا ہے صید
جب کبوتر اڑاتے تھے پر کا
ہے شب ہجر تا ابد نہیں صبح
نہ رہا خوف روزِ محشر کا
قمری ہے تیرے گھر کے گرد اے سرو
دوسرا طوق حلقہ ہے در کا
ہجر میں چاندنی سے کیا خوش ہوں
طور ہے تربتوں کی چادر کا
رشک منہنال ہر ہے کیا اس کو
رشک بدلا جو تیرے چنبر کا
جب ہوا گور میں عذابِ فشار
دھیان آیا کنارِ مادر کا
یدِ بیضا سے ہاتھ آئی یہ بات
حسن محتاج کب ہے زیور کا
لاغری سے مرے سراپا میں
طور ہے سایۂ پیمبرؐ کا
وصل میں تو سرک گیا جس دم
میرا ہر ایک استخواں سرکا
تن پہ ہر قطرۂ عرق ہے گہر
شوق آئے کیا ہو اور زیور کا
یار کے پنجۂ حنائی میں
نامہ کیا ہو جلے سمندر کا
فصلِ گل میں ہو شوق سے عریاں
وحشیو! حکم ہے پیمبر کا

عمرِ جاوید چھوڑ کر لی موت
دیکھنا حوصلہ سکندر کا

نقشِ پا ہو بجائے نقشِ جبیں
سر ہے مشتاق تیری ٹھوکر کا

وہ سہی قد ہے مجھ سے طالبِ دل
سرو کو شوق ہے صنوبر کا

تیرے گھر کے جو زینے پر چڑھے شیخ
پھر نہ دھیان آئے اس کو منبر کا

کیا ہے ناسخ جوابِ خط کا ذکر
نہ ملا ایک پر کبوتر کا

۲۰

اسی سے رنگ ہے گل کا، اسی سے نشہ ہے مُل کا
وہی نالہ ہے بلبل کا، وہی نغمہ ہے قلقل کا

الٰہی سانپ نکلے مثلِ ضحّاک اس کی گدی سے
زمانے میں نہ جس کو عشق ہو اس بت کی کاکل کا

سنا جب میں نے وہ گھر میں نہیں تو اس قدر رویا
درِ جاناں وفورِ اشک سے در بن گیا پل کا

خراماں تو جہاں ہوتا ہے وہ جا رشکِ گلشن ہے
ہر اک کبکِ دری بلبل ہے تیرے کفش کے گل کا

کبھی کہسار پر جانا، کبھی وادی میں آ رہنا
رہا وحشت میں بھی عالم ترقی و تنزّل کا

فرشتے بھول کر مجھ کو اٹھائیں گے نہ محشر میں
کہ ہوں کشتہ میں او قاتل[1] تیری تیغ تغافل کا

معاذ اللہ اے رشکِ چمن ہے کس قدر سوزش
سمندر بن گیا بلبل ہمارے ہاتھ کے گل کا

نہیں آغازِ خط اُس رشک گل کے روئے رنگیں پر
دلا! یہ برگِ گل پر عکس ہے مژگانِ بلبل کا

کلامِ غیب ہے ناسخ سنا جو بے بہ بے ناسخ
پسند آیا ہے اے ناسخ کلام استادِ[2] کامل کا

۲۱

کافی بس اس کو نشہ ہے بوئے شراب کا
ہو بوجھ جس کے ہاتھ میں ساغر حباب کا

ہر ہر قدم پہ پھوٹتے جاتے ہیں آبلے
نقشِ قدم میں طور ہے چشمِ پُر آب کا

کہتے ہیں تیرے عارض و قامت کو دیکھ کر
بالائے سرو پھول کھلا ہے گلاب کا

دیکھی جو اُس کی زلف ہوا محو داغِ دل
ہوتا ہے وقتِ شام غروب آفتاب کا

ہر صبح وہی صبح ہے، ہر شام وہی شام
انسان پر ہے زور فقط انقلاب کا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی: ''کہ ہوں گشتہ میں اے غافل'' ۔

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی: ''استاد آمل کا'' ۔

آتا ہے رشک اے دلِ پُر آبلہ مجھے
کیا جلد پھوٹتا ہے پھپھولا حباب کا

مشکل بغیرِ ساقیِ مہوش ہے دورِ مے
محتاج آفتاب ہوا ماہتاب کا

آتی ہے خشک و تر سے مجھے بوئے زلفِ یار
ہے مشک کی زمین تو دریا گلاب کا

اس کی نگاہِ گرم جو پڑتی ہے غیر پر
ابلیس اب نشانہ ہے تیرِ شہاب کا

پیری بغیر ہم نے نہ دیکھا طلوعِ صبح
گذرا شبِ فراق میں موسم شباب کا

آتا نہیں ہے دن کو بجز شب وہ ان دنوں
بدلا ہے شپّرہ سے مزاج آفتاب کا

تیری بہار نے یہ اڑائے گلوں کے رنگ
دن رات جوش باغ میں ہے ماہتاب کا

مارا ہے چشمِ مست نے میرے سوم میں ہوں
نرگس کے پھول اور پیالہ شراب کا

محشر میں ہم کو نامۂ اعمال دیکھ کر
قاصد خیال آئے گا خط کے جواب کا

ارض و سما کے طبقے ہیں بازیٔ گنجفہ
چوتھا فلک ہے ایک ورق آفتاب کا

سیرِ تری میں کی جو سکندر کی ہم نے دید
تھا سر پہ نقش آب کے افسر حباب کا

اپنی غزل پہ آپ میں لکھتا ہوں اب غزل
دیکھو جواب ہے سخنِ لاجواب کا

۲۲

لبریز اُس کے ہاتھ میں ساغر شراب کا
بنتا ہے عکسِ رخ سے کٹورا گلاب کا

وہ مستِ ناز اگر کرے نظارہ آب کا
لبریز ہو شراب سے شیشہ حباب کا

دیکھا جو دوپہر کو جلال آفتاب کا
آیا وہیں خیال کسی کے نقاب کا

رکھتا ہے چرخ اوج کسی کا کب ایک دن
ہوتا ہے دوپہر میں زوال آفتاب کا

امید موت آنے کی تو کس کو ہے دلا!
آنا شبِ فراق میں مشکل ہے خواب کا

گر ہیں رواق چشم میں خالی[1] تو کیا عجب
برسوں گذر ہوا نہیں فرقت میں خواب کا

ہم زائرانِ ساقیٔ کوثر ہیں واعظا!
کشتی ایاغ کی ہو تو دریا شراب کا

اے میکشو! یقین ہے نکلے بطِ شراب
وہ مستِ ناز توڑے جو بیضہ حباب کا

راحت طلب کروں تو ملے آسماں سے رنج
حاضر ہو موت ابھی جو خیال آئے خواب کا

جو ہے حسین اُس کو ہے نفرت جہان سے
ہوتا نہیں ادھر کبھی منہ آفتاب کا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع ہدی: ''جالے تو کیا عجب''۔

شعلہ اگر نہیں وہ صنم سر سے پاؤں تک
موئے کمر میں کیا ہے سبب پیچ و تاب کا

گھل گھل کے مر گیا ہوں میں دریائے عشق میں
کافی ہے میرے دفن کو گنبد حباب کا

جو ہر ہیں برگِ گل ترے چہرے کے عکس سے
بن جائے کیوں نہ آئنہ تختہ گلاب کا

رونے سے ایک دل ہو جو زندہ عجب نہیں
عالم کی زندگی ہے برسنا سحاب کا

صبحِ فراق میں ہوئی قدرِ شبِ وصال
آیا ہے یاد پیری میں عالم شباب کا

گرتے ہیں دانت ، جھڑتے ہیں بادِ خزاں سے گل
فصلِ بہارِ عمر ہے موسم شباب کا

آرائشِ جمالِ خدا داد عیب ہے
موئے کمر کو ذوق نہیں ہے خضاب کا

پیری میں شعلہ رویوں سے خالی کنار ہے
کیوں کر گذر کہاں میں ہو تیرِ شہاب کا

کس شعلہ رو کو باغ میں ہے قصد مے کشی
ہر شاخِ گل میں رنگ ہے سیخِ کباب کا

ناسخ شراب پی شبِ تاریک ہے تو کیا
محتاج آفتاب نہیں ماہتاب کا

۲۳

گھل گیا ہے پیرہن میں جسم مجھ مایوس کا
ایک عالم کو گماں ہے شمع اور فانوس کا

جو کہ ہیں بیدرد کیا اُن کو ہے قدرِ داغِ عشق
مرتبہ زخمی سمجھتے ہیں پرِ طاؤس کا

آ نے پائے بزمِ جاناں میں تو یہ بالیدہ ہو
پیرہن ہو تنگ جسمِ شمع پر فانوس کا

گل نہیں جز داغِ حسرت بوستانِ دہر میں
طور ہر برگِ شجر میں ہے کفِ افسوس کا

ہجر میں نالے ہیں ہونٹوں پر ، گریباں ہاتھ میں
وصل میں کام ان سے لیتے تھے کنار و بوس کا

کافرِ عشقِ بتاں ایسا ہوں گر ہو جاؤں قتل
شور حلقومِ بریدہ سے اٹھے ناقوس کا

کھولتے ہیں غنچے میرے سامنے بقچے عبث
سونگھنے والا ہوں میں اے گل ترے ملبوس کا

ہوں میں وہ وحشی کہ مثلِ حلقۂ زنجیرِ پا
شوق ہے چشمِ غزالاں کو مرے پابوس کا

جو کہ ادنٰی ہیں خوشامد سے وہ اعلٰی ہوتے ہیں
مورچھل افسر پہ ہوتا ہے دُمِ طاؤس کا

زینتِ ظاہر کے جو پابند ہیں بے فیض ہیں
کس کو دنیا میں ملا سونا دُمِ طاؤس کا

اہلِ زینت کو نہیں اعلٰی و ادنٰی[1] میں تمیز
ہے سرِ طاؤس پر سایہ دُمِ طاؤس کا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع مہدی :
"اہلِ زینت کو نہیں اعلٰی و اسفل میں تمیز"

خاک جو میرے تن پر داغ کی برباد کی[1]
گردبادوں پر گماں عالم کو ہے طاؤس کا

ہے دہن ہر غنچہ اور آغوش ہے ہر شاخِ گل
شوق گلبن کو ہے کیا تیرے کنار و بوس کا

مدتیں گذریں کہ قدموں سے جدا ہوتے نہیں
کس قدر ہے شوق کانٹوں کو مری پابوس کا

سچ تو ہے فردوسیؔ طوسی کو نسبت مجھ سے کیا
دل سے ہوں مداح ناسخ بادشاہِ طوس کا

۲۲

پریوں کو عمل سے میں تسخیر نہیں کرتا
جز نقشِ درم کچھ بھی تاثیر نہیں کرتا

اے وعدہ خلاف ایسی ہے منتظری تیری
دروازوں کو میں ہر شب زنجیر نہیں کرتا

کیونکر مرے رونے سے دل نرم ہو اس بت کا
پتھر میں کبھی پانی تاثیر نہیں کرتا

جاں باز تو لاکھوں ہی سر دینے کو حاضر ہیں
آلودہ وہی خوں سے شمشیر نہیں کرتا

یہ خلق کی بیتابی[2] آتی ہے پسند اس کو
سیماب کو بھی کافر اکسیر نہیں کرتا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخہ مطبع مجدی : "ہے" ۔
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخہ مطبع مجدی : "آئی" ۔

کب کاٹ کے سر میرا فتراک سے باندھے گا
کہتے ہیں وہ عاشق کی توقیر نہیں کرتا
کیوں فکرِ عمارت ہے دنیا میں تجھے ناسخ
ویرانے میں گھر کوئی تعمیر نہیں کرتا

۲۵

دل میں ساکن ہے خیال اک بتِ بے پروا کا
آشیانہ مرے ویرانے میں ہے عنقا کا
جب مری نبض لگا دیکھنے، ظاہر یہ ہوا
نور ہے دستِ مسیحا میں کفِ موسیٰ کا
کس کے گیسو کے تصور میں ہے طوفانِ سرشک
حلقۂ زلف ہے گرداب مرے دریا کا
شجرِ طور ہے قد اور ہے رخ شعلۂ طور
دستِ دل دار میں عالم ہے یدِ بیضا کا
کیوں ملیں عالمِ بالا سے نہ مضمونِ بلند
ہے دمِ فکر خیال اس کے قدِ بالا کا
ہو گیا سیلیِ استاد سے تغیر جو رنگ
چہرۂ یار میں عالم ہے گلِ رعنا کا
تو وہ خورشید ہے، اٹھے جو گلستاں میں نقاب
چہرۂ گل میں تلوّن ہو وہیں حربا کا
کیا جنوں کم ہو مرا سنگِ ملامت سے بھلا
جو پڑا نیل وہ اک داغ ہوا سودا کا
باغباں اپنے گل و میوہ سے رکھ خاطر جمع
میں تو مشتاق چمن میں ہوں چمن آرا کا

بعدِ مردن بھی جو ہے نرگسِ میگوں کا خیال
گنبدِ قبر میں ہے جوشِ خمِ صہبا کا

عشق سنئے یہ ہے کہ دم میرا خفا ہوتا ہے
گھونٹتا ہے جو کوئی مست گلا مینا کا

یادِ مژگاں میں جو یوں جوش پہ ہے سیلِ سرشک
تشنہ لب کیا کوئی کانٹا ہے کسی صحرا کا

دیکھتے ہی ترے ہاتھوں کو ہوا دیوانہ
یدِ بیضا سے ہوا ہے یہ خلل سودا کا

جاتے ہیں عالمِ بالا کو جو نالے سیدھے
ہے خیال آج مجھے ایک سہی بالا کا

دین و دنیا کی عبث فکر ہے تجھ کو ناسخ
وہی ہوگا جو ارادہ ہے مرے مولا کا

۲۶

رہے کیونکر نہ دل ہر دم نشانہ ناوکِ غم کا
کہ ہے میرا تولّد ہفتمِ ماہِ محرّم کا

گیا جو اُس کے کوچے میں وہ باچشمِ پُر آب آیا
حرم سے جس طرح[۱] لاتے ہیں زائر آب زم زم کا

سلیمانی ہے زیبا اُس پری کو ملکِ خوبی میں
تبسّم نقش خاتم ہے، دہن حلقہ ہے خاتم کا

جواب اُس نے نہ بھیجا اور ہم نے خط لکھے اتنے
کہ مُہریں کرتے کرتے مٹ گیا نقش اپنی خاتم کا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخہ مطبع ہندی: ''حرم سے لاتے ہیں جس طرح''۔

نظر آتا نہیں جب ہے کسی کا کعبۂ ابرو
ہمارے دیدۂ تر میں ہے عالم چاہِ زم زم کا

جلا کرتا ہوں میں دن رات لیکن مر نہیں جاتا
اثر سوزِ غمِ فرقت میں ہے نارِ جہنم کا

نہیں ہے معتقد میرا اگر حاسد تو کیا غم ہے
ہوا بے سجدۂ ابلیس کیا نقصان آدمؑ کا ؟

کسی دل تک رسائی ہو سکے تو عرش ہے یہ بھی
عزیزو ! گر نہیں معراج ممکن عرشِ اعظم کا

برنگِ گل جگر ہوتا ہے ٹکڑے سیرِ گلشن
ہوا ہے تیغِ غم بے یار نظارہ سپر غم کا

رسائی میرے اوجِ فکر تک ہوگی نہ حاسد کو
غرور آگے مرے کرتا ہے کیا تحصیلِ "سلّم" کا

پری زادوں نے منہ اپنا چھپایا مارے غیرت[۱] کے
اسے سوچو ذرا کیا حسن ہے اولادِ آدمؑ کا

ازل سے جو کہ باہم ہیں ، جدا ہوتے ہیں دنیا میں
دلیل اس پر جدا ہوتا ہے یاں طفلانِ توام کا

حماقت ہے غرورِ جاہ اہلِ فقر کے آگے
یہ تاج و تخت ہے رد کردہ ابراہیم ادھم کا

سخاوت جس کو کہتے ہیں کہاں ہے زمانے میں
بخیلوں کی بدولت رہ گیا ہے نام حاتم کا

۱ه مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخہ مطبع بدی : "چھپایا مارے خجلت کے"۔

مری آنکھوں میں پڑ جائیں نہ کیونکر اس قدر حلقے
تصور رات دن رہتا ہے[1] مجھ کو زلفِ پُر خم کا

میں ایسا پاک دامن ہوں یقیں ہے بعدِ مردن بھی
بجائے سبزہ تربت پر اگے گا پنجہ مریم کا

مسی آلودہ لب کو تو نے جس کپڑے سے پوچھا[2] ہے
وہ میرے زخمِ دل کے واسطے پھاہا ہے مرہم کا

تماشائے جہاں ہم دیکھتے ہیں کنجِ غربت[3] میں
ہمارے بوریے کا نقش خط ہے ساغرِ جم کا

قطعہ

گزر ناگاہ جو میرا ہوا شہرِ خموشاں میں
عجب نقشہ نظر آیا وہاں شاہانِ عالم کا

کہیں آئینۂ زانو سکندر کا شکستہ تھا
کسی جانب پڑا تھا کاسۂ سر خاک میں جم کا

عجب ہیں سایۂ رہ اور عدو ہیں خارِ رہ ناسخ
مسافر وادیِ امکاں میں ہوں گویا کوئی دم کا

۲۷

کب ہوا محتاج حلق اپنا کسی خوں ریز کا
ہر رگِ گردن میں یاں عالم ہے تیغِ تیز کا

دودِ عنبر سے نہیں کچھ کم ہمارا دودِ آہ
ہے بہت دل میں خیال اک زلفِ عنبر بیز کا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع ہدی : "تیری زلفِ پر خم کا" -
۲- پونچھا -
۳- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع ہدی : "کنجِ عزلت میں" -

ساتھ آہوں کے نہ دردِ دل نکل جائے کہیں
اس لیے ہے ضبط مجھ کو آہِ درد آمیز کا

نیل پڑ جائے یقیناً کھائے گر دریائے نیل
لطمہ میرے اشک کے دریائے شور انگیز کا

دن جو اپنا صرف ہوتا ہے بتوں کی یاد میں
رات بھر رہتا ہے عالم مرغِ شب آویز کا

اس قدر روئے ہیں تیرے جور سے اہلِ جہاں
نام صفحے سے جہاں کے مٹ گیا چنگیز کا

وصل کی شب پر ہوئی ہے تیزیٔ رفتار ختم
خاک میں نام اس کے آگے مل گیا شب دیز کا

عشق کر دیتا ہے سلطان و گدا کا ایک رنگ
کوہکن کی طرح آخر خوں[1] کیا پرویز کا

مانعِ رفتار مجھ وحشی کو ہوں کیا خارِ دشت
تیزرو کرتا فرس کو کام ہے مہمیز کا

اشک گر پڑتے ہیں جس دم ہوتا ہے[2] دل بے قرار
میری آنکھوں میں ہے عالم ساغرِ لبریز کا

جوششِ مضموں کو خالہ[3] صورِ اسرافیل ہے
یاں زمینِ شعر میں عالم ہے رستاخیز کا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"کوہکن کی طرح خوں آخر کیا پرویز کا"
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"اشک گر پڑتے ہیں دل ہوتا جسدم بیقرار"
۳۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : "جوششِ مضموں کو خامہ"۔

عشق کے آزار میں مرتا ہے ہر بے گردِ یار
ہے خدا حافظ دلِ بیمار بے پرہیز کا
کام اول ہی جہاں پڑتا ہے چاہِ گور میں
ناسخ آوارہ ہے اس صحرائے آفت خیز کا

۲۸

سینکڑوں آہیں کروں پر ذکر کیا آواز کا
تیر جو آواز دے ، ہے نقص تیر انداز کا
نازنینوں سے کروں کیا ربط میں نازک مزاج
بوجھ اٹھ سکتا نہیں مجھ سے کسی کے ناز کا
رشک سے جلتا ہے ایسا روئے جاناں دیکھ کر
طور ہے مہتاب میں مہتابِ آتش باز کا
یار سے کرتا ہوں میں باتیں ، جلے جاتے ہیں غیر
صاعقہ اُن کو ہوا شعلہ مری آواز کا
آگے مجھ کامل کے ناقص ہے کمالِ مدعی
درمیاں ہے فرق استدراج اور اعجاز کا
جال اے صیاد اپنی زلف کا تو روک دے
ہے ارادہ میرے مرغِ روح کو پرواز کا
محو ایسا چاہیے عاشق خیالِ دوست میں
غیر اگر بولے یقیں ہو یار کی آواز کا
جس قدر جلتا ہے ہوتا ہے سیہ داغِ جنوں
ہے چراغ اپنا دلِ روشن مرکب ساز کا
گر کوئی پڑھنے لگے بزمِ غنا میں میری نظم
کان کا پردہ وہیں بن جائے پردہ ساز کا

ضبطِ آہِ شعلہ افشاں جب ہوا مجھ کو گراں
آسماں بن جائے گا طاؤس آتش بازکا

میری نظروں سے جو تو پنہاں ہوا ، رسوا ہوا
بے قراری میں نہیں ممکن چھپانا راز کا

کی ہے یاں شدت سی شدت برشگالِ اشک نے
کیوں نہ واں آ جائے موسم سبزے کے آغاز کا

چل کے ناسخ گلشنِ شیراز کو آباد کر
آشیاں ویراں پڑا ہے بلبلِ شیراز کا

۲۹

رات ایسا انتظارِ یار میں بے تاب تھا
بسترِ گل پر نہ تھا میں ، آگ پر سیماب تھا

میرے اشکوں کا فلک پر موجزن سیلاب تھا
ہالۂ مہ کی جگہ شب حلقۂ گرداب تھا

نرم دل محبوب جیسے[1] تھے ہوئے ہیں سخت دل
سنگ میری جان کو ہے ، پیش ازیں جو آب تھا

رات مجھ کو تیرے آنے سے جو مایوسی ہوئی
انتظارِ مرگ تھا یا اشتیاقِ خواب تھا

شب چمن میں کیں کفِ پا سے یہ نور افشانیاں
جو ترا نقشِ قدم تھا سو گلِ مہتاب تھا

تیری محفل میں جو پاسِ رازِ ہوشی تھا مجھے
مثلِ رنگِ گل رواں آنکھوں سے یاں خوناب تھا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی : ”جتنے تھے“ ۔

کچھ سمجھ کر ناتوانی نے دبا ہے غم آئے
قصرِ تن میرا بنا ہے جب سے ، بے محراب تھا

جلوہ فرما بام پر جو عارضِ جاناں ہوا
چاند اُس کے سامنے اک کرمکِ شب تاب تھا

تیرے روئے آتشیں کو دیکھتے ہی اڑ گیا
اضطرابِ دل جسے سمجھے تھے وہ[1] سیماب تھا

ہو گئی بالکل ہماری عمر غفلت میں بسر
عرصہ اپنی زندگانی کا مگر اک خواب تھا

گل کہیں دیکھا نہ میں نے داغِ حسرت کے سوا
میرے اشکوں سے مگر باغِ جہاں شاداب تھا

کی سیہ کاروں نے میرے نورِ عرفاں کی یہ[2] قدر
شپرہ سے خلق میں خورشید عالم تاب تھا

کس لیے ہر شب یہ ہوتا ہے گرفتارِ فراق
ہجر میں کیا اپنا مرغِ نامہ بر سرخاب تھا

رات دن فرقت میں رہتا ہے مجھے رونے سے کام
یاد آتا ہے کہ اک آنسو درِ نایاب تھا

ذبح کرنے میں مرے ناسخ ہوا قاتل کو رنج
پنجۂ نازک میں اس کے خنجرِ بے آب تھا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"اضطرابِ دل جسے سمجھے تھے ہم ، سیماب تھا"

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"کی سیہ کاروں نے میرے نور عرفاں کی نہ قدر
شپرہ تھی خلق ، میں خورشید عالم تاب تھا"

۳۰

یاں آسرا ہے ساقیٔ کوثر کی ذات کا
ہے ساغرِ شراب سفینہ نجات کا

زخمِ دہانِ خلق کو ہے اس سے التیام
مرہم سے ہے زیادہ اثر میری بات کا

جلتے[1] ہیں سوزِ عشق سے مانندِ شمع ہم
رتبہ ملا ہے آگ کو آبِ حیات کا

مضموں جو لکھتے ہیں تری چشمِ سیاہ کے
عالم ہے رشک دیدۂ آہو دوات کا

وقفہ نہیں کہ غنچۂ منقار کھل سکے
ہوں عندلیب کس چمنِ بے ثبات کا

جب تک وہ ہے دو چار مری زندگی بھی ہے
تارِ نگاہِ یار ہے رشتہ حیات کا

کافر ہوں میں، ہم رہیں محروم واعظا!
کر میکدے پہ حکم نہ جاری فرات کا

گر مے نہیں تو صوم ہے مستی صلواۃ ہے
واعظ یہاں بھی شغل ہے صوم و صلات کا

جو ہے کلامِ شیخ وہی قولِ برہمن
مطلب ہے ایک، فرق فقط ہے لغات کا

خامہ ہے نیشکر مرے شیریں کلام سے
شرمندہ ہے دوات سے کوزہ نبات کا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع یحیوی : ”جیتے“ ۔

مجرم ہوں اغنیا تو فقیروں پہ ہو عذاب
کرتا ہے قحط دیکھو[1] نہ دینا زکات کا

آنکھوں کے آگے غش سے ستارے ہیں ترمرے
روزِ سیاہ ہجر میں عالم ہے رات کا

کب جائے گا عیادتِ ناسخ کو اے مسیح
نزدیک اب تو وقت ہے اُس کی وفات کا

۳۱

نوجوانی میں ہوا عشق اُس بتِ گلفام کا
عالم اپنے داغِ دل میں ہے چراغِ شام کا

خاک ہونے پر گئی اپنی نہ عالی فطرتی
گور میں بھی دھیان ہے ہم کو کسی کے بام کا

سبزۂ بیگانہ باغِ حسن سے کرتا ہے دور
نام رکھا باغباں ہم نے ترے حجام کا

ہجر میں مے سے بجائے نشہ ہوتا ہے خمار
باعثِ دورانِ سر ہے دور میرے جام کا

کھینچ لائی وادیٔ ہستی میں بے تابی مجھے
رہ گیا پیچھے عدم میں قافلہ آرام کا

آ رہی ہے تن پرستی ، حق پرستی کے عوض
رہ گیا ہے گاؤ خواری سے نشاں اسلام کا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : ''کرتا ہے دیکھو قحط''۔

اپنے کشتوں کے عزا میں ہے سیہ پوش آپ بھی
وہ خطِ شب رنگ بھی گویا ہے عالم[1] شام کا

اشتیاقِ چشمِ جاناں میں گئے ہیں جی سے ہم
ہو چراغ اپنی لحد پر روغنِ بادام کا

اے فلک دیکھوں تو کب تک روزِ وصل آتا نہیں
منتظر بیٹھا ہوں میں بھی گردشِ ایام کا

جوششِ مستی میں ناسخ مطلع ثانی پڑھوں
ساقیٔ کوثر سے ہے مجھ کو سوال اک جام کا

لوحِ محفوظ اک نگینہ ہے علیؑ کے نام کا
عرش کہتے ہیں جسے زینہ ہے اس کے بام کا

رجعتِ خورشید اور شقِ قمر سے ہے عیاں
ہے نبیؐ مالک لیالی کا، علیؑ ایام کا

۳۲

دے دوپٹہ تو اپنا ململ کا
ناتواں ہوں، کفن بھی ہو ہلکا

دردِ سر میں جو سر رگڑتا ہوں
تیرا دروازہ کیا ہے صندل کا

آتشِ رخ سے آنکھیں سینکتے ہیں
کیا زمستاں میں کام منقل کا

ہو جو محبوب خوبرو، بدخو
صاف عالم ہے اس میں حنظل کا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع بھدی: ''حاکم شام کا''۔

کہتے ہیں سالکانِ منزلِ عشق
ہے نشان گورِ کلمِ اول کا

شکمِ صاف کے قریں ہے کمر
یا ہے مخمل پہ خواب مخمل کا

مثلِ برق اُس پہ بے قرار ہوں میں
سایہ رہتا تھا جس پہ بادل کا

قیس کے قیس جانتے ہے[1] لیکن
وحشی ہوں آدمی کے جنگل کا

کیا اُسی گل کی یہ سواری ہے
نکہتِ گل دھواں ہے مشعل کا

بڑھنا اُس طفل کا دلاتا ہے یاد
پھوٹنا شاخِ گل سے کوپل[2] کا

جز صنم کچھ نظر نہیں آتا
وہ موحّد ہوں روزِ اول کا

ایک آنے نظر جو میرا غبار
سرمہ ہو جائے چشمِ احول کا

لکھوں ناسخ جو وصفِ چشمِ سیاہ
ہو سیاہی میں طور کاجل کا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی : "ہی" ۔
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی : "کونپل" ۔

۳۳

کون وہ دل ہے جو محوِ رخِ جاناں نہ ہوا
کون آئینہ ہے جو دیدۂ حیراں نہ ہوا

پر لگائے مجھے وحشت نے ، اڑا پھرتا ہوں
مجھ سے پامال کوئی خارِ بیاباں نہ ہوا

پھٹ گئے لاکھ گریبان مری حالت پر
صبح کا ہجر کی شب چاک گریباں نہ ہوا

ہوں وہ دیوانۂ میخار کہ صحرا میں کبھی
چین جز سایۂ اشجار مغیلاں نہ ہوا

جو ہوا چاند ترے سبزۂ خط کو دیکھا
اس برس ماہ کوئی جز مہِ شعباں نہ ہوا

شبِ تاریکِ جدائی نظر آئی ہے پہاڑ
شب چراغ آج جو وہ لعل بدخشاں نہ ہوا

لاکھ کافر کو کیا تو نے مسلماں ناسخ
ہے یہ افسوس کہ تو آپ مسلماں نہ ہوا

۳۴

سر[1] پہ پہاڑ ان کے نہ اے آسماں گرا
جو برگِ گل کو سمجھیں کہ سنگِ گراں گرا

ساقی کے ہاتھ سے جو گرا شیشۂ شراب
سمجھا میں بادہ کش کہ خمِ آسماں گرا

۱- نسخۂ نول کشور طبع ۲ ۱۸۸۰ء میں یہ شعر موجود نہیں - (مرتب)

مٹی وہاں کی لے گئے عطّار بھر عطر
اُس رشکِ گل کے منہ سے پسینہ جہاں گرا

رشکِ چمن ہوا ہے ہر اک سروِ نونہال
کٹ کٹ کے تیرے عشق میں کیا کیا جواں گرا

پائی شکست دل نے برنگِ شکستہ[۱] رنگ
بالائے سنگ شیشہ مرا بے فغاں گرا

آزاد ہیں قیود سے افتادگانِ خاک
اڑتا پھرا شجر سے جو برگِ خزاں گرا

عالم کو تیرے چاہِ زنخداں سے عشق ہے
یوسف بھی اس کنویں میں مع کارواں گرا

پامال جو کرے گا مجھے پائے گا سزا
شیشے کی طرح خاک پہ میں ناتواں گرا

لغزش رہِ سلوک میں افتادوں کو ہو گیا
ٹھوکر نہ کھا کے ایک دن آبِ رواں گرا

کیا مال رعبِ فقر کے آگے ہے سلطنت
رویا میں، سر سے افسرِ نوشیرواں گرا

ناسخ نگاہِ مست سے دیکھا جو یار نے
مانندِ مست ہر شجرِ بوستاں گرا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجیدی: "برنگِ شکستِ رنگ"۔ [illegible]

۳۵

جب[1] سے گل دام اُس نے دیکھا ہے مرے صیّاد کا
ہوشِ بلبل میں ہے عالم نکہتِ برباد کا

ہے وہ دل ویراں ، نہیں جس میں فروزاں داغِ عشق
روشنی یعنی نشاں ہے خانۂ آباد کا

عہدِ طفلی سے اسیرِ عشق میں مجنوں ہوا
خانۂ زنجیر تھا مکتب مرے استاد کا

ذبح وہ کرتا تو ہے پر چاہیے اے مرغِ دل
دم پھڑک جائے تڑپنا دیکھ کر صیّاد کا

جلوۂ شمشاد جو دیکھا قدِ دل دار میں
غش میں گر کر میں وہیں سایہ بنا شمشاد کا

تیشے میں دستہ لگا تھا چوبِ صندل کا مگر
لگتے ہی اُس کے فنا تھا دردِ سر فرہاد کا

نالۂ ناقوس سمجھو اے بتو اس کو نہ تم
تھرتھرادے کعبے کو صدمہ مری فریاد کا

فصلِ گل آنے نہیں پائی کہ تو یاد آ گیا
اے جنوں دیوانہ ہوں میں اپنے دل کی یاد کا

کر خرام ایسا کہ ہوں پامالِ ناز اہلِ نظر
پیسے دل آوازِ پا اعضائے مادر زاد کا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی : ''جبسے''۔

۳۶

سرو پر سایہ پڑا تیرا وہ موزوں ہو گیا
میرے سائے کے اثر سے بید مجنوں ہو گیا

آنکھ بھر کر دشت کو دیکھا تو جیحوں ہو گیا
ٹھوکریں کھا کھا کے میری کوہ ہاموں ہو گیا

تھرتھرایا[1] ہے جو رعبِ حسن سے جسمِ نزار
سامنے لیلیٰ کے مجنوں بیدِ مجنوں ہو گیا

بندشِ مضمونِ قامت نے کبھی چاہی نہ فکر
خود بخود دل سے نکلتے ہی وہ موزوں ہو گیا

بعد مردن بھی ہمارے ساتھ ہے سرگشتگی
گنبد اپنی قبر کا گردش سے گردوں ہو گیا

چاہیے معشوق سے عاشق کو ایسا اتحاد
اس نے پہنا طوق منّت کا، میں مجنوں ہو گیا

مار ڈالا مُمسکوں کی قدردانی نے مجھے
مثلِ زرِ خاکِ کدورت میں میں مدفوں ہو گیا

کل ہے اک دو گز زمیں رہنے کو بعد از قبضِ روح
آج گو قبضے میں سارا ربع مسکوں ہو گیا

میرے قاتل کا فرس اس سے نہ آگے بڑھ سکا
خون میرا گرم رفتاری میں گلگوں ہو گیا

عقل سے خالی ہے، خمخانے سے جس کو ہے گریز
خم وہ ہے ناسخ کہ ماوائے فلاطوں ہو گیا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع بھدی : "تھرتھراتا ہے"۔

۳۷

آج دعویٰ اُس کی یکتائی کا باطل ہو گیا
بحث کرنے کو جو آئینہ مقابل ہو گیا

ایک دل لے کر دیے قاتل نے مجھ کو لاکھ دل
جو لگا پیکاں مرے پہلو میں وہ دل ہو گیا

کیوں نہ اب عالم ہو اُس کا تختۂ مشقِ ستم
وقتِ بسم اللہ معلّم جس کا بسمل ہو گیا

کچھ بھی حاصل باکمالوں کو نہیں ہے جز زوال
موردِ نقصاں ہوا جب ماہ کامل ہو گیا

مصحفِ رخسارِ جاناں میں نہیں ہے ایک خال
بے نقط قرآن بھی دنیا میں نازل ہو گیا

وادیٔ وحشت میں کیوں مثلِ جرس نالاں ہے قیس
ایک لیلیٰ کیا یہاں کس کس کا محمل ہو گیا

صبح ہوتے کچھ نظر آیا نہ غیر از آفتاب
کون کون اک رات کو یاں شمعِ محفل ہو گیا

۳۸

رات بھر جو سامنے آنکھوں کے وہ مہ پارہ تھا
غیرتِ مہتاب اپنا دامنِ نظّارہ تھا

بن گئے گردابِ سیلِ اشک جانے گردباد
ابرِ تر کی طرح میں جس دشت میں آوارہ تھا

تو نے آنکھیں پھیر لیں یاں کام آخر ہو گیا
طائرِ جاں پائے بندِ رشتۂ نظّارہ تھا

شب ترے پرتو سے لبریزِ لطافت تھا چمن
ہر گلِ شبنم سے جاری نہر کا فوّارہ تھا

مجھ کو دم لینے کی بھی فرصت نہ دنیا میں ملی
روزِ مولد شادیانہ کوچ کا نقارہ تھا

خرمی ہوتی ہے بیدردوں کو سیرِ باغ میں
ہم نے جس گل پر نظر کی اک گلِ صد پارہ تھا

خواب میں بھی یار تک ممکن نہ تھا دخلِ رقیب
جن دنوں[1] اپنا خیال اخبار کا ہرکارہ تھا

شب نظر کی میں نے فرقت میں جو سوئے آسماں
اژدہا تھی کہکشاں، عقرب ہر اک سیارہ تھا

اے اجل دی تو نے بارِ جسم سے آ کر نجات
کب[2] سے میری پیٹھ پر یہ خاک کا پشتارہ تھا

خوف سب جاتا رہا دل سے عذابِ ہجر کا
نقدِ جاں دینا گناہِ عشق کا کفارہ تھا

کہتے ہیں مارا گیا ہے جرمِ تیغِ ناز سے
کوچۂ قاتل میں ناسخ نام جو بےچارہ گیا

٣٩

ہے دلِ سوزاں میں طور اُس کی تجلی گاہ کا
روئے آتش ناک ہر شعلہ ہے میری آہ کا

وصل کیا ہم خاکساروں کو ہو اُس دل خواہ کا
خاک میں آلودہ ہونا کب ہے ممکن ماہ کا

نورافشاں جب سے ہے دل میں خیال اُس ماہ کا
طور کا شعلہ دھواں ہے میری شمعِ آہ کا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجیدی : "چندلوں" ۔
۲- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجیدی : "کیسے" تھا

ہے فرومایوں سے پہلے رنجِ امیدِ نفع میں
ہاتھ بے محنت نہیں آتا ہے پانی چاہ کا

قامتِ موزوں نظر آئے مجھے جائے الف
تھا شروعِ عاشقی دن میری بسم اللہ کا

سمجھے میکش دیکھ کر ابرو تری بالائے چشم
میکدے سے مرتبہ اعلیٰ ہے بیت اللہ کا

آمدِ خط میں تو ہونے دے نگاہوں کا گزر
دیکھ لے بجنے نہیں پاتا ہے سبزہ راہ کا

جا برابر ہے دلِ مادر میں ہر فرزند کی
رتبہ زیرِ خاک یکساں ہے گدا و شاہ کا

خلق نے قرآن دیکھا جب ہوا ماہِ رجب
ہم نے دیکھا مصحفِ رخسار اپنے ماہ کا

آتے ہی اس طفل کے روشن سیہ خانہ ہوا
شمع ساں جلوہ ہے اس کے قامتِ کوتاہ کا

زر دیا گل کو فلوسِ داغِ سودا دے مجھے
اے فلک موسم یہی تھا میری بھی تنخواہ کا

سفلہ ہو جاتا ہے وقتِ امتحاں بے آبرو
ہے دلیل اس ادعا پر ٹوٹ جانا چاہ کا

دیکھ کر تجھ کو نہ کیونکر نعرہ زن ہوں سب رقیب
بیشتر کتوں کو بھونکاتا ہے جلوہ ماہ کا

یار کا ناسخ پھٹا ہے پیرہن تو عیب کیا
ہے کتاں کو چاک کرنا کام نورِ ماہ کا

ردیف ۱ - ۲۰ -

جو گلدستوں کو دیکھوں دھیان آئے سروِ دلجُو کا
تصوّر عین کعبے میں بندھے محرابِ ابرو کا
کروں تحریر گر مضمون کوئی اُس کے گیسو کا
تو خوشبوئی سے خامے پر یقیں ہو شاخِ شبّو کا
سوالِ وصل پر ہلنا پری رو تیرے ابرو کا
اشارہ ہے براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو کا
گیا سجدے میں دیکھا جب سے[1] تیرے مصحفِ رخ کو
نہیں کم سجدے کی آیت سے رتبہ بیتِ ابرو کا
چڑھاتی ہے دماغ افلاک کو انساں کی کم وزنی
کرے میلِ زمیں سنگیں جو ہو پلّہ ترازو کا
اُسی دم مجھ کو ہوتا ہے افاقہ دردِ ہجراں سے
تصور باندھتا ہوں جب ترے تعویذِ بازو کا
نظر آتے ہیں کیا پُر درد مضموں فکر کرتے ہی
دکھاتا ہے مجھے عکسِ دروں آئینہ زانو کا
جو کچھ ٹوٹے ہوئے بال اُس نے کھونسے زلفِ مشکیں کے
تو عالم روزنِ دیوار میں ہے نافِ آہو کا
نظر آتی ہے صاف اُس میں مجھے انجام کی صورت
جو گورستاں میں دیکھا ہے کوئی آئینہ زانو کا
یہ بیٹھا انتظارِ یار میں تکیہ لگا کر میں
کہ جوشن بن گیا ہوں اپنے دروازے کے بازو کا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ اسخہ، مطبع ہدی : ''جس نے تیرے'' ۔

اگر لب سرخ ہیں تو نشے سے آنکھیں بھی ہیں گلگوں
بتوں نے کر دیا ہے ایک رنگ اعجاز و جادو کا
میں ہوں عالم کے دیوانوں میں موزوں طبع دیوانہ
کرو مجھ کو نشانہ کودکو! سنگِ ترازو کا
دوائر حرفوں کے بنتے ہیں طوقِ گردنِ قمری
رقم کرتا ہوں گر مضمون اپنے سروِ دل‌جو کا
مژہ جو ہے وہ گویا اک زباں کا کام کرتی ہے
وہ عالم ہم نے دیکھا ہے کسی چشمِ سخن گو کا
یقیں ہے سنتے سنتے اُس کا سر پھرنے لگے ناسخ
بیاں میں سامنے جس کے کروں اپنی لگاہو[1] کا

۲۱

گر نہ جاں سوز غمِ گیسوے جاناں ہوتا
نہ کبھی یوں دمِ اژدر شررافشاں ہوتا
زندگی کا کوئی دم مجھ کو مزہ مل جاتا
میرے زخموں پہ جو قاتل نمک افشاں ہوتا
تو وہ بت ہے کہ اگر دیر میں جاتا اک دم
مثلِ ناقوس ہر اک بت وہیں نالاں ہوتا
ہے[2] بلا سلسلہ گیسوے بتاں کا اے دل
یہ جہاں کیوں نہ مسلمانوں کو زنداں ہوتا

۱- لگاہو (ک - اسم مونث) دوڑ دھوپ ، سعی ، کوشش ، جستجو - بے فائدہ تردد - (فرہنگ آصفیہ ، جلد اول ، ص ۲۱۸) -
۲- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع ہدی :
"ہے بلا سلسلۂ زلف بتاں کا اے دل"

نہ کبھی مرگ سے یوسف کو پہنچتا آسیب
پاس اس کے جو ترا سیبِ زنخداں ہوتا

ہو گیا دامنِ تر نورِ حقیقت کو حجاب
کس طرح ابر میں خورشید نہ پنہاں ہوتا

سدِّ راہِ کس و ناکس ہے مرا شہرۂ فقر
ورنہ کب مجھ کو میسر کوئی درباں ہوتا

سانپ ہر گنج پہ ہوتا ہے کبھی او قاتل
سایۂ زلف سرِ گنجِ شہیداں ہوتا

دلِ سخت اس بتِ کافر کا ہے کوہِ جودی
کارگر خاکِ مرے اشک کا طوفاں ہوتا

نخلِ ماتم کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا ہرگز
میرے اشکوں سے جو سرسبز گلستاں ہوتا

خط ٹھہرتا نہیں منہ پر تری آنکھوں کے سبب
سبزہ کیونکر نہ چراگاہ غزالاں ہوتا

ہنس کے کہتا ہے وہ گل میرے رلانے کے سبب
لطف تھا سیرِ گلستاں میں جو باراں ہوتا

بے کسی میں میں ہوا تیغِ محبت کا[1] شہید
کون جز زخم مری لاش پہ گریاں ہوتا

پشتِ خار اس کفِ رنگیں میں جو رہتا اک دم
کیا تعجب ہے اگر پنجۂ مرجاں ہوتا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع بھدی: "محبت سے شہید" -

دُر و یاقوت سے میں دُرجِ دہن بھر دیتا
خوب ناسخ سے جو وصفِ دُرِ دنداں[1] ہوتا

۶۲

پونچھتا اشک اگر گوشۂ داماں ہوتا
چاک کرتا میں جنوں میں جو گریباں ہوتا

مال ملتا جو فلک سے ضررِ جاں ہوتا
مر نہ ہوتا جو میسر مجھے ساماں ہوتا

منہ کو دامن سے چھپا کر جو وہ رقصاں ہوتا
شعلۂ حسن چراغِ تہہِ داماں ہوتا

استرہ منہ پہ جو پھرنے نہیں دیتا ہے بجا
محو دیندار سے کیوں کر خطِ قرآں ہوتا

اپنے ہونٹوں سے جو اک بار لگا لیتا وہ
ہے یقیں ساغرِ مے چشمۂ حیواں ہوتا

نازک ایسا ہے وہ کافر وہیں ہوتا بدمست
گذر اُس کا جو کبھی زیرِ مغیلاں ہوتا

سنگِ چقماق بھی بنتا تو مرا ضبط یہ ہے
نہ مری قبر کا پتھر شرر افشاں ہوتا

ہوں وہ وحشی کہ اگر دشت میں پھرتا شب کو
آ کے مشعلچی وہیں غولِ بیاباں ہوتا

نکہتِ کاکلِ پیچاں سے جو دیتے تشبیہ
عطر مجموعے کا ہر جزو پریشاں ہوتا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مہدی :
"خوب ناسخ سے جو وصفِ لبِ و دنداں ہوتا"۔

کی مکافات شبِ وصل فلکؔ نے ورنہ
کس لیے مجھ پہ عذابِ شبِ ہجراں ہوتا

اپنی صورت کا وہ دیوانہ نہ ہوتا تو کیوں
پاؤں میں سلسلۂ گیسوئے پیچاں ہوتا

ایک دم یار کو بوسوں سے نہ ملتی فرصت
گر دہن دیدۂ عالم سے نہ پنہاں ہوتا

کس کی پریاں، شہِ جنّات کو بھی آٹھ پہر
ہے یہ حسرت کہ سگِ کوچۂ جاناں ہوتا

خوں رلاتا وہیں ناسور بنا کر گردوں
زخم بھی گر مرے تن پر کبھی خنداں ہوتا

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شبِ فرقت میں تو احساں ہوتا

کون ہے جو[1] نہیں مرتا ہے ترے قامت پر
کیوں نہ ہر سروِ چمن قالبِ بے جاں ہوتا

کیا قوی ہے یہ دلیل اُس کی پریزادی کی
ربط انسان سے کرتا جو وہ انساں ہوتا

اے بتو! ہوتی اگر مہر و محبت تم میں
کوئی کافر بھی نہ واللہ مسلماں ہوتا

حسرتِ دل نہیں دیتا ہے[2] نکلنے ناسخؔ
ہاتھ شل ہوتے میسر جو گریباں ہوتا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجیدی :
"کون ہے وہ نہیں مرتا جو تری قامت پر"

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجیدی :
"حسرتِ دل نہیں دیتا میں نکلنے ناسخؔ"

۴۳

ترے رخسار کا مضموں جو اے جانِ جہاں باندھا
تو گویا ہم نے اک گلدستۂ باغِ جناں باندھا

دمِ فکرِ سخن اکثر ہماری طبعِ روشن نے
تجھے خورشید باندھا اور زمیں کو آسماں باندھا

کبھی عشقِ بتاں میں بندھ گیا مضمونِ بت خانہ
تو ہم نے بے خطر کعبے کو سنگِ آستاں باندھا

زمیں پر مثلِ طفلِ اشک لوٹا بے قراری کا
تصور پیر نے بھی گر ترا اے نوجواں باندھا

ہوا جو چاند اے خورشیدِ تاباں تیری فرقت میں
مہِ نو کو تو باندھا تیغ، گردوں کو کماں باندھا

نہ نکلی بات منہ سے کہا کے اک تلوار قاتل کی
دہانِ زخم نے گویا مرا زخمِ دہاں باندھا

جہاں میں جتنے ہیں جن و پری سب تجھ پہ مرتے ہیں
عبث[۱] تعویذ ڈنڈ پر تو نے اے جانِ جہاں باندھا

جو میں بھی دیکھتا سینے کی طیاری تو کیا ہوتا
مجھے آتے ہی ہر بندِ قبا کیوں مہرباں باندھا

نہیں لٹکایا فاسخ شملہ پہ آس بحرِ خوبی نے
ہماری کشتیٔ عمرِ رواں میں بادباں باندھا

۱- مصطفائی طبع اول و طبع دوم، نسخۂ مطبع مہدی:
"عبث تعویذ تو نے ڈنڈ پر اے جانِ جاں باندھا"

۴۴

معطّر اُس کے نہانے سے بس کہ آب ہوا
حبابِ بحر ہر اک شیشۂ گلاب ہوا

دکھائی دے گا فلک ایک نیلوفر کا پھول
ہمارے رونے سے جس دم وفورِ آب ہوا

مرے بدن پہ اگر ایک بوند مینہ کی پڑی
برنگِ برق مرے دل کو اضطراب ہوا

جو آنکھیں لشے سے رہتی تھیں سرخ پرخوں ہیں
فراقِ یار میں کیا ہائے انقلاب ہوا

جو یاد بزم میں آئی وہ نرگسِ میگوں
نظر میں ساغرِ مے دیدۂ پُر آب ہوا

نجات ہوگی عذابِ حساب سے سب کو
جو پہلے روزِ قیامت مرا حساب ہوا

جلا نہ آتشِ سودائے عشق سے جو یہاں
تو واجب اس پہ جہنم کا بس عذاب ہوا

یہ رنگِ عارضِ گل رنگ ہے کہ نامِ خدا
پڑا جو عکس ترا آب میں، شہاب ہوا

نگہ ٹھہرتی نہیں اپنے عکس پر اُس کی
شعاعِ حسن سے آئینہ آفتاب ہوا

خلل پذیر ہمیشہ ہے کارخانۂ عقل
کبھی نہ خانۂ زنجیر یاں خراب ہوا

یہ حسن و عشق ہیں ہر حال میں شریک بہم
کہ آیا غش مجھے اُس کا جو وقتِ خواب ہوا

یہ رنگِ موج ہوا میری آہِ گرم سے ہے
ہر ایک مرغِ ہوا سیخ کا کباب ہوا

جہاں نظر میں یہ تاریک تھا کہ اے ناسخ
سوادِ گور مجھے رشکِ ماہتاب ہوا

۴۵

سرو مثلِ جادہ ہے پامال تیری چال کا
صید ہے کبکِ دری نقشِ قدم کے جال کا

بے طلب سے اس قدر نفرت کہ رہتا ہے خیال
آ نہ جائے لفظ لب پر بابِ استفعال کا

سرو ہے باغِ جہاں میں وہ صنم نامِ خدا
ہے بجا اس کو پسند آئے جو کپڑا چھال کا

ہو کبھی کافر کی زلفوں سے جدا ہوتی نہیں
طائرِ نکہت بھی قیدی ہو گیا اس جال کا

طوق ہر گرداب ہے، ہر موج ہے زنجیرِ پا
ہے ہر اک آبِ رواں دیوانہ تیری چال کا

تو شرابِ آتشیں پیتا ہے، وہ کھاتا ہے آگ
بس یونہی ہوگا مقلد کبک تیری چال کا

ہو گیا ثابت کہ ہے دس خوش قدوں کا تجھ میں حسن
تیرے قامت کے الف پر ہے جو نقطہ خال کا

رونگٹا بھی میں نے سر سے پاؤں تک دیکھا نہیں
افترا تیرے بدن پر ہے کمر کے بال کا

ہوں ہیولوں میں جو میں مجنونِ چشمِ مستِ یار
کھینچتے ہیں بادۂ گلرنگ اس کی چھال کا

حادثاتِ دہر سے محفوظ ہیں اربابِ فکر
غم نہیں ہرگز زمینِ شعر کو بھونچال کا

عالمِ حیرت ہوا عالم ، دکھا اپنا جمال
منتظر آئینہ خانہ ہے تری تمثال کا

پھر نہ میرے پاس آیا جا کے اے جانِ جہاں
طور کیا سیکھا ہے تو عمرِ رواں کی چال کا

ایسی اپنے لاشۂ سوزاں سے گرمائی زمیں
بن گیا گنبد ہماری قبر پر تبخال کا

جنگ[1] میں غالب امیروں پر نہ ہوں کیونکر فقیر
زور چل سکتا نہیں کمبل کے آگے شال کا

ہے قوی تر دوست اے ناسخ جو دشمن ہے قوی
ساتھ مہدی کے ہوں میں کچھ غم نہیں دجّال کا

۴۶

میں اگر روؤں تو ہو سرسبز دانہ خال کا
ابرِ تر اک خشک کونا ہے مرے رومال کا

بعدِ مردن خاک اُس کی بنتی ہے ریگِ رواں
اے پری رو جو کہ ہے وارفتہ تیری چال کا

کیا قناعت عشق کی دولت سے ہوتی ہے حصول
لاکھ عاشق کو ہے کافی ایک دانہ خال کا

سیم و زر کے دیکھنے سے خوش نہ کیوں انسان ہوں
توتیائے چشم ہوتا ہے دھؤاں ٹکسال کا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مہدی :
"جنگ میں غالب امیروں پر نہ کیوں کر ہوں فقیر"

روئے جاناں پر یہ رہتا ہے نگاہوں کا ہجوم
سبزۂ خط میں ہے عالم سبزۂ پامال کا

فقر و فاقہ جس کو ہو وہ جان لے آتا ہے عیش
بعد روزوں کے مقرر غرّہ ہے شوال کا

بارِ[1] دنیا ہے فقیروں کو امیروں سے سوا
بوجھ کم ہوتا ہے کمّل سے نہایت شال کا

سبزۂ خط ہردم اس میں سے جو آتا ہے نظر
دودِ قلیاں میں ہے عالم طوطیوں کی چال کا

آپ کو مردہ سمجھتا ہوں فراقِ یار میں
دیدۂ گریاں پہ ہوتا ہے گماں غسّال کا

لوگ سمجھے ہیں غبارِ خط جسے وہ ہے دھؤاں
آتشِ رخسار سے جلتا ہے دانہ خال کا

ناتواں ایسا ہوا ہوں[2] دامِ زلفِ یار میں
مرغِ دل سے اڑ[3] نہیں سکتا ہے دانہ خال کا

ہے کہیں روئیں سے نازک تر ترا[4] موئے کمر
باندھنا اس پر ستم ہے شال کے رومال کا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجھی :
"بار دنیا ہے فقیروں پر امیروں سے زیاد"
۲- مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجھی : "ناتواں ایسا ہوا ہے" ۔
۳- مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجھی : "مرغ دل سے اٹھ نہیں سکتا" ۔
۴- مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجھی : "ترے موئے کمر" ۔

وصل کی شب ہو چکی اے اشک بجتا ہے گجر
ہم نشیں گھڑیال اب ہو پانی کے گھڑیال کا

کھاتے ہیں گن گن کے روزے ساقیا ہم بے شراب
انتظار ایسا ہے ہم کو غرّۂ شوال کا

جس پہ تو مرتا ہے برسوں سے وہ ہردم اور ہے
دمبدم فاسخ تجدّد ہے یہاں امثال کا

۴۷

دورِ حسنِ یار نے عالم دکھایا کال کا
سیکڑوں عاشق ہیں سائل ایک دانہ خال کا

ہے تصور جب سے آنکھوں میں کسی کی چال کا
میری پلکوں میں ہے عالم سبزۂ پامال کا

آدمی کو عشق نازیبا ہے زلف و خال کا
جانور ہوتا ہے قیدی دانے کا اور جال کا

جب سے نظروں میں سمائی ہے کمر ایذا میں ہوں
رنج دیتا ہے بہت آنکھوں میں پڑنا بال کا

بیٹھے ہیں عشاق ہو کر تیری آنکھوں پر فقیر
ورنہ کیوں بستر ہے تکیوں میں ہرن کی کھال کا

حیلہ ہے موئے پیمبر کی زیارت کا انھیں
زاہدوں کو عشق ہے تیری کمر کے بال کا

کیوں نہ او کافر کروں سجدہ میں تیرے پاؤں پر
صورتِ محراب ہے حلقہ تری خلخال کا

ہے بجا گر دیدۂ تر سے چلے آتے ہیں اشک
ہوں میں دیوانہ ، نہ کیونکر ہو ہجوم اطفال کا

وصل سے ہاں آج بھی ہے عید کل بھی عید ہے
کیا شبِ فرقت میں ظالم طول تھا اک سال کا

وہ گلے لگتا ہے اُس دن اس لیے کرتے ہیں عید
سارے غرّوں سا وگرنہ غرّہ ہے شوال کا

ہے[1] دہن میں اس قدر خوشبو کہ اب رکھا ہے نام
عطر کی شیشی تری بلّور کی مہنال کا

چہرۂ تاباں نظر آتا ہے چینِ زلف سے
چشمۂ خورشید ہے چشمہ ہر اک اس جال کا

ہے کہیں ترکِ غذا سے تلخ تر ترکِ شراب
مست صائم سے ہے افزوں منتظر شوّال کا

دین و دنیا سے تبرّا مثلِ ناسخ ہے مجھے
بس دلا کافی تولّا ہے نبیؐ کی آل کا

۴۸

تو نے شہبازِ نگہ کو جو ادھر چھوڑ دیا
ہم نے بھی طائرِ دل باندھ کے پر چھوڑ دیا

اُس ستمگر کو یہاں تک تو مرے ساتھ ہے ضد
میں نے گھر ڈھونڈ نکالا تو وہ گھر چھوڑ دیا

قفسِ تن میں رہے گا نہ مرا طائرِ روح
دامِ کاکل سے مجھے تو نے اگر چھوڑ دیا

آ گیا کچھ جو زباں پر اثرِ زہرِ فراق
غم نے چکھتے ہی مرا خونِ جگر چھوڑ دیا

۱- یہ شعر مصطفائی اول و دوم اور نسخۂ مطبع ہدی میں چھوٹا ہے۔

سایہ ساں اب ہیں دیوار گروں گا جا کر
میں نے گو کینۂ درباں سے یہ در چھوڑ دیا

اثرِ زہد و قناعت نے بنایا اخگر
ہاتھ میں لیتے ہی بس میں نے تو زر چھوڑ دیا

ذبح کر ڈالوں گا گر اب کے تو بولا شبِ وصل
میں نے سو بار تجھے مرغِ سحر چھوڑ دیا

خط نکلنے سے ہوا اور بھبھوکا چہرہ
حسن نے کاہ کو شعلے پہ مگر چھوڑ دیا

تو نے جس زور سے قاتل سرے کوچے کاٹے
بوالہوس نے ترے کوچے کا گذر چھوڑ دیا

قتل کرتا رہا اغیار کو قاتل ناسخ
نہ کوئی ہاتھ سروہی کا ادھر چھوڑ دیا

۴۹

جب خرامِ ناز کو تو اے پری پیکر اٹھا
ہر قدم پر جانے گرد اگر فتنۂ محشر اٹھا

آپ میں دیوانہ پھوڑے ڈالتا ہوں اپنا سر
دستِ نازک سے نہ مجھ پہ اے صنم پتھر اٹھا

طرفہ گل اس باغ میں ہیں اور شبنم ہے عجیب
ہنس کے بیٹھا جو تری محفل میں وہ رو کر اٹھا

ہو صفائے دل کے آگے خاک آئینے کی قدر
میری محفل سے سکندر ہو کے اسکندر اٹھا

پاؤں اٹھ سکتے نہیں ، کیا جاؤں کوئے یار کو
ہاتھ اپنی زیست سے اب اے دلِ مضطر اٹھا

دشمنِ سر ہے تری گردن کشی مانندِ شمع
افسرِ زر شوق سے رکھ، پر نہ اتنا سر اُٹھا

کردیا ہے یادِ چشم و گردنِ جاناں نے مست
سامنے سے ساقیا اب شیشہ و ساغر اُٹھا

مجھ سے ہلواتا ہے اب لیزم جنوں زنجیر کی (کذا)
اور کوہِ عشق کے کہتا ہے تو مگدر اُٹھا

زندگی[1] میں صرف کرتا ہوں سبکدوشی حصول
مثلِ قاروں خاک میں جا کر نہ بارِ زر اُٹھا

چاہیے تعمیرِ دل جو ساتھ اٹھا لے جائے گا
یوں خرابی کے لیے دیوار اٹھا یا در اُٹھا

ہوں وہ بیخود گر اڑائی خاک وحشت میں کبھی
تو یہی سمجھا غبارِ توسنِ دلبر اُٹھا

بات جن نازک مزاجوں سے نہ اٹھتی تھی کبھی
بوجھ اُن سے سیکڑوں من خاک کا کیونکر اُٹھا

مصحفِ رخ کا جو بوسہ لے کے میں منکر ہوا
مجھ سے کہتا ہے کہ اب قرآن تو سر پر اُٹھا

خاک میں ملتی ہے غیرت روندتے ہیں ہم کو غیر
اس گلی سے بس ہماری خاک اے صرصر اُٹھا

کیا سخن سنجی سے حاصل جب سخنداں ہی نہیں
زانو نے فکرت سے اے ناسخ تو اپنا سر اُٹھا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع ہدی : ''زندگی میں صرف کرتا ہو'' -

۵۰

ماجرا ہر بحر میں ہے چشمِ دریا بار کا
کیا عجب ڈوبے سفینہ گر مرے اشعار کا

کر دیا موقوف خط نے جورِ زلفِ یار کا
خط نہ سمجھو یہ لکھا ہے کوئی افسوں مار کا

عاملوں نے اُس پہ آسیبِ پری ثابت کیا
پڑ گیا جس شخص پر سایہ تری دیوار کا

اتنی راحت طالع واژوں کی قسمت میں نہ تھی
لے گیا ہے خواب میرے دیدۂ بیدار کا

خوف کیا مجھ کو ہو آسیبِ بلائے ہجر سے
ڈنڈ پر تعویذ کے بدلے ہے نامہ یار کا

کیوں نہ کھٹکوں آسماں کو رات دن میں ناتواں
آبلے کی شکل اُس میں، مجھ میں عالم خار کا

دستگیری[1] ایسی افتادوں کی ہے منظورِ طبع
خاک پر گرتا نہیں سایہ مری دیوار کا

رات بھر ہر ایک اختر سے لڑا کی میری آنکھ
تھا تصور دل میں تیرے رخنۂ دیوار کا

تیرے رستے سے جو گذرا اے پری مجنوں ہوا
داغِ سودا ہے فقط سودا ترے بازار کا

نکتہ چیں چنتا ہے تنکے دیکھ کر دیواں مرا
نقشِ افسوں گر ہر اک پتّا ہے اس گلزار کا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع ہندی :
"دستگیری ایسی افتادوں کو ہے منظورِ طبع"

جھولتی ہے عرش پر تلوار کس قاتل کی آج
ہے تصور دل میں کس کے ابروِ خمدار کا

دور سے دے گی دکھائی روشنی جائے سواد
یاد رکھ قاصد نشاں ہے یہ دیارِ یار کا

مانعِ صحرا نوردی پاؤں کی ایذا نہیں
دل دکھا دیتا ہے میرا ٹوٹ جانا خار کا

بن گیا ہے دید کے آزار سے تارِ نگاہ
دیکھنا ممکن نہیں ناسخ کے جسمِ زار کا

۵۱

وحشتِ[1] دل میں ہوں دیوانہ تری تاخیر کا
چشمِ آہو بن گیا حلقہ ہر اک زنجیر کا

دوستوں کے سر کیے چن چن کے مقتل میں قلم
چشم بینا ہے ہر اک جوہر تری شمشیر کا

میری قسمت میں ہے بربادی عجب کیا ہے اگر
کاغذِ بادی بنے کاغذ مری تصویر کا

گلشن کوئے بتاں کا ہے جو زنداں میں خیال
نغمۂ بلبل ہے ہر نالہ مری زنجیر کا

کچھ نہیں پروا مجھے دشمن اگر ہے عیب جو
خوف کیا شیرِ نیستاں کو ہے آہوگیر کا

نیک یا بد کوئی دنیا میں ہوا مجھ سے نہ کام
سادہ کاغذ ہے مگر نامہ مری تقدیر کا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی :
"وحشتِ دل ہوں میں دیوانہ تری تاثیر کا"

پہنچے ہم آتش زبانوں کو ضرر دشمن سے کیا
شمع کو کرتا ہے روشن تر ستم گل‌گیر کا

لاغر ایسا ہوں کہ میں اکثر ہوا سے اڑ گیا
میرے پیکر میں ہے عالم کاغذِ تصویر کا

اہلِ[1] جنّت کی بدولت ہوتی ہے منعم کی قدر
مرتبہ بے مس ہے یکساں خاک اور اکسیر کا

برسوں گزرے ہیں صدا باہر نکل سکتی نہیں
ہے ہمارا ضعف دربانِ خانۂ زنجیر کا

ناتوانی سے ہنسو اے ظالمو ! مانگا کرو
دیکھ لو اک بال ہے بازو شکن شمشیر کا

شمع ساں جلتے ہیں بعد از مرگ اپنے استخواں
کام منقارِ ہما کرنے لگی گل گیر کا

شکل اُس کی ایسی ہے دلچسپ گر پڑ جائے عکس
تا قیامت آئنے میں شبہ ہو تصویر کا

وہ تصور پیشہ ہوں گر ہو مری تربت پہ نخل
ہو ورق ہر برگ کی جا یار کی تصویر کا

کون عالم کے مرقع میں ہے مجھ سا بے ثبات
رنگ اُڑ جاتا ہے کھنچتے ہی مری تصویر کا

لکھتے ہیں مضمونِ سوزِ داغِ دل ہم رات دن
کام کرتا ہے ہمارا خامہ آتش گیر کا

بن گیا بت جو لگا عشقِ بتاں میں مجھ کو سنگ
نالۂ ناقوس پر نالہ ہوا زنجیر کا

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی : "اہل حاجت کی بدولت" ۔

کیا ہے کبرِ مدّعی میری تواضع کے حضور
سرکشی دم میں مٹا دیتا ہے خم شمشیر کا

اے مصور سوزِ غم کی بھی رعایت چاہیے
خاکِ گلخن سے بنا گردہ مری تصویر کا

کھیلتا ہوں اس سے مرغانِ[1] خیالی کا شکار
کام وقتِ فکر لیتا ہوں قلم سے تیر کا

ہے دلیلِ مرگِ انساں واقعی موئے سفید
کوہکن کی موت تھی انجام جوئے شیر کا

کس[2] کے عارض کے تصور میں فنا ہوں آج میں
ہے دھواں مہتاب میرے نالۂ شبگیر کا

لاغر ایسا ہوں کسی کو میں نظر آتا نہیں
چاہیے مانی! ورق سادہ مری تصویر کا

اس خرابے میں بنایا جس نے گھر، دیوانہ ہے
دیکھ ہر دروازے پر ناسخ نشاں زنجیر کا

۵۲

خضر کو اس نے بامردی کے آگے لنگ ٹھہرایا
کہ جس نے ہر نفس کو قاطعِ فرسنگ ٹھہرایا
ملاقاتِ دو روزہ کو یہاں آئے تھے ہم، لیکن
سرائے دہر کو سب نے مقامِ جنگ ٹھہرایا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : "مرغانِ معانی" ۔

۲- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"کس کے عارض کے تصور میں ہوں نالاں آج میں"

اجل[1] سے ہوں گے غافل جن کو ہے دعوائے سلطانی
تو گویا تختۂ تابوت کو اورنگ ٹھہرایا

فلک نے جب کہ تیرے حسنِ عالم سوز کو تولا
تو کوہِ طور کو میزان[2] میں پاسنگ ٹھہرایا

کدورت اپنے چہروں کی نظر آتی ہے لوگوں کو
تماشا ہے کہ آئنے آئنے میں زنگ ٹھہرایا

بنے ہیں صاحبِ غیرت پہن کر آتری پوشاکیں
رہے غیرت سے جو عریاں انھیں بے ننگ ٹھہرایا

وہ بے رنگی کہ بے رنگی بھی جس کو کہہ نہیں سکتے
اسے بھی سب نے اپنے وہم میں اک رنگ ٹھہرایا

چراغِ گور کو غفلت سے میں سمجھا رخِ روشن
شبِ تارِ لحد کو گیسوئے شب رنگ ٹھہرایا

مجھی پر دم بہ دم پڑتی ہے محفل میں جو اے ناسخ
مگر تیغِ نگاہِ یار نے چورنگ ٹھہرایا

۵۳

تو نزاکت سے گلستاں تک جو رخصت مانگتا
رنگ روئے گل سے اڑنے کی اجازت مانگتا

جو[3] تری انگلی ہے فندق سی وہ شمع طور ہے
تو اگر ہوتا یدِ بیضا سے بیعت مانگتا

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع نولکشوری :
"اجل سے ہو کے غافل جن کو ہے دعوائے سلطانی"

۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع نولکشوری :
"تو کوہِ نور کو میزاں میں بس پاسنگ ٹھہرایا"

۳۔ مصطفائی اول و دوم اور نسخۂ مطبع نولکشوری میں یہ شعر چوتھا ہے ۔ (مرتب)

آگے کشتِ آرزو کے آبرو میری رہی
برق ہی گرتی جو میں بارانِ رحمت مانگتا

اس گنہ پر[1] منتقم دوزخ میں مجھ کو ڈالتا
کوچۂ جاناں کے ہوتے گر میں جنّت مانگتا

یہ تڑپنے میں مزہ مجھ کو ملا ہے بعدِ ذبح
موت سے ملتی تو اور اک دم کی مہلت مانگتا

ہے یقیں زہرِ ہلاہل مجھ کو دیتے آشنا
گر میں حالِ نزع میں بھی جامِ شربت مانگتا

غیرِ حسرت لے گیا یاں سے کوئی کیا اپنے ساتھ
آسماں سے کس توقع پر میں دولت مانگتا

ہاتھ اٹھا کر دونوں عالم سے خدا کے سامنے
کیا میں اس وحشت سرا میں غیرِ وحشت مانگتا

گر طلب فوج و نشاں کرتا تو ملتے اشک و آہ
ہاتھ آتی سینہ کوبی گر میں نوبت مانگتا

ہوں وہ عریاں شوق لکھنے کا اگر ہوتا مجھے
حرف بھی استاد سے میرا نہ خلعت مانگتا

موجِ آبِ زندگی سے کام لیتا تیغ کا
خضر بھی ملتا تو میں جامِ شہادت مانگتا

گر نہ ہوتا سرخرو اشکِ غمِ شبیر[2] سے
حشر میں کس منہ سے ناسخ میں شفاعت مانگتا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم : ''اس گنہ سے'' ۔

پسِ جنازۂ لیلیٰ یہ کہتا ہے جرس دل کا
ہمارا پردۂ غفلت ہی بس پردہ ہے محمل کا

یہ لفظِ گل تو رسمِ خط میں نقطے سے معرّا ہے
گلِ رخسار پر خالق نے کیوں نقطہ دیا تِل کا

لگے جو تیر پھر باہر نہ نکلنے عشق مژگاں میں
بتائے کوئی تیر انداز گر تو وہ مری گل کا

گِنا کرتا ہے کتنے بے گناہوں کا کیا ہے خوں
جو اُس کو مشغلہ ہے رات دن عقدِ انامل کا

نہ دہشت محتسب کی ہے، نہ منت مے فروشوں کی
یہاں ہے نشہ آنکھوں میں شرابِ شیشۂ دل کا

نظر آتا ہے جو کوئی طلب کرتا ہے دل اُس سے
ترے دستِ حنائی میں ہے عالم دستِ سائل کا

کہاں ہوتی ہے رویا میں تمیزِ خواب و بیداری
نہاں ہے اہلِ غفلت سے معمّا حق و باطل کا

تڑپ کر ایک دم آرام آ جاتا ہے کیا اُس کو
مجھے کرتا ہے بسمل سرد ہونا مرغِ بسمل کا

وہ گریاں ہوں یقیں ہے سال ہا بے آب ہی چھوٹے
بنائیں گر کھلونے والے فوّارہ مری گِل کا

صدا یوں سینہ کوبی میں ہے یاں زنجیر گردن کی
سماں ہو دف زنی میں جیسے آوازِ جلاجل کا

ترے جلوے سے ایسا ہر کتابی رو کا منہ اُترا
کہ گویا مصحفوں میں ہو گیا عالم حمائل کا

یقیں ہے ایک دن مانندِ مضموں بالدھے جائیں گے
نہیں دزدانِ مضموں کو خطر سلطانِ عادل کا

ازل سے عشق کی دولت ہے دیوانوں کی قسمت میں
ملی[۱] ہے عقل لیکن بخت برگشتہ ہے عاقل کا

تنزّل میں ترقی ہے، ترقی میں تنزّل ہے
تماشا دیکھ غافل ماہِ نو کا ماہِ کامل کا

ملے گا رزق تقدیری، کروں تدبیر کیا ناسخ
وہ[۲] ہرزہ ہے ارادہ جو کرے تحصیلِ حاصل کا

۵۵

پڑا عکس آب جُو میں خنجرِ ابروے قاتل کا
دکھائے گا ابھی ہر گل تڑپنا مرغِ بسمل کا

رقم کرتا ہوں مضموں خنجرِ ابروئے قاتل کا
صریرِ کلک نالہ ہے گلوئے مرغِ بسمل کا

بلائے جاں ہوا ہے عشق اک زہرہ شمائل کا
گروں جا کر، نشاں کوئی بتائے[۳] چاہِ بابل کا

نہیں کچھ آج میں پابند زلفوں کی سلاسل کا
ازل سے خانۂ زنجیر میں آئینہ ہے دل کا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی : ''ملی ہے عقل'' ۔
۲۔ مصطفائی طبع دوم : ''و ہرزہ'' ۔
۳۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی : ''بتاوے'' ۔

تصوّر بندھ گیا ایسا خطِ رخسارِ قاتل کا
کہ جوہر بن گیا گویا مرے آئینۂ دل کا

اثر میرے جنوں کا اس قدر ہے بعدِ مردن بھی
کھلونے والے سب مجنوں بناتے ہیں مری ِگل کا

عیاں ہو شان سے کیونکر نہ کوہِ طور کا عالم
برنگِ صاعقہ ہے ہر شرارہ تیغِ قاتل کا

حضورِ گردنِ ساقی ہر اک شیشے کی گردن میں
نظر آنے لگا عالم گلوئے مرغِ بسمل کا

جنھیں تقطیعِ شعر آتی ہے یہ مصرع سمجھتے ہیں
ہے موزوں یہ مہِ نو مطلعِ ابروئے قاتل کا

جہاں میں جو حسیں ہے تجھ سے کسبِ نور کرتا ہے
چراغ آگے ترے اے مہ جبیں کاسہ ہے سائل کا

برنگِ لالہ اُس گل کا نہیں کچھ آج دیوانہ
ازل سے داغِ سودائی[1] سویدا ہے مرے دل کا

کبھی رنگِ حنا کی ہو نہ حاجت پائے جاناں کو
بنے گر سنگ پا میرے دلِ خوں گشتہ کی سل[2] کا

خیال اُس سرو قامت کا جو آیا کنجِ زنداں میں
برنگِ طوقِ قمری ہے ہر اک حلقہ سلاسل کا

ترے رخسارِ تاباں کا کبھی جو عکس پڑتا ہے
فریم آئینے کے بنتے ہیں ، ہالہ ماہِ کامل کا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"ازل سے داغ سودا ہے سویدائی مرے دل کا"
۲- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"بنے گر سنگ پا میرے دلِ خوں گشتہ کے گل کا"

کیا دروازہ بند اس نے سنا جو دور سے نالہ
مری آواز میں بھی ہے اثر آوازِ سائل کا

دل اپنا جان سے غافل ہے ضعفِ تن سے نالاں ہے
جرس کو کچھ نہیں پروائے لیلٰی غم ہے محمل کا

ملی جب خاک میں لیلٰی، کہا مجنوں نے حسرت سے
تمنا تھی غبار اپنا ہوا گردوں[1] ہو محمل کا

تپ غم کے اثر سے گرم ہو جاتا ہے بے آتش
جو مفلس ہیں بناتے ہیں اجاغ اکثر مری گل کا

محبت گلشنِ عالم میں جنسیت کی[2] لازم ہے
نہ کیوں اس سرو پر عاشق صنوبر ہو مرے دل کا

تعجب کچھ نہیں ہے انقلابِ دہر سے اس کا
بنائیں کاسۂ سائل اگر سلطان کی گل کا

ہوا ہر گل چمن میں تیرے آنے سے[3] یہ دیوانہ
کہ آوازِ شکستِ رنگ ہے نالہ سلاسل کا

لبِ ساقی کے بوسوں کی گزک ہو گر نہ اے ناسخ
شرابِ زندگی میں ہے مزہ زہرِ ہلاہل کا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مہدی:
"تمنا تھی غبار اپنا ہلا گرداں ہو محمل کا"

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مہدی: "جنسیت سے لازم ہے"۔

۳۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مہدی:
"ہوا ہر گل چمن میں تیرے آتے ہی یہ دیوانہ"

۵٦

باغ میں رولدے بہت پھولوں کے خرمن زیرِ پا
لا کبھی اپنے شہیدوں کے بھی مدفن زیرِ پا

یہ اثر تیری حنا کا ہے کہ کانِ لعل ہو
ایک دم آ جائے گر ہیرے کی معدن زیرِ پا

ہاتھ دوڑائے زمیں سے سو شہیدِ ناز نے
آگیا چلنے میں قاتل کا جو دامن زیرِ پا

گلشنِ تصویرِ قالی تیرے اٹھ جانے کے ساتھ
صورتِ مرگِ چمن کرتا ہے شیون زیرِ پا

اس کے تلووں کی نزاکت کا کروں میں کیا بیاں
روئیں ہیں قالین کے مانندِ سوزن زیرِ پا

دیں گے تیرے بازوے نازک کو پھر تکلیفِ تیغ
لائیو اپنے شہیدوں کے نہ مدفن زیرِ پا

آج چھو سکتا نہیں کوئی بھی اس کو ہاتھ سے
ایک دن روندیں گے سب تیرا یہی تن زیرِ پا

خاک پر رکھے حنائی پا برہنہ تو اگر
پنج شاخہ نقشِ پا کی جا ہو روشن زیرِ پا

خاکِ صحرا چھانتا پھرتا ہوں اس غربال میں
آبلوں میں کردیے کانٹوں نے روزن زیرِ پا

زلفِ جاناں یاد آئی ہے جو صحرا میں مجھے
جادۂ صحرا ہوئے ہیں مارِ رہزن زیرِ پا

سنگِ مقناطیس کی ہو لوح میری قبر پر
یاد کا رکھتا ہے توسن نعلِ آہن زیرِ پا

اس[1] عمارت کو نہ تو سر پر اٹھا لے جائے گا
دیکھ اے غافل ذرا تیرا ہے مسکن زیرِ پا

رقص میں آتی نہیں ہے ان کے گھنگرو کی صدا
کرتے ہیں آسودگانِ خاک شیون زیرِ پا

دیکھ کر اس سرو کو حسرت سے ہولیں قمریاں
طائرِ رنگِ حنا کا ہو نشیمن زیرِ پا

سرو[2] دیکھیں گے جو اس سروِ خراماں کا خرام
پھر نہ ٹھہرے گی زمینِ صحنِ گلشن زیرِ پا

دوستوں کے روندتا ہے دل پہن کر کفش تو
اے پری کہنا ہے زیبا تجھ کو دشمن زیرِ پا

ہوں میں وہ بے خود ہے[3] دفعِ صداع و آبلہ
گر حنا سر پر ملی ناسخ تو چندن زیرِ پا

۵۷

ضعف ہے راہِ طلب میں جب سے دامن گیرِ پا
آتی ہیں رگ ہائے پا مجھ کو نظر زنجیرِ پا

حاملانِ عرش چھوڑیں غش میں آ کر ساقِ عرش
وہ سراپا نور دکھلائے اگر تنویرِ پا

۱- یہ شعر نسخۂ مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجدی میں مؤخر ہے - (مرتب)

۲- یہ شعر نسخۂ مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجدی میں مقدم ہے - (مرتب)

۳- یہ شعر نسخۂ مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجدی میں مقدم ہے - (مرتب)

پھٹنے دو سر مجھے ، پھرنے دو مجھ کو دشت دشت
میرے ہاتھوں کی کرو کچھ فکر نہ تدبیرِ پا

لے چلے ہیں کوئے جاناں سے یہ وحشت میں مجھے
وادیٔ پُرخار پر موقوف ہے تعزیرِ پا

قدر اُس کے سر کی سوچو ہوتی ہیں وہیں فدا
راہ میں جھکتی ہیں آنکھیں دیکھنا توقیرِ پا

جا کے کوئے یار میں سجدہ نہ کرنے پائے ہم
ہے بجا تقدیرِ سر پر گر ہنسے تقدیرِ پا

رہ گزارِ یار سے آگے نہیں اٹھتے قدم
نقشِ پائے یار کر لیتے ہیں کیا تسخیرِ پا

بزم میں فانوس کیا آئینۂ تصویر ہے
شعلہ ہے تصویرِ فندق ، شمع ہے تصویرِ پا

سر ثقلمت سے پڑا رہتا ہے اپنا پاؤں پر
کاکلِ سر ہو گئی ہے ان دنوں زنجیرِ پا

تیرے[1] کوچے میں قدم رکھنے کا مجھ پر ہے گناہ
سر مرا کیوں کاٹتا ہے ، چاہیے تعزیرِ پا

قامتِ جاناں سے پیچھے ہم سری کر لیجیو
سر اٹھا[2] کر پہلے دیکھ اے سرو تو شہتیرِ پا

کوئے جاناں سے نکلنے کا کیا میں نے جو قصد
سو گئے اٹھنے سے پہلے دیکھنا تزویرِ پا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجیدی :
"تیرے کوچے میں قدم رکھنے کا ہے مجھ پر گناہ"

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجیدی : "سر جھکا کر" ۔

سبز سے سرخ ایک دم میں ہو گیا رنگِ حنا
اس قدر رکھتا ہے ناسخ وہ پری تسخیرِ پا

۵۸

سمجھ کے خس نہ مجھے کو جہاں سے پاک کیا
ہزار طور کو اس نے جلا کے خاک کیا
ہوئی جو صبحِ شبِ وصل ، جان ڈوب گئی
قضا نے چشمۂ خورشید میں ہلاک کیا
نہ خطِ جادہ سمجھ اس کو میں نے وحشت میں
برنگِ جیب یہ دامانِ دشت چاک کیا
ترے جلانے کو اے سنگ دل صنم ہم نے
اک اور صاعقۂ طور سے تپاک کیا
خبر کلال کو سرگشتگی کی تھی ناسخ
جو میری خاک سے تیار اس نے چاک کیا

۵۹

پاؤں کو دیوارِ زنداں میرا دامن ہو گیا
ناتوانی سے گریباں طوقِ گردن ہو گیا
تیرِ غم سے دل مشبّک ہو کے ایسا خوش ہوا
سمجھے ہم کوئی درِ جاناں میں روزن ہو گیا
دل تو کیا پتھر بھی تیرے عشق میں ہیں بیقرار
بت کدے میں ہر صنم سنگِ فلاخن ہو گیا
جائے گل ، بے یار ، انگارے نظر آنے لگے
پیش ازیں گلشن جو تھا اب مجھ کو گلخن ہو گیا

دستِ رنگیں یاد آئے گر شبِ تاریک میں
پنج شاخہ سامنے آنکھوں کے روشن ہو گیا

راگ جو گانے لگا مطرب شبِ فرقت میں ہائے
آتے آتے میرے کانوں تک وہ شیون ہو گیا

آنکھیں نرگس، چہرہ گل، گیسو ہیں سنبل، سروقد
عکس سے آئینہ خانہ صاف گلشن ہو گیا

پاؤں پھیلائے ہیں جادوں کی طرح ہر خاک نے
اب گریباں اے جنوں صحرا کا دامن ہو گیا

موت نے تیغِ زبانِ خلق سے دی ہے نجات
کہتے ہیں جس کو کفن وہ مجھ کو جوشن ہو گیا

کیجیے حاصل پھر ان آتش رخوں سے کوئی داغ
بے چراغ ان روزوں اپنا خانۂ تن ہو گیا

روند ڈالا عالمِ بالا کو خوب اے شہ سوار
ماہِ نو بھی ایک نقشِ نعلِ توسن ہو گیا

گر قناعت ہو تو نانِ خشک ہے نعمت دلا
دیکھ لے پانی چراغِ گل کو روغن ہو گیا

کردیا کاہیدہ ایسا رنجِ راہِ عشق نے
چاہِ[1] رہ ناسخ مجھے چیونٹی کا روزن ہو گیا

۶۰

پیشتر سر سے یہاں ہوتے ہیں ساماں پیدا
کھانے[2] کے وقت سے پہلے ہوئے دلداں پیدا

۱- مصطفائی طبع اول :
"چاہ رہ ناسخ مجھے چوہے کا روزن ہو گیا"

۲- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع پھدی :
"کھانے کے وقت سے اول ہوئے دنداں پیدا"

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

اے شبِ ہجر نہ اٹھوا مرے دستِ فریاد
صبحِ محشر نہ ہو تا[1] چاکِ گریباں پیدا

خارِ غم میں نے جو پنہاں ہی رکھے ساری عمر
میری تربت سے ہوئے خارِ[2] مغیلاں پیدا

گر نہیں ہے وہ پری کیوں ہے بھبھوکا ایسا
کہ خدا نے تو کیے خاک سے انساں پیدا

ہم ضعیفوں کو کہاں آمد و شد کی طاقت
آنکھ کی بند، ہوا کوچۂ جاناں پیدا

صدمہ دل کو جو ہوا نالۂ سوزاں نکلا
جس طرح سنگ سے ہو آتشِ پنہاں پیدا

سنگِ کہسار برائے سرِ شوریدہ بنے
ہوئے پاؤں کے لیے خارِ بیاباں پیدا

ہوں میں بیمار گیا غیر کے دل کا دھڑکا
کی مرے درد نے خاصیتِ درماں پیدا

طلبِ آتشِ حسنِ ازلی میں ہوں وہ گرم
کہ ہوا مضغۂ دل سینے میں بریاں پیدا

اس پری رو کو جو ارسال کروں نامۂ شوق
بیضۂ مور سے ہو مرغِ سلیماں پیدا

۱- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع ہدی:
"صبح محشر نہ ہو تا چاک گریباں پیدا"

۲- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع ہدی:
"میری تربت سے ہوئے نخلِ مغیلاں پیدا"

اس طرح خاک سے وہ چہرۂ پرنور بنا
ظلمتِ شب سے ہو جیسے مہِ تاباں پیدا

تو ہے خورشید، ستارے ہیں حسینانِ جہاں
تیرے پرتو سے ہوا تھا مہِ کنعاں پیدا

بدلے تاروں کے اسی چاند کو میں نے دیکھا
آنکھ کھلتے ہی ہوا جلوۂ جاناں پیدا

آشیاں میرے چمن میں جو لگائے آ کر
بیضۂ زاغ سے ہو مرغِ خوش الحاں پیدا

دل جو مجروح ہوا ہائے یہ رنگینی مضموں
نخلِ[1] گل جو ہو قلم گل ہوں دوچنداں پیدا

تیری ٹھوکر سے جو اے سروِ خراماں ٹوٹے
بیضۂ زاغ سے ہو کبکِ خراماں پیدا

شادی و رنج ازل سے ہے بہم میرے ساتھ
زخم کی طرح مرے لب ہوئے خنداں پیدا

روزِ مولد سے نہیں عیش و طرب قسمت میں
رمز[2] یہ ہے کہ بشر ہوتے ہیں گریاں پیدا

آدمی پر ہے تعلق کو جہاں میں سبقت
بعد کانٹوں کے ہوا گوشۂ داماں پیدا

دیکھ کر تجھ کو تناسخ کے مقر کہتے ہیں
دوسری بار ہوا ہے مہِ کنعاں پیدا

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجیدی:
"نخل گل ہو جو قلم گل ہوں دوچنداں پیدا"
۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجیدی: "رمز یہ ہے جو بشر" ۔

ہر شجر نے جو دیا باغِ جہاں میں اک پھل
شجرِ قد سے ہوا سیبِ زنخداں پیدا
چشمِ تر میں ہے یہ عالم مژۂ پرخوں کا
جس طرح بحر میں ہو پنجۂ مرجاں پیدا
میری زنجیر یہ کہتی ہے بآوازِ بلند
بعد مجنوں کے ہوا سلسلہ جنباں پیدا
کیوں نہ ہم عالمِ امکاں میں کریں ترک لباس
جبکہ خالق نے کیا ہو ہمیں عریاں پیدا
تا رہیں سجدۂ معبود میں للسخ مصروف
سر سے اس واسطے ہوتے ہیں سب انساں پیدا

٦١

غلط کہتے ہیں اس رخ کا ہوا خط بے رقم پیدا
کہ زلفوں کے ہوئے تھے اس کے لکھنے کو قلم پیدا
تری ہی رہگذر میں گبر و مومن کرتے ہیں سجدے
ترے نقشِ قدم سے ہو گئے دیر و حرم پیدا
بیابانِ طلب میں ہم ہیں ایسے خضر کے پیرو
زمیں کیا جس کا پتھر پر ہوا نقشِ قدم پیدا
فلوسِ داغِ یاس افلاس میں ہائے حسینوں سے
مقدم عشق سے کرتے تھے دینار و درم پیدا
عیاں ہے ہر حبابِ بحر سے کیفیّتِ دنیا
برائے چشمِ بینا ہیں ہزاروں جامِ جم پیدا
لبِ دریا اگر دھوئے وہ کافر اپنی زلفوں کو
تو سانپوں کی طرح ہر موجِ دریا میں ہو سم پیدا

مری آتش زبانی ہے خراب اس دورِ آخر میں
کیا اس شمع کو بزمِ جہاں میں صبح دم پیدا

فقط نقصاں نہیں ہے عاشقی میں کچھ بھی حاصل ہے
جو کم ہوتا ہے دل پہلو سے تو ہوتا ہے غم پیدا

کیا کرتا ہے گردوں بے نشاں بنیادِ ظالم کو
کہیں ہوتا نہیں شداد کا باغِ ارم پیدا

لگا اپنی کمر سے وہ دوپٹہ کھولنے اک دن
کو میں سمجھا ہوا یہ جادۂ راہِ عدم پیدا

جبیں کیونکر برہمن مارے سجدوں کے نہ گھس ڈالیں
ہوا ہے تیرے سنگِ آستاں سے ہر صنم پیدا

نہیں ممکن کہ کلکِ فکر لکھے شعر سب اچھے
برستا ہے بہت نیساں، گہر ہوتے ہیں کم پیدا

کجی روزِ ازل سے طینتِ موذی میں داخل ہے
کیا خالق نے ساتھ افعی کے لاسخ پیچ و خم پیدا

٦٢

میں اگر زینتِ فتراک کے قابل ہوتا
حلق میرا بھی تہِ خنجرِ قاتل ہوتا

گر سرِ زلفِ گرہ گیر نہ ہوتا مجھ کو
کیا گنہ تھا جو میں پابندِ سلاسل ہوتا

قیسِ نالاں کو رہا رخصتِ لیلیٰ میں نہ ہوش
اک جرس اور وگرنہ پسِ محمل ہوتا

شاخِ آہو ہیں بھویں، آنکھیں ہیں چشمِ آہو
مشکِ نافہ تھا، کوئی ناف میں گر تل ہوتا

بس میں ہوتا تمہیں پروانے نہ کبھی اے ناسخ
آہ میرا مرے قابو میں اگر دل ہوتا

۶۳

طرفِ زیست میں جاں باختہ مائل نہ ہوا
کچھ غمِ نازکیِ بازوئے قاتل نہ ہوا
لے چلی موت مجھے سوئے حسینانِ بہشت
ایک دم پاس جو وہ حور شمائل نہ ہوا
آتی ہے عالمِ بالا سے صدا ، مانگ سو دوں
امتحاں کو بھی میں لیکن کبھی سائل نہ ہوا
بارِ احسانِ فلک سے تو ملی آزادی
یہ بھی حاصل ہے اگر کچھ مجھے حاصل نہ ہوا
کان کو کھولے نسیمِ سحری نے ناسخ
تو بھی گل سامعِ فریادِ عنادل نہ ہوا

۶۴

کاوشیں اب تک چلی جاتی ہیں گو میں مر گیا
جانے گل کانٹے مری تربت پہ ظالم دھر گیا
سانپ جس کو سونگھ جاتا ہے وہ مرتا ہے ولے
زلف ہے وہ سانپ جس کو سونگھ کر میں مر گیا
قتل گہ سے جب چلا قاتل مرا سر کاٹ کر
دور تک پہنچانے کو لاشہ مرا بے سر گیا
اور طائر سے یہ ہوتی عرش پروازی کہاں
نسرِ طائر خط مرا اس ماہ کو لے کر گیا

گرچہ ہم بستر ہیں ہم تم پر بہم روٹھے ہوئے
آج کیا جوزا میں اپنے بخت کا اختر گیا

تو وہ شیریں ہے کہ تیرے حکم سے فرہاد ساں
بے ستونِ آسماں پر خسروِ خاور گیا

نکلے[۱] کیا اُس کے نشاں میں بے نشاں ہونے لگا
فوجِ غم نے مجھ کو گھیرا جب سے وہ لشکر گیا

مل گیا رستے میں تو بھاگا چھپا کر منہ کو ہائے
کہہ دیا کہہ دو نہیں ہیں گر میں اس کے گھر گیا

ہوں چراغ اُس بزم کا ناسخ کہ جس میں لاکھ بار
پُتلیوں کا عالمِ ہستی تماشا کر گیا

٦٥

خوب سا نظّارۂ قاتل تہہِ خنجر کیا
سر دیا لیکن مہمِ عاشقی کو سر کیا

تو نہیں ملتا تو ہم بھی تجھ سے اب ملتے نہیں
سنگ دل ہم نے بھی اپنے دل کو اب پتھر کیا

جیتے جی کیا ہو کمندِ بے قراری سے نجات
برق کو گردوں نے میرے بخت کا اختر کیا

روئے آتش ناک کے نظارے کی آئی نہ تاب
اشک سے گو سال ہا آنکھوں کو میں نے تر کیا

جانِ شیریں کب گئی ہے کوہکن کی رائیگاں
کہتے ہیں شیریں نے آخر آپ کو جوہر کیا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"نکلے کیا اُس کے نشاں ہونے لگا میں بے نشاں"

کب میں دین داری سے گذرا اس صنم کے عشق میں
جب کمر دیکھی، خیالِ موئے پیغمبر کیا
ہو گیا ضبطِ فغاں کے ساتھ سینہ چاک چاک
لاکھ در وا ہو گئے گر ہم نے بند اک در کیا
کون ہے جس کو نہیں اس صاحبِ عصمت کی یاد
گھر میں بیٹھے بیٹھے اک عالم کے دل میں گھر کیا
جوششِ مضموں سے طوفاں زا ہوئی ناسخ یہ بحر
کشتیٔ طبعِ رواں کو ہم نے اب لنگر کیا

٦٦

دم ہے بند آگے ترے تیغِ صفاہانی کا
قاتلِ خلق ہے عالم تری عریانی کا
جاؤں وحشت میں کہاں وادیٔ ایمن کے سوا
ہوں میں دیوانہ کسی چہرۂ نورانی کا
پہنچے کیا گوشہ نشینوں کو ضرر دشمن سے
آتشِ سنگ کو کچھ خوف نہیں پانی کا
کھینچتا تھا وہ بہت قامتِ جاناں کی شبیہ
حال آخر کو کیا دار نے کہا مانی کا
کس کے کوچے میں جبیں سا تو ہوا ہے ناسخ
چاند سا داغ ہے روشن تری پیشانی کا

٦٧

ساتھ اپنے جو مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر مجھ کو دلِ زار نے سونے نہ دیا

خواب ہی میں نظر آتا وہ شبِ ہجر کہیں
سو مجھے حسرتِ دیدار نے سونے نہ دیا
خفتگی بخت کی کیا کہیے کہ جز خوابِ عدم
عمر بھر دیدۂ بیدار نے سونے نہ دیا
مرگ اک سوتی تھی ورنہ یہ کراہا شب کو
کہ جہاں کو ترے بیمار نے سونے نہ دیا
یاد اُس زلف کی رہ رہ کے مجھے دلواتی
ہجر میں مجھ کو شبِ تار نے سونے نہ دیا
یہی صیّاد گلہ کرتا ہے میرا ہر صبح
نالۂ مرغِ گرفتار نے سونے نہ دیا
سمجھے تھے بعد فنا پائیں گے راحت ناسخ
حشر تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

٦٨

یاروں نے راحت عدم میں کی ، میں نالاں رہ گیا
قافلہ منزل پہ جا اترا ، جرس یاں رہ گیا
کی ادھر دل نے کشش ، کھینچا اُدھر سفّاک نے
ٹوٹ کر آخر مرے سینے میں پیکاں رہ گیا
میں درِ فردوس پر رضواں کو سمجھا اک رقیب
بعدِ مردن بھی خیالِ کوئے جاناں رہ گیا
عمر بھر وحشت میں گر صحرا نوردی کی تو کیا
سیر کے قابل جو تھا دل کا بیاباں رہ گیا
فصلِ گل میں بھی نہ زندانِ تعلق سے چھٹا
ناتوانی سے مرا طوقِ گریباں رہ گیا

روزِ روشن تیرہ بختی سے نہ دیکھا عمر بھر
شب کی شب گویا میں اس محفل میں مہماں رہ گیا

اشکِ بے تاثیر کو نادم کیا برسات نے
مینہ کے باعث رات میرے گھر میں جاناں رہ گیا

حسرتِ پابوسِ قاتل دل سے نکلی وقتِ قتل
تیغ کا ناسخ مرے سر پر یہ احساں رہ گیا

۶۹

اثر خونِ جگر میں کیا ہے آبِ زندگانی کا
نہیں مرتا میں فرقت میں پڑا ہوں سخت جانی کا

مزہ یہ تلخیِ فرقت میں ہے عیشِ زندگانی کا
چراغِ گور ہے ساغر شرابِ ارغوانی کا

کھلے دروازے ہر شب چین سے سوتے ہیں ہم جب سے
دیا ہے خانۂ ویراں کو عہدہ پاسبانی کا

غمِ فوتِ عبادت[۱] کب ہے ہم رندوں کو اے زاہد
یہاں ہر جامِ مے دریا ہے آبِ زندگانی کا

کبھی جو شیشۂ لبریزِ مے کی سرکشی دیکھی
تو عالم آ گیا یاد اپنی مستی اور جوانی کا

جگر پھٹتا ہے اک سو، اک طرف کو زخم پکتے ہیں
تردد خانۂ دل میں ہے غم کی میہمانی کا

کیا حق نے بخیر انجام میرا مے پرستی میں
ہوا لبریز مے سے جام میری زندگانی کا

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم: "عیادت"۔

کوئی لکھ کر اٹھاتا ہے جو اُن کو اٹھ نہیں سکتا
بندھا جن حرفوں میں مضموں ہماری ناتوانی کا
دہانِ زخمِ دل کے قہقہے بے طور ہیں ناسخ
تصور ہے تجھے کس کے لباسِ زعفرانی کا

۷۰

یہ نور ہے روئے مہ جبیں کا کہ ہو خجل چاند چودھویں کا
جو حلقہ ہے زلفِ عنبریں کا وہ ایک نافہ ہے مشکِ چیں کا
زبس کہ وصفِ دہانِ شیریں رہا ہے وردِ زبانِ شیریں
بدن میں جب تک ہے جانِ شیریں مزہ دہن میں ہے انگبیں کا
وہ چشمِ فتاں ہے غیرتِ مل، وہ زلفِ پیچاں ہے رشکِ سنبل
عذار میں ہے شباہتِ گل، بدن میں عالم ہے یاسمیں کا
یہ جوش پر یاں ہے اشک کا یم کہ ساتوں دریا ہیں قطرے سے کم
جسے کہ کہتے ہیں سب جہنم شرر ہے اک آہِ آتشیں کا
زبس کہ ہے جوشِ داغِ ہجراں، ہوا مرا سینہ باغِ رضواں
برائے گلگشت جائے غلماں خیال پھرتا ہے اک حسیں کا
یہ[1] ساعدوں کا ہے اُس کے عالم کہ جس نے دیکھا ہوا وہ بیدم
نیامِ تیغِ قضائے مبرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا
برا ہو بدبخت عاشقی کا، نہ دیں ہو برباد یوں کسی کا
ہنا ہے عشقِ بتاں کا[2] ٹیکا نشانِ سجدہ مری جبیں کا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع مجدی:
''یہ اُس کے ہے ساعدوں کا عالم کہ جس نے دیکھے ہوا وہ بیدم''
۲- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع مجدی: ''ہنا ہے عشقِ بتاں میں ٹیکا'' -

۱۰ اگر ہو پھاہا پرِ سمندر ، یقیں ہے ہو خاک دم میں جل کر
سنا جو ہو آفتابِ محشر کھرنڈ ہے داغِ آتشیں کا
طمع ہے انصافِ دوستاں سے کہ اتنا فرمائیں سب زباں سے
کیا ہے ناسخ نے آسماں سے بلند تر رتبہ اس زمیں کا

۷۱

جو دل ہی ٹوٹ گیا ، کیا ہو شعرِ تر پیدا
ہوئے ہیں شاخِ شکستہ سے کب ثمر پیدا

وہ نخل باغِ جہاں میں ہوں میں کہ ہوتی ہے
ہر ایک شاخ پہ دستۂ تبر پیدا

کیا ہے آتشِ غم نے سرا یہ خشک لہو
کہ مثلِ سنگ رگوں میں ہوئے شرر پیدا

چمن سے اڑ چلیں اس رشکِ گل کے کوچے میں
ہوئے ہیں اتنے لیے بلبلوں کے پر پیدا

شگفتہ غنچہ نہ جب تک ہو بو نہیں آتی
ہو چاک اگر دل تو ہو اثر پیدا

جو ہیں حسین وہ مفلس کبھی نہیں رہتے
گلوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے دیکھو زر پیدا

میں بے خبر ہوں مگر ہے جنونِ عشق نہاں
ہوئے ہیں داغ چھپانے کو موئے سر پیدا

یہ رنگت اس کی سنہری ہے گر نہائے کبھی
لیارے کریں حمام سے بھی زر پیدا

خدا سے کب ہوئی پوری مراد ظالم کی
چھپایا باغِ ارم کو کیا جو در پیدا

نہ داغِ یاس سے گھبرا ، بر آئے گی امید
گلوں کے بعد ہوا کرتے ہیں ثمر پیدا

پس از وفات بھی تاثیرِ گریہ باقی ہے
مرے غبار سے ہوتا ہے ابرِ تر پیدا

یہ سرکشی سے ہے افتادگی کی قدر بلند
کہ آگ سے ہوئے جن ، خاک سے بشر پیدا

وہ آفتاب ہے پرتو فگن ، عجب کیا ہے
ہمارے سنگِ لحد سے ہو لعل اگر پیدا

عدم سے جس نے کیا ہو وجود آبا کا
نہ امّہات سے ایسا ہوا پسر پیدا

بنا ہے خاک سے یوں آپ کا تنِ پُر نور
کہ جیسے ہو شبِ تاریک سے سحر پیدا

پناہ ملتی ہے خلقت کو مرگِ ظالم سے
جو کرگدن کو کریں قتل ، ہو سپر پیدا

جہاں میں جتنے تھے شیریں ادا ہوئے خونریز
یقیں ہے نیزے[1] ہوں اب جائے نیشکر پیدا

ستارۂ سحری ہے اگر ترا دُرِ گوش
ہوئی ہے تیری بناگوش سے سحر پیدا

لگے ہیں موتیوں کے پھل تو سونے کے پتے
ہوا جہاں میں نہ اس سرو سا شجر پیدا

بلائے چشم ہے حسن اور نغمہ آفتِ گوش
کریں وہ چین ، ہوئے ہیں جو کور و کر پیدا

۱- مصطفائی طبع اول و دوم : ''نیز میں ہوں'' -

خدا[1] کے کام کچھ آلات پر نہیں موقوف
ابوالبشر ہوئے بے مادر و پدر پیدا

ردیف بائے موحدہ

۷۲

اے شبِ غم اب نہیں اس کے سوا تدبیرِ خواب
چھٹ کے قیدِ زیست سے کرتے ہیں ہم تسخیرِ خواب

وصل کی شب سو گیا تھا میں سو غم نے عمر بھر
آنکھ پھر لگنے نہ دی میری پئے تعزیرِ خواب

عالمِ اسباب میں اسبابِ غفلت ہیں عزیز
خلق کی آنکھوں میں جا ہے دیکھنا توقیرِ خواب

بعد مدت خواب میں آیا جو وہ میں چونک اٹھا
یہ گناہِ بختِ خوابیدہ ہے اور تقصیرِ خواب

گر مسیحا کو نہیں میری عیادت کا خیال
پڑ گئی ہے کیا اجل کے پاؤں میں زنجیرِ خواب

میں نے خوابِ وصل کو اس سے کیا ہے جب بیاں
اس نے الٹی ہی سنائی ہے مجھے تعبیرِ خواب

طاقتِ جنبش شبِ فرقت کے صدموں سے نہیں
پنجۂ مژگانِ ترکیوں کر ہو دامن گیرِ خواب

یار سو جائے تو جاگیں طالعِ خفتہ مرے
وصل کی شب قتل کرتی ہے مجھے تاخیرِ خواب

۱- یہ شعر نسخۂ مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع بھدی میں مقدم ہے - (مرتب)

موج گوئی میں کھلے گر منہ ، ہے غفلت کی دلیل
بے بہ بے خمیازے اکثر لاتی ہے تاثیرِ خواب

اس کی مژگاں خواب میں دیکھی سحر بسمل اٹھا
ہو گیا پیغام اجل کا مجھ کو ناسخ تیرِ خواب

۷۳

ہے مری مستی کو عشقِ ساقیٔ کوثر شراب
رات دن پیتا ہوں میں بے شیشہ و ساغر شراب

خون[1] آتا ہے نظر صاف اس تنِ نازک سے یوں
جس طرح مینائے بلوری[2] میں ہو احمر شراب

ہے دلِ مجروح کی اس چشمِ میگوں پر شفا
کام مرہم کا کرے کیونکر نہ زخموں پر شراب

گرچہ ہوں میکش پر اے زاہد نہ کر غیبت مری
گوشت کھانے سے برادر کے تو ہے بہتر شراب

کانپتے ہیں اہلِ عصیاں دہشتِ تعزیر سے
رعشہ دار انسان کو کر دیتی ہے اکثر شراب

لذتِ عشرت ہوئی ہے تلخ کامی کب حصول
ذائقے میں دیکھ لو رکھتی ہے تلخی ہر شراب

مے کشی سے زاہدوں کو اس لیے انکار ہے
تا نہ ان بدباطنوں کے کھول دے جوہر شراب

۱- مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"خون نظر آتا ہے صاف اس کے تنِ نازک سے یوں"
۲- مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : "مینائے بلوریں" ۔

ہیں جو عالی ہمت اُن کو ہے کشی سے عشق ہے
آدمی کی عرش پروازی کو ہے شہپر شراب
ہوں نجس ہرچند لیکن پاک کر دے گا وہی
جس کی نزدیکی سے ناسخ ہوتی ہے اطہر شراب

۷۴

کیا تری الفت میں ہیں اک نالہائے عندلیب
ہے شکستِ رنگِ گل میں بھی نوائے عندلیب
مثلِ پروانہ جو اس محفل میں جائے عندلیب
آگ اپنے آشیانے کو لگائے عندلیب
تو ہے ایسا گل کہ تیرے نقشِ پا کی خاک کا
عارضِ گل کے لیے غازہ بنائے عندلیب
دستِ جاناں میں جو دیکھے طائرِ رنگِ حنا
اپنے سر پر بازوؤں سے خاک اڑائے عندلیب
ساعد و بازوئے جاناں ہیں برنگِ شاخِ گل
مرغِ دل کا دم پھڑکتا ہے بجائے عندلیب
ایک دم بیٹھی تھی وہ آ کر تری دیوار پر
چومتے ہیں غنچۂ گل آج پائے عندلیب
آج میرے داغ سے چھوٹا ہے پھاہا اے نسیم
ارمغاں لے جا یہ گلشن میں بجائے عندلیب
گر مشابہ تیری زلفوں سے نہ ہو اے رشکِ گل
دام میں کیوں آپ کو ناحق پھنسائے عندلیب
ہو چلا ہے خشک ہر گل رشکِ روئے یار سے
آب جو اشکوں کی گلشن میں بہائے عندلیب

چھوڑ دے گلشن میں اے صیاد اپنے دام سے
یہ زرِ گل ہے کفِ گل میں بہائے عندلیب

رشک آتا ہے سوتا ہے جو وہ گل میرے ساتھ
وصل کی شب کیوں نہ نالوں سے جگائے عندلیب

گل[1] یہ مرتے مرتے اس خورشید پر بھی غش ہوئے
اب تو گل قند آفتابی ہے دوائے عندلیب

تو[2] ہی وہ گل ہے کہ چھوتے ہی نشاں ہو ہاتھ کا
پڑتے ہیں کب روئے گل پر نقشِ ہائے عندلیب

ہے یہی مفہوم گل بانگِ صریرِ کلک سے
ہے ابھی باقی بہت سا ماجرائے عندلیب

۷۵

گر مژہ اس رشکِ گل کی دیکھ پائے عندلیب
آشیاں میں جائے گل کانٹے بچھائے عندلیب

تیری محفل وہ چمن ہے جس میں اے رشکِ چمن
عاشقوں کے ہوش اڑتے ہیں بجائے عندلیب

لغمہ سنج ایسا ہوں کھائے استخواں گر بعد مرگ
زاغ کی منقار سے نکلے نوائے عندلیب

۱- یہ شعر نسخۂ مصطفائی اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجدی میں مقدم ہے - (مرتب)
۲- یہ شعر نسخۂ مصطفائی اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجدی میں مقدم ہے - (مرتب)

داستاں صیاد و گل چیں کی فقط رہ جائے گی
نے[۱] ثباتِ گل ہمیشہ ، نہ بقائے عندلیب

باغ میں تجھ سے خجل ہو کر یہ ہر گل نے کہا
کاش مجھ کو اپنے شہپر میں چھپائے عندلیب

کردیا اُس گل کے پرتو نے جو دریا کو چمن
بلبلوں سے صاف آتی ہے صدائے عندلیب

عارضِ جاناں کے ہوتے گل پہ کیوں عاشق ہوئی
ہوگئی صیاد پر ثابت خطائے عندلیب

ہر کلی منقار ہے اُس رشکِ گل کے عشق میں
آتی ہے ہر شاخِ گلبن سے صدائے عندلیب

پیرہن کے میں نے کیا پرزے کیے تو ہے وہ گل
نوچ کر سب بال و پر اپنے اڑائے عندلیب

عاشقوں کی قدر معشوقوں سے ہوتی ہے زیاد
دیکھ لو گل سے زیادہ ہے بہائے عندلیب

شمع کے شعلے کو گر تشبیہ دوں گلبرگ سے
بزم میں گل گیر سے نکلے صدائے عندلیب

کب قفس میں صحنِ گلشن یاد آتا ہے اُسے
عارضِ صیاد ہیں حاجت روائے عندلیب

جام سے لبریز ہیں ساقی فقط مطرب نہیں
گل کھلے ہیں باغ میں ، خالی ہے جائے عندلیب

۱- مصطفائی طبع دوم - نسخۂ مطبع بھدی :
"ہے ثبات گل ہمیشہ نہ بقائے عندلیب"
مصطفائی طبع اول :
"ہے ثباتِ گل ہمیشہ نہ ثباتِ عندلیب"

ذبح[1] کر اس غیرتِ گلشن پہ مجھ کو وار کر
بس یہی صیاد سے ہے التجائے عندلیب
جل کے صحنِ باغ میں ایسی پڑھوں رنگیں غزل
آج ہر گل کو بھلادوں نغمہ ہائے عندلیب

۷۶

گر ترے دستِ حنائی دیکھ پائے عندلیب
شاخِ گل کو آہِ سوزاں سے جلائے عندلیب
راز پوشی کاش ہم کو بھی سکھائے عندلیب
نام شبنم کا ہو اور آنسو بہائے عندلیب
جائے گل دیکھوں الٰہی منہ کسی محبوب کا
ہے یہی ہر صبح گلشن میں دعائے عندلیب
نقشِ پا تیرا جو ہے اک گل وہ ہے اے خوش خرام
ہر صدائے پا ہے رشکِ نغمہ ہائے عندلیب
موسمِ گل ہو چکا، آئی خزاں، مر جائے گی
بھیج گلشن میں شبیہ اپنی برائے عندلیب
طوطیاں محوِ تکلم، کبک پامالِ خرام
آفتِ قمری ہے قامت، رخ بلائے عندلیب
اپنا[2] دل سا جانتا ہوں غیر کے بھی دل کا حال
سوئے گل ہرگز نہ دیکھوں بے رضائے عندلیب

۱۔ یہ شعر نسخۂ مصطفائی طبع اول و دوم و نسخۂ مطبع مجدی میں مقدم ہے۔ (مرتب)

۲۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجدی:
"اپنے دل سا جانتا ہوں غیر کے بھی دل کا حال
سوئے گل دیکھوں نہ ہرگز بے رضائے عندلیب"

تو وہ ہے پرکالۂ آتش جو گزرے باغ میں
پرتوِ رخ سے چراغِ گل جلائے عندلیب
چہرۂ[1] جاناں ہے گل ایسا کہ ہردم ہاتھ میں
طائرِ رنگِ حنا نالاں ہے جائے عندلیب
صحنِ گلشن میں دکھا کر قامتِ گل رنگ کو
تو اگر چاہے تو قمری سے لڑائے عندلیب
آتشِ گل سے جو اُس کو سینک دے اے باغباں
دور ہو جائیں ابھی سب درد ہائے عندلیب
جانتی ہے شاخِ گل صیاد تیرے ہاتھ کو
خود بخود کیوں تیرے قابو میں نہ آئے عندلیب
عازمِ سیرِ چمن گر ہو مرا گل پیرہن
توڑ کر پھولوں کو رستے میں بچھائے عندلیب
جامِ مے خنداں برنگِ گل ہیں ساقی بزم میں
ہے یقیں آئے بطِ مے سے صدائے عندلیب
ہر خیاباں میں ہزاروں ہی تڑپ کر مر گئیں
کیا وبا یہ موسمِ گل ہے برائے عندلیب
دیکھنا اُس گل کی بدذاتی نہ پہنچے تا جواب
مجھ کو لکھتا ہے ترا خط لے کے آئے عندلیب
موسمِ گل میں ہمیں تو داغ ہو افلاس کا
آگے آنکھوں کے زرِ گل یوں اڑائے عندلیب
قد وہ بوٹا سا ہوا نامِ خدا سروِ سہی
نغمہ سنجی قمریوں کی ہے بجائے عندلیب

۱۔ مصطفائی طبع اول و طبع دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی :
"چہرۂ جاناں ہے ایسا گل کہ ہردم ہاتھ میں"

وہ بھی جانے خارِ حسرت کی خلش ہوتی ہے کیا
صانعِ گلشن اب اس گل کو بنائے عندلیب

کیا جنوں پر زور ہو جاتا ہے تیرے عشق میں
دام[1] زنجیروں کے تھے اے گل برائے عندلیب

دیکھ کر گل کو حقارت سے وہ گل کہنے لگا
بس یہی ہے شاہدِ رنگیں قبائے عندلیب

بعدِ مُردن اڑتے پھرتے ہیں چمن میں بال و پر
عشقِ گل میں دیکھ اے ناسخ وفائے عندلیب

ردیف تائے فوقانی

۷۷

دشمنِ جاں ہے ہمارا پاسبانِ کوئے دوست
ہوجیے اب آشنائے ساکنانِ کوئے دوست

کس نے مجھ وحشی کے پھینکے ان کے آگے استخواں
اک سرے سے ہو گئے مجنوں سگانِ کوئے دوست

ہاتھ میں تیرے نہ ٹھہرے گا وہاں مکتوبِ شوق
یاد رکھ قاصد بڑا ہے یہ نشانِ کوئے دوست

لوٹتے ہیں خاک میں ، آنکھیں لگی ہیں سوئے بام
مرتے ہیں معراج پر افتادگانِ کوئے دوست

جی اٹھا مردہ ، جنازہ جو گیا اس راہ سے
کر چکی ہے خلق سو بار امتحانِ کوئے دوست

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہادی :
"دام زنجیروں کے بعد اے گل اڑائے عندلیب"

وصفِ جنت جب کیے واعظ نے منبر پر شروع
صاف میں سمجھا کہ کرتا ہے بیانِ کوئے دوست

کب ہے کعبے کا ادب ایسا کہ رکھتے ہی قدم
پاؤں اپنے چومتے ہیں رتبہ دانِ کوئے دوست

سارے عالم کو جو ہے بے اختیارانہ رجوع
مرکزِ عالم ہے شاید درمیانِ کوئے دوست

جو وہاں پہنچا وہی آگاہ اس عالم سے ہے
اور ہی کچھ ہے زمین و آسمانِ کوئے دوست

جو وہاں جانے لگا پہنچا کنارے گور کے
رہروِ ملکِ عدم ہیں رہروانِ کوئے دوست

خاک اے قاصد جوابِ خط کی ہو تجھ سے امید
کاٹتے ہیں اپنے کونچے سالکانِ کوئے دوست

اے اجل اب ساکنِ شہرِ خموشاں کر مجھے
کیا کروں ملتا نہیں کوئی مکانِ کوئے دوست

حاملانِ عرشِ اعلیٰ کے یہاں اڑتے ہیں ہوش
عرشِ اعلیٰ سے کہیں بالا ہے شانِ کوئے دوست

داغِ حسرت ہیں چراغِ دیر و قندیلِ حرم
کون جا دلکش ہے دنیا میں بسانِ کوئے دوست

غیر ہو شیطاں تو اپنا نعرہ ہو تیرِ شہاب
ایسے اے ناسخ ہیں ہم آتش زبان کوئے دوست

۷۸

اس چمن میں ہیں بے شمار درخت
ہو کہاں مثلِ قدِ یار درخت

وہ ترا سرو قد ہے بے سایہ
صدقے ہیں لاکھ سایہ دار درخت
میرے سوزِ دروں سے کیا نسبت
میں ہوں انسان اور چنار درخت
ہر روش پر ترے ہی مجرے کو
کھڑے ہیں باندھ کر قطار درخت
آنکھیں بادام ہیں ، زنخداں سیب
قدِ جاناں ہے میوہ دار درخت
شبنم افشاں نہیں ہے اے خوش قد
تیرے غم میں ہیں اشکبار درخت
ہیں وہ دیوانے ، ہیں جو اہلِ متاع
سنگ کھاتے ہیں باردار درخت
سوزِ دل سے زمیں جلتی ہے
سبز کیا ہو سرِ مزار درخت
سر اٹھائے جو باغ میں ہیں کھڑے
رکھتے ہیں تیرا انتظار درخت
سرو[1] و شمشاد ، سدرہ و طوبیٰ
صدقے اس قد پہ ہیں یہ چار درخت
فندقیں میوہ ، ہاتھ ہیں شاخیں
گل ہیں رخسار ، قدِ یار درخت
کبھی مجھ دل جلے کی تربت پر
سبز ہوگا نہ جز چنار درخت

---

(۱) یہ شعر نسخۂ مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع ہدی میں مقدم ہے ۔ (مرتب)

ہوں میں عاشق انار پستاں کا
ہوں[1] نہ تربت پہ جز انار درخت
آدمی کیا کہ تیرے فرماں سے
دوڑے[2] آتے ہیں لاکھ بار درخت
تا قیامت خلل نہیں فاسخ
نخلِ غم کیا ہے پائداد درخت

۷۹

ہے ترا قد وہ پائدار درخت
سجدے کرتے ہیں سایہ دار درخت
اُس کے بالوں میں کیوں نہ ہوں پتے
گلشنِ حسن کا ہے یار درخت
لے ہر اک شاخ کیوں نہ انگڑائی
دیکھیں اُس گل کا جب خمار درخت
نسبت اُس گل کو دوں[3] نہ گلبن سے
کہ یہ ہے ایک خاردار درخت
لاغر[4] ایسا ہوں میں کہ میرے لیے
ہے ہر اک خار سایہ دار درخت

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی : ''ہو'' ۔
۲- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی : ''دوڑے آئے ہیں'' ۔
۳- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی :
''نسبت اس گل کو دو نہ گلبن سے''
۴- یہ شعر نسخۂ مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع ہدی میں مقدم یعنی چوتھا ہے اور چوتھا شعر موخر یعنی پانچواں ہے ۔ (مرتب)

سرو آزاد سے ہیں شرمندہ[1]
سرنگوں ہیں جو بار دار درخت

دشت میں رخ جو سوئے سایہ کروں
مثل آہو کریں فرار درخت

نہیں جنبش ہوا سے یہ اے گل
تیرے غم میں ہیں بے قرار درخت

شجر طور کی طرح ہر روز
وہ[2] جلا دیتے ہیں ہزار درخت

آنکھیں نرگس ہیں ، رخ ہے گل ، قد سرو
ایسی پائیں کہاں بہار درخت

نہیں گرتے ہوا کے صدمے سے
تجھ پہ کرتے ہیں گل نثار درخت

مجھ کو شاخوں کی جا دکھاتے ہیں
ہجر کی تیغ آب دار درخت

کیا بزرگوں میں ہو ترقی خرد[3]
کہ یہ کہتے ہیں باردار درخت

باغ عالم میں بڑھ نہیں سکتے
زیر اشجار سایہ دار درخت

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخہ مطبع مجدی : ''شرمندے'' ۔
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخہ مطبع مجدی :
''وہ جلا رہتے ہیں ہزار درخت''
۳۔ ''خورد'' ۔

۸۰

زلفیں شاخیں ہیں ، قدِ یار درخت[1]
کون ایسا ہے مشک بار درخت

سایہ اس سرو کا رہے مجھ پر
پائیں جس دشت میں نہ بار درخت

کیا ہی خوش ہو کے چڑھ گیا منصور
دار گویا ہے میوہ دار درخت

تو نے مگدر ہلائے ، کیوں نہ کریں
باغِ عالم میں افتخار درخت

دلگ اس گل پہ باغ میں ہو کر
بن گئے سرو گل عذار درخت

باغ کو جاؤں یادِ زلف میں کیا
شاخیں رکھتے ہیں مثلِ مار درخت

بھولے رم دیکھ کر تری آنکھیں
آج آہو ہیں شاخ دار درخت

تنِ عریاں شکفتہ داغِ جنوں
ہوں میں گویا شگوفہ دار درخت

سرو ہے میل چشمِ قمری میں
ہیں[2] ترے عشق میں نزار درخت

۱۔ نسخہ لول گشور طبع دوم میں یہ غزل مسلسل چھپی ہے البتہ نسخہ مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخہ مطبع مجدی میں علیحدہ شائع ہوئی ہے ۔ (مرتب)

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخہ مطبع مجدی :
”ہیں ترے عشق میں یہ زار درخت“

میری تربت پہ نخلِ شمع کی طرح
پھولوں کی جا ہیں شعلہ دار[1] درخت

تجھ پہ مثلِ انارِ آتش بار[2]
جلے اے سرو قد ہزار درخت

نخلِ تن یاں ہمیشہ ہے پُر داغ
پھول لاتے ہیں ایک بار درخت

ہوئے آب آب مثلِ فوّارہ
دیکھ کر سرو قدِ یار درخت

بھاگا دریا یہ میرے اشکوں سے
ہو گئے وار تھے جو پار[3] درخت

پرورش پائی میں نے صحرا میں
جائے دایہ تھے شیر دار درخت

بخل سے گر کریں نہ شاخیں بلند
کھائیں پتھر نہ میوہ دار درخت

کوئے قاتل وہ باغ ہے جس میں
سرِ منصور پھل ہے، دار درخت

باغِ شدّاد شرم سے ہے نہاں
کہ نہ تھا مثلِ قدِّ یار درخت

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مہدی :
"پھولوں کی جا ہیں شعلہ بار درخت"

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مہدی : "آتش باز" ۔

۳۔ مصطفائی طبع دوم ۔ نسخۂ مطبع مہدی :
"ہو گئے وار، تھے جو پار درخت"

کوئے جاناں سے باغ میں جو گئی
لگے کرنے صبا کو پیار درخت

کھول کر ہاتھ اپنی شاخوں کے
ہوئے رہ رہ کے ہم کنار درخت

ردیف ثاے مثلثہ

۸۱

تن پروری[۱] کے شغل میں کھوتا ہے جاں عبث
فکرِ مکیں ضرور ہے ، فکرِ مکاں عبث

گردش میں ہے بروئے زمیں آسماں عبث
اس تنگنائے دہر میں ہے یہ دھوّاں عبث

سمجھیں کہ نرم و سختِ مقدّر ازل سے ہے
کب ہر کسی کے گوشت میں ہے استخواں عبث

یہ رمز ہے کہ جائے سکونت جہاں نہیں
گردش میں کب ہے آٹھ پہر آسماں عبث

ہوتا ہے دردِ عشق جنھیں وہ یہ کہتے ہیں
طفلی میں موت آتی[۲] ، ہوئے ہم جواں عبث

۱۔ مصطفائی طبع دوم ۔ نسخہ مطبع مجدی : ''تن پروروں کے شغل میں''۔
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخہ مطبع مجدی : "طفلی میں موت آئی"۔

ہے[1] ایک رمز یہ بھی گلستانِ دہر کا
اے عندلیبِ زار ہے رنگِ خزاں عبث

خاکِ چمن میں آب مقدر ہے زیرِ پا
غنچوں[2] کی کھل رہی ہے عطش سے زباں عبث

آخر غذائے مور ہے ہر جثۂ قوی
اظہارِ زور کرتے ہیں پیلِ دماں عبث

چکھوں نہ میں شراب کا قطرہ بھی زاہدا
پیدا ہوئی ہے کیا مرے منہ میں زباں عبث

سنتا ہے کون قلقلِ مینا کے شور میں
ہر سمت مسجدوں میں ہے شورِ اذاں عبث

آخر دلا یہ چاہ لحد میں گرائے گا
ہم ہیں سوارِ توسنِ عمرِ رواں عبث

ہم پا برہنہ چلتے ہیں کانٹوں پہ کیا خموش
ہوتا ہے نعرہ زن جرسِ کارواں عبث

ہے صبحِ روزِ ہجر کہاں ہوشِ مے کشی
کھولی ہے مے فروش نے اپنی دکاں عبث

ڈالی ادھر گلے میں آدھر ٹکڑے ہو گئی
اے رشکِ ماہ پہنی قبائے کتاں عبث

روشن ہے تیرے نور سے کاشانۂ فلک
ہیں آفتاب و ماہ کے دو تابداں عبث

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : ”ہے یہ بھی ایک رنگ“ ۔

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
”غنچوں کے کھل رہے ہیں عطش سے دہاں عبث“۔

تیغِ ہلال ہوگی نہ ابرو سی کاٹ میں
پھرتی ہے رات دن یہ فلک کی فسان عبث

صد برگ ہے ترا دلِ صد چاک کم نہیں
ناسخ تجھے ہوئی ہوسِ بوستاں عبث

ردیف جیم تازی

۸۲

اس گل کے کان کو نہیں زیور کی احتیاج
ہے وہ صدف، نہیں جسے گوہر کی احتیاج

ہمت جو ہے بلند تو ہوں داغِ یاس بھی
ہوں آسمان، ہے مجھے اختر کی احتیاج

لاغر جو ہم ہیں رونے عرقناک کا ہے غم
اس خارِ خشک کو ہے گلِ تر کی احتیاج

گر بخت ہے[۱] بلند تو کیا چاہیے ہنر
تیغِ ہلال کو نہیں جوہر کی احتیاج

کرتا مجھے شہید نہ تنہا ہی ہر رقیب
مانندِ شمر اس کو ہے خنجر کی احتیاج

ہر گل زبانِ برگ سے کہتا ہے باغ میں
انسان کیا نبات کو ہے زر کی احتیاج

جب آ گیا غبار ذرا سا پہاڑ ہے
کیا ہے دلوں میں سدِّ سکندر کی احتیاج

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : "گر بخت ہیں"۔

جتنا[1] ہے ظرف تنگ ہو اسباب اس قدر
خُم کش کو کب ہے شیشہ و ساغر کی احتیاج

شیریں ہیں ایسے ہونٹ کہ اس خوش مذاق کو
شربت کے واسطے نہیں شکّر کی احتیاج

بے قدر دل مرا ہے حسینوں کی بزم میں
اس باغ کو نہیں ہے صنوبر کی احتیاج

گر[2] ساتھ ہو جہاں میں برائے مدد خدا
تو بھی ہے تقویت کو برادر کی احتیاج

کرتے ہیں نالے خانۂ زنجیر سے گریز
آزادۂ جنوں کو نہیں گھر کی احتیاج

حاجت امام کی بھی ہے ناسخ اسی طرح
دنیا میں جس طرح ہے پیمبر کی احتیاج

ردیف حائے مہملہ

۸۳

کیوں دکھائی اے فلک بے یار صبح
ہے شفق سے مجھ پہ آتش بار صبح

ہاں کسی خورشیدرو کے عشق میں
ہوتی ہے ہر رات سو سو بار صبح

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
''جتنا ہو ظرف ترک ہو اسباب اس قدر''

۲۔ یہ شعر نسخۂ مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجدی میں
موخر ہے ۔ (مرتب)

زلف سے رخسار کو ہوتا ہے ربط
کیوں شبِ فرقت سے ہے بیزار صبح
کھینچ کر فرقت میں تیغِ آفتاب
ہے ہماری جان کو خونخوار صبح
ہو گئی مجھ کو شبِ فرقت پہاڑ
چھپ رہی ہے کیوں پسِ کہسار صبح
وصل کا سامان ہے آج اے فلک
شام سے کر پیشتر طیّار صبح
حسن کا عالم بھی کیا عالم ہے واہ
زلفِ جاناں شام ہے، رخسار صبح
خطِ ابیض کے عوض میرے لیے
لائی ہے سر پر اٹھا کر دار صبح
وصل کی شب در پہ گر آتا ہے یار
آ چکی ہوگی پسِ دیوار صبح
سینۂ پُر داغ و چاکِ پیرہن
ہے وصالِ یار میں گلزار صبح
اس صنم پر توڑ کر تارِ شعاع
اب گلے میں ڈالے گی زنّار صبح
وصل میں تھا صبح سے بیزار میں
ہجر کی شب مجھ سے ہے بیزار صبح
قہر ہو گر شعلۂ پُر زر ترا
دیکھ پائے اے پری رخسار صبح
چاک کرتی ہے گریباں دیکھ کر
کارچوبی مہر کی دستارِ صبح

شام کیا ہو تیرے گھر میں بارِیاب
نور سے ہے سایۂ دیوار صبح
وصل کی شب ہو چکی ، اندھیر ہے
شام سے دکھلاتی ہے آثار صبح
وصل میں حاضر تو غائب ہجر میں
دیتی ہے ہر شب نیا آزار صبح
وصل کی شب آتی ہے جو تیرے ساتھ
تجھ کو کرتی ہے مقرر پیار صبح
ہے یہاں کس کو شبِ فرقت میں ہوش
ہو چکی ہوگی ہزاروں بار صبح
وصل کی شب کب ہوئی ہم کو نصیب
شام کو کرتا ہے نورِ بار صبح
ہے دعا اے خالقِ لیل و نہار
ہو یہ شام کاکلِ دلدار صبح

ردیف خائے معجمہ

۸۴

ہے نازکی سے قامتِ جاناں سمن کی شاخ
میں سوزِ عشق سے ہوں چنارِ کہن کی شاخ
ظالم کو بعد مرگ بھی ہے ظالموں سے ربط
خنجر کا دستہ کیوں نہ بنے کرگدن کی شاخ
ہم وحشیوں کے بخت جو برگشتہ ہیں سو ہیں
سیدھی کبھی طرح نہیں جیسے ہرن کی شاخ

رکھی چھڑی جو ناز سے اُس نے تہِ ذقن
سب کو ہوا گماں کہ ہے سیبِ ذقن کی شاخ

دیکھے جو یہ چنبیلی کی کلیوں سی انگلیاں
وہ تیرے دست و پا کو کہے یاسمن کی شاخ

دکھلائے اپنی فندقِ پا کی جو تو بہار
پابوس کو چمن میں جھکے نارون کی شاخ

مرتا ہوں میں کسی کی نزاکت پہ دوستو!
بہرِ جریدتین ہو نازک بدن کی شاخ

وصفِ صباحتِ رخِ جاناں اگر لکھوں
درکار ہو برائے قلم نسترن کی شاخ

معنی ثمر، حروف ورق، صنعتیں ہیں گل
ناسخ ہے کلکِ فکر نہالِ سخن کی شاخ

۸۵

ہے برنگِ گل سراپا وہ بتِ خونخوار سرخ
کیوں نہ ہو جائے رگِ گل کی روش زنّار سرخ

ہم کو اُس بدمست کا رہتا ہے دن رات انتظار
کیوں نہ ہوں بے نشہ سے دیدۂ بیدار سرخ

ہو گئے مارے حسد کے سیکڑوں دشمن سفید
گر لہو سے ہو گیا میرا تنِ افگار سرخ

دیکھ کر اے گل ترے رخسارِ آتشناک کو
ہو گئی گلشن میں چشمِ نرگسِ بیمار سرخ

ہنس کے کہتا ہے تجھے ہے نشہ یا آشوب ہے
دیکھتا ہے جب وہ میرے دیدۂ خوں بار سرخ

خوں میں تر رہتی ہیں پلکیں جب سے دیکھا روئے یار
الفتِ گل میں برنگِ گل ہوئے ہیں خار سرخ

ہے دگرگوں حال محبوبوں کا تجھ پر پیشتر
گر ہزاروں زرد ہیں گل تو کوئی دو چار سرخ

کل خدا جانے سیہ رو کون ہوگا زاہدا!
آج تو مانندِ گل ہے روئے ہر میخوار سرخ

ہوں جو آلودہ بظاہر ہو نہ ان سے بدگماں
زنگ سے بھی زاہدا ہو جاتی ہے تلوار سرخ

ہم سرِ عریاں سے نوچیں داغِ سودا کے کھرنڈ
فصلِ گل میں ہے سرِ ہر شاخ ہر دستار سرخ

پنجۂ[۱] قاتل ہو رنگیں مجھ میں اتنا خوں کہاں
ہے غنیمت اس کے ناخن بھی ہوں گر دو چار سرخ

مل گیا لیلیٰ کو قیسِ پا برہنہ کا سراغ
جب کہ صحرا میں نظر آئے لہو سے خار سرخ

آدمی کیا گر نگاہِ مست ساقی کی پڑے
نشے سے ہو جائے چشمِ روزنِ دیوار سرخ

سیرِ گلشن میں ہوا ثابت گلوں کو دیکھ کر
ہے بجا دنیا میں روئے مردمِ زردار سرخ

تیر سی لگتی ہے دل میں بات جو کرتا ہے تو
ہیں لبِ نازک ترے مثلِ لبِ سوفار سرخ

ہوں میں وہ رنگیں بیاں، چھو لے جو میرا استخواں
مثلِ طوطی زاغ کی بھی ہو وہیں منقار سرخ

۱- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع بھدی: ''پنجۂ قاتل ہوں رنگیں''۔

۸۶

یاد آیا تو ہوئے دیدۂ ناکام سفید
جیسے ہوں آمدِ سلطاں میں در و بام سفید

پڑے عکس اُس کے لبِ سرخ کا گر ساغر میں
ہو خجالت سے وہیں بادۂ گلفام سفید

دید اس چشمِ سیہ کی نہ میسّر ہووے[1]
دیدۂ غیر ہوں مثلِ گلِ بادام سفید

ہل ہے طولِ شبِ فرقت نہ ہوئی اب تک صبح
ہو گئے آہ مرے موئے سیہ فام سفید

سوجھے مضمونِ بیاضِ رخِ جاناں جو مجھے
ہو گیا رنگِ مرکّبِ دمِ ارقام[2] سفید

سرخ پوش آئے نظر، شوخ یہ ہے رنگِ بدن
پہنے پوشاک جو وہ سروِ گل اندام سفید

گو پہنتا نہیں جز جامۂ رنگیں تو آج
کفن اک روز ملے گا تجھے خود کام سفید

غرّہ کر حسنِ دو روزہ پہ نہ اے سیم اندام
رنگ سب رنگوں میں ہوتا ہے بہت خام سفید

۱- مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی :
"دید اس چشمِ سیہ کی نہ میسر ہو اسے"
۲- مصطفائی طبع دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی :
"ہو گیا رنگ مرکب اسی ہنگام سفید"

اپنے رخسلو پہ چھوڑے نہ کبھی تو جو نقاب
ہے[1] ابھی صبحِ امید ابلقِ ایّام سفید

حرفِ مطلب جو لکھوں صاف وہ دیتا ہے جواب
بھیجتا ہے مجھے کاغذ وہ دلارام سفید

تیرے محبوب کے قاصد نے کہا کیا ناسخ
ہوگیا منہ ترا سنتے ہی جو پیغام سفید

ردیف راے مہملہ

۸۷

نہیں ہے سبزۂ خط عارضِ محبوبِ پرفن پر
ہوئے ہیں جمع پروانے یہ آ کر شمعِ روشن پر

گریباں چاک گل بھی ہیں جو دیوانوں کی صورت سے
ہوا ہے اشتباہِ کوئے جاناں مجھ کو گلشن پر

کیا کیوں عشقِ ابرو چھوڑ کر طوفِ[2] حرم میں نے
نہیں شمشیرِ قاتل یہ وبال اس کا ہے گردن پر

بجائے[3] شمع گل ساقِ بلوریں ہائے رنگیں ہوں
کبھی یارب گذر ہو اس پری کا میرے مدفن پر

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"ہنی اے صبح امید ابلق ایام سفید"

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"کیا کیوں عشق ابرو چھوڑ کر طاق حرم میں نے"

۳۔ مصطفائی طبع دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : "بجائے شمع و گل" ۔

جگر ہوتا ہے ٹکڑے میکشی سے تیری فرقت میں
مئے گلرنگ سبقت لے گئی ہے آبِ آہن پر
لگا کر آنکھ نظارہ میں کر سکتا نہیں ڈر سے
گماں ہے چشمِ درباں کا درِ جاناں کے روزن پر
میں وہ شوریدہ سر دیوانہ تھا جو بعد مردن بھی
چڑھا جاتے ہیں پتھر لوگ آ کر میرے مدفن پر
ہمارے نالہ ہائے پُر اثر کی طرز اڑائی ہے
گریباں چاک ہو گل کا نہ کیوں بلبل کے شیون پر
تسلی دل کو دیتا ہے تری مژگاں کی دوری میں
مسیحا ورنہ عاشق ہے معاذ اللہ سوزن پر
کسی کا روئے تاباں یاد دلواتا ہے یہ ہردم
گرے گی میری برقِ آہ اک شب مہ کے خرمن پر
نہ دیکھا زیست بھر اُس غیرتِ مہتاب کو ہم نے
چڑھاتا ہے فلک اب کیا گلِ مہتاب مدفن پر
اسی صیّاد کو گلگشت کا کیا آج ارادہ ہے
ہزاروں بلبلیں ہیں منتظر دیوارِ گلشن پر
خبر ہے جان و تن کی صیدگاہِ عشق میں کس کو
جگر ہے محوِ ناوک پر نظر ہے ناوک افگن پر
شفق میں ماہِ نو کو دیکھ کر حسرت یہ آتی ہے
لہو میرا نہیں لگتا کسی کے نعلِ توسن پر
رہا جو زندگی بھر عشق مجھ کو خوش نگاہوں کا
چڑھا جاتے ہیں آہو اپنی آنکھیں میرے مدفن پر
تجھی سے عشق ہے سو دیکھتا ہے تیری صورت کو
عبث باندھی ہے تہمت بت پرستی کی برہمن پر

گرے تھے ایک دن دو چار آنسو چشمِ جاناں سے
بجائے سبزہ نرگس پھولتی ہے میرے مدفن پر

کسی کے ساتھ ہو کر گرم سوتا ہوں جو جاڑوں[1] میں
تو یاد آتے ہیں مجھ کو جو پڑے رہتے ہیں گلخن پر

نہیں اس خوف سے ہوتا میں قتلِ غیر پر راضی
نہ لگ جائے کہیں اُس کا لہو قاتل کے دامن پر

تصور بعدِ مردن بھی جو ہے اک روئے تاباں کا
تو گنبد کے عوض ہے برجِ خورشید اپنے مدفن پر

جہاں میں تیرہ دل جو ہیں وہی بے رنج رہتے ہیں
کہ نازل ہوتی ہے آفت ہوا کی شمعِ روشن پر

تصور بھی عجب ہے دور ہیں، ہم ہوں کہیں لیکن
لگی رہتی ہے آنکھ اپنی درِ جاناں کے روزن پر

ہمارے زخم کے نظارے کی کب تاب ہے اس کو
تو اے جرّاح پہلے باندھ پٹی چشمِ سوزن پر

موا[2] ہوں صدمۂ بیداریِ شب ہائے ہجراں سے
کبھی سبزہ بھی خوابیدہ نہ ہوگا میرے مدفن پر

ہمارے ہاتھ سے دامن جھٹک کر تو گیا جس دم
گریباں آ رہا بس ایک ہی جھٹکے میں دامن پر

تری چلمن تو ہے فانوس، تو ہے شمعِ کافوری
گریں کیوں کر نہ پروانے ہزاروں تیری چلمن پر

۱- مصطفائی طبع اول:
''کسی کے ساتھ ہو کر گرم سوتا ہوں میں زنداں میں''
۲- مصطفائی طبع اول: ''ہوا ہوں'' (کذا)

تپ غم سے ہوا یہ حال میرا تیری فرقت میں
کہ گنڈہ ضعف سے طوقِ گراں ہے میری گردن پر
کسی کا درد ہوتا ہے کسی کو کب زمانے میں
کہ جامِ گل ہیں خنداں شیشہ و بلبل کے شیون پر
اگر ہوتا ہے اک دانہ بھی اس میں میری قسمت کا
فلک بجلی گرا دیتا ہے ناسخ میرے خرمن پر

۸۸

رکھیو سوادِ خط رخِ رشکِ قمر سے دور
رہتی ہے شام جیسے الٰہی سحر سے دور
روتا ہوں جب ہوا ہے گریزاں وہ شعلہ رو
بجلی کو دیکھو بھاگتی ہے ابرِ تر سے دور
کیا روزِ بد میں ساتھ رہے کوئی ہم نشیں
پتے بھی بھاگتے ہیں خزاں میں شجر سے دور
لپٹیں گے آکے حال میں ہم صوفیوں کی طرح
بیٹھے ہیں گرچہ بزم میں مطرب پسر سے دور
اپنے صنم کو لے کے شبِ وصل باغ میں
بھاگا میں آشیانۂ مرغِ سحر سے دور
اس مرتبہ ہے آتشِ داغِ جنوں کا خوف
لڑکوں کے سنگ بھاگتے ہیں میرے سر سے دور
میں ناتواں تا نہ وہاں تک پہنچ سکوں
لیتا ہے گھر وہ اپنے لیے میرے گھر سے دور
کرتا نہیں کبھی وہ نگہ میرے داغ پر
شمشیرِ یار رہتی ہے میری سپر سے دور

معنی یہ ضد کے ہیں کہ میں دیوانہ جو ہوا
زنجیر میرے ہار نے کی اپنے در سے دور

ہے سوزِ عشق شہپرِ پرواز مرغِ دل
باروت کب اڑے رہے جب تک شرر سے دور

یعقوب[3] رونے گر غمِ یوسف[4] میں ، تھا بجا
رونے ہی کی جگہ ہے پسر ہو پدر سے دور

کہتے ہیں اس کو کیا کہ میں روتا ہوں رات دن
اک غیر کا پسر جو ہے میری نظر سے دور

ناسخ جو اس پری کو الجھنے کا خوف ہے
موئے کمر کو رکھتا ہے تارِ نظر سے دور

۸۹

جیتے جی جاؤں میں کیونکر کوئے جاناں چھوڑ کر
بلبلِ نالاں کہاں جائے گلستاں چھوڑ کر

چاہیے وحشت میں جامہ چاک ہونا[1] روح کا
دامنِ قاتل کو لوں اپنا گریباں چھوڑ کر

وصلِ جاناں میں نظر آیا مہِ شعباں مجھے
سبزہ کیا دیکھوں خطِ رخسارِ جاناں چھوڑ کر

کاوشِ غم دور ہو میرے دلِ ویراں سے کیا
خار جاتے ہیں کوئی صحرا کا داماں چھوڑ کر

روحِ لیلیٰ کا عبث ہے تجھ کو مجنوں انتظار
بوئے گل کب عود کرتی ہے گلستاں چھوڑ کر

۱۔ مصطفائی طبع اول :
"چاہیے وحشت میں جامہ چاک ہو تا روح کا"

وصلِ جاناں کس کی قسمت میں ہمیشہ ہے دلا
جاتی ہے اک روز آخر جسم کو جاں چھوڑ کر

ہو وطن میں خاک میرے گوہرِ مضموں کی قدر
لعل قیمت کو پہنچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر

کوئے قاتل کو چلے وحشت میں یوں صحرا سے ہم
بھاگتے ہیں جس طرح سے تیر میداں چھوڑ کر

ہوتی ہے غربت میں ثروت، پر بڑی ایذا کے بعد
رنج اٹھائے کس قدر یوسف نے کنعاں چھوڑ کر

حور ہے ساقی مرا، کیونکر ہے مے مجھ پر حرام
واعظا! کرتا ہے کیا باتیں تو ایماں چھوڑ کر

ہو الٰہی وصل جنت میں بھی مجھ کو یار کا
کب وہ انساں ہے جو مانگے حور، انساں چھوڑ کر

سانپ کو قابو میں لا کر چھوڑ دینا زہر ہے
جان سے مایوس ہوں میں زلفِ جاناں چھوڑ کر

سر پٹکتی پھرتی ہیں ارواح سنگ و خشت سے
چل بسے ہیں جسم کیا کیا قصر و ایواں چھوڑ کر

اعتماد اصلا نہیں گر ہے جہاں زیرِ نگیں
اٹھ[1] گیا دنیا سے خاتم کو سلیماں چھوڑ کر

زاہدا! کیونکر کروں میں ترک یہ دنیا وہ ہے
سیر کو آئے تھے آدم، باغِ رضواں چھوڑ کر

۱- مصطفائی طبع دوم:
"اٹھ گیا دنیا سے حاتم کو سلیماں چھوڑ کو
نسخۂ مطبع بھدی:
"اٹھ گیا دنیا سے خاتم کو سلیماں چھوڑ کر"

آج تو پوشاک پہ مرتا ہے تو کل دیکھیو
جائے گا نبّاش تیری لاش عریاں چھوڑ کر

روشنی کی سیر جب میں نے شبِ فرقت میں کی
شعلے آ لپٹے مجھے سروِ چراغاں چھوڑ کر

دیکھ لو فرقت نہ دیکھی ہو جو برق و ابر کی
خندہ زن جاتا ہے ظالم مجھ کو گریاں چھوڑ کر

عیشِ تنہائی ہوا مُردوں کی کثرت سے محال
جاؤں یا رب اب کہاں شہرِ خموشاں چھوڑ کر

مر گیا کیا ناسخِ میکش جو سارے مےفروش
مسجدوں میں بیٹھے اپنی اپنی دکّاں چھوڑ کر

۹۰

گنتا ہوں سر کو بوجھ میں ناکام دوش پر
رکھتا ہے جب سے تیغ گل اندام دوش پر

جالی کی آستیں نہیں اسے نازنیں تری
عاشق کے مرغِ دل کو ہے یہ دام دوش پر

تو وہ حسیں ہے دیکھ لے گر طفل بھی تجھے
گودی میں چین آئے ہو نہ آرام دوش پر

کیا منہ سے نیک و بد میں نکالوں کہ رات دن[1]
اخبار[2] گوئی کرتے ہیں ارقام دوش پر

۱۔ نسخہ مطبع مجیدی:
"کیا منہ سے نیک و بد میں نکالوں کہ غیر جنس"
۲۔ نسخہ مطبع مجیدی:
"اخبار لکھتے ہیں سحر و شام دوش پر"

اے میکشو! نزاکتِ ساقی کو دیکھنا
لاتا ہے رکھ کے مثلِ سبو جام دوش پر

پاسِ حرم نہ چاہیے اے پنجۂ جنوں
بارِ گراں ہے جامۂ احرام دوش پر

تعمیر پر جو مرتے ہے نافہم ہیں، مگر
لے جائیں گے اٹھا کے در و بام دوش پر

بالوں کا کچھ اثر بغلِ یار میں نہیں
پڑتا ہے عکس زلفِ سیہ فام دوش پر

ڈورا مرے صنم کی جو گردن کا دیکھ لیں
زنّار رکھ لیں صاحبِ اسلام دوش پر

یہ التجا ہے پیرِ مغاں کی جناب میں
رکھوں میں ساقِ ساقیٔ گلفام دوش پر

شیریں کوئی نہیں ہے مگر کوہکن کی طرح
تیشہ لیے کھڑا ہوں میں ناکام دوش پر

بس ہے اسی کا نقشِ قدم مجھ[1] کو سجدہ گاہ
ناسخ نبی کے جس نے رکھا گام دوش پر

۹۱

مجھ تیرہ دل کی پہنچے جو آہ آسمان پر
سیّارے ہوں تمام سیاہ آسمان پر

دیکھا ہے ہم نے خوب نشیب و فرازِ دہر
آنسو زمین پر ہیں تو آہ آسمان پر

۱۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجدی:
"بس ہے اسی کا نقشِ قدم ہم کو سجدہ گاہ"

خالی نہیں ہے جلوۂ جاناں سے کوئی جا
وہ گل زمیں پر نہ ہے تو ماہ آسماں پر

ہے چاند مثلِ عارضِ جاناں نہ آفتاب
دعویٰ زمیں پر ہے، گولہ آسماں پر

اسفل نہیں ہے فیض سے اعلیٰ کے بےنصیب
مہتاب ہے زمیں پہ[1]، ماہ آسماں پر

رکھتے ہیں کس ادا سے زمیں پر قدم حسین
حالت فرشتوں کی ہے تباہ آسماں پر

میری زمینِ شعر کا دیکھے جو مرتبہ
تحقیر سے کرے وہ نگاہ آسماں پر

تلوار تو[2] تراہ کی باندھے تو مہر بھی
کرنے لگیں تراہ تراہ آسماں پر

سفلے کو گو کہ پر لگیں لیکن ہے نارسا
پہنچے کبھی ہوا سے نہ گلہ آسماں پر

دیکھیں جو تجھ سے آ کے مقابل زمیں پہ ہو
ہے آفتاب صاحبِ جاہ آسماں پر

ایسا اچھالتا ہے مجھے اضطرابِ دل
ہوتا ہوں گہ زمیں پہ، گاہ آسماں پر

رفتارِ یار دیکھ کے ایسا ہوا ہے گم
ملتی نہیں ہے ماہ کو راہ آسماں پر

بے شبہ نسرِ طائر اسی دم شکار ہو
پھینکے اگر وہ تیرِ نگاہ آسماں پر

۱- مصطفائی طبع دوم : "پر" -
۲- مصطفائی طبع اول : "تلوار کو" -

ہر شب نہ تیرے در پہ گدائی اگر کرے
ہرگز نہ آفتاب ہو شاہ آسمان پر

ناسخ بھلا دیا ہے وطن کو جو اس قدر
شاید مسیح[۴] کو[۱] ہے رفاہ آسمان پر

۹۲

زنداں میں بھی کوچہ ترا اے یار آتا ہے نظر
بلبل قفس میں ہے مگر گلزار آتا ہے نظر

تیرے عاشق کا گماں ہوتا ہے مجھ کو جانِ جاں
کوئی بہت جو ناتواں بیمار آتا ہے نظر

تجھ سے جدا ہیں جب سے ہم ہے صحبتِ انساں سے رم
غم خوار ہر اک اے صنم خونخوار آتا ہے نظر

تھا دم جو جسمِ زار میں ہے دیدۂ خونبار میں
جینا فراقِ یار میں دشوار آتا ہے نظر

یاد آتی ہے آتری ہوئی مستی شرابِ عشق کی
بہکا ہوا جس دم کوئی میخوار آتا ہے نظر

جی سے ہوں بیزار ان دنوں ہے مرگ درکار ان دنوں
مجھ سے مرا یار ان دنوں بیزار آتا ہے نظر

دیکھی ہیں جس نے اک نظر آنکھیں تری اے فتنہ گر
مانندِ نرگس زیست بھر بیدار آتا ہے نظر

تیرا خدنگ اے غنچہ لب دل میں ہوا ہے غرق سب
سینے کو شق کرتے ہیں تب سوفار آتا ہے نظر

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخہ مطبع بھدی : "شاید مسیح کی ہے" ۔۔

ناسخ ہے اب آنکھوں پھر مشق تصورِ اس قدر
جس سمت کرتا ہوں نظر دلِ دار آتا ہے نظر

۹۳

پاسبانِ حسن ہے خال اُس رخِ پُرنور پر
کرتے ہیں فلفل حفاظت کو تعیں کافور پر

باغِ عالم میں یہی پھل ہم نے پایا تھا سو اب
دانت اُس کی تیغ کا ہے زخم کے انگور پر

موذیوں کے خان و ماں[1] برباد کرتا ہے فلک
جب نہ تب آتی ہے آفت خانۂ زنبور پر

کی خدا نے کافروں پر اے صنم جنت حرام
ورنہ کس کی آنکھ پڑتی تیرے ہوتے حور پر

داغ ہے دل زلف و رخ پر چاہیے دونوں کا پاس
مشک بھی تھوڑا چھڑک دو مرہمِ کافور پر

دیکھ کر تجھ کو، گلوں سے یہ پھرا بلبل کا دل
بعدِ مُردن بھی چمن سے بھاگتے ہیں دور پر

ہے جو دعوائے خدائی کر حجاب اغیار سے
اے صنم کتنے ہی پردے ہیں خدا کے نور پر

رنج اٹھائے ہیں حسینوں سے جہاں میں اس قدر
بعد مردن بھی نہ آنکھ اپنی پڑے گی حور پر

۱- مصطفائی طبع دوم - نیچہ مطبع مجتبائی: ... مصحف - ؛ "موذیوں کے خانماں برباد کرتا ہے فلک"

جذبۂ عاشق کمند جلوۂ معشوق ہے
قبل موسیٰ کے تجلی کب[1] ہوئی تھی طور پر
ماہیانِ چشمۂ خورشید آتی ہیں نظر
مچھلیاں بالے کی ہیں یا عارضِ پُرنور پر
خاک کا پشتارہ دوشِ روح سے اترے کہیں
یا الٰہی ہے وبال اب بوجھ اس مزدور پر
پلک ہے جو حسن وہ محتاج پردے کا نہیں
حاجتِ فانوس تھی لاسخ نہ شمعِ طور پر

۹۴

بے خطر یوں ہاتھ دوڑاتا ہوں زلفِ یار پر
دوڑتا تھا جس طرح ثعبانِ موسیٰ مار پر
سست بنیادی ہے ختم اپنے مکانِ تار پر
منہدم ہو، چاندنی آ جائے گر دیوار پر
کہتے ہیں سب دیکھ کر ابرو کو چشمِ یار پر
کھینچی ہے تلوار کس بے رحم نے بیمار پر
ہے مژہ برگشتہ مائل ابروئے خم دار پر
میل یہ خنجر کو جنسیت سے ہے تلوار پر
کیا نرالی گرم بازاری سرے یوسف کی ہے
پڑ گئی جب آنکھ، اک بجلی گری بازار پر
تیرِ مژگاں بھی غضب تھے، پر کیا ابرو نے قہر
کٹ گئے لاکھوں جو نوبت آ گئی تلوار پر

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع جہانی :
"قبل موسیٰ کے ہوئی تھی کب تجلی طور پر"

پنجۂ مژگاں رہے[1] جاتے ہیں ابرو کی طرف
ہاتھ کیا رکھتے ہیں ترکِ چشم اب تلوار پر

کیا پھوں دورِ فلک میں ساقیا جامِ شراب
قطرۂ شبنم نہیں بچتا زبانِ خار پر

جب سے ہے مجھ ناتواں کو تیری مژگاں کا خیال
خلق کہتی ہے ہوا ہے خار عاشق خار پر

تند خو ظاہر میں ہوں، باطن میں ہوں باغ و بہار
جس طرح کانٹے لگے ہوں باغ کی دیوار پر

دن کو زاہد بھولے ہیں اپنی سیہ بختی سے راہ
شمعِ مینا چاہیے میخانے کی دیوار پر

روئے خنداں زخم ہیں تیرے تصوّر میں مجھے
سبزۂ خط کا ہے عالم مرہمِ زنگار پر

بے ارادہ طے ہوئی جاتی ہے یاں راہِ عدم
طائرِ روحِ رواں کو کچھ نہیں درکار پر

میری گردن ضعف سے اتنی نہ جھکتی تھی کبھی
باڑھ رکھوائی ہے اُس نے آج کیا تلوار پر

ایک[2] اشکِ گرم ناسخ گر نہ رونے میں گرے
طعنہ زن فوارہ ہو منقارِ موسیقار پر

۱- مصطفائی اول و دوم:
"پنجۂ مژگاں بڑھے جاتے ہیں ابرو کی طرف"
نسخۂ مطبع محمدی طبع ۱۲۵۸ھ:
"پنجۂ مژگاں رہے جاتے ہیں ابرو کی طرح"
۲- مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع محمدی۔ بہارستانِ سخن، طبع ۱۸۳۶-۳۷ء و طبع ۱۸۷۵ء:
"ایک اشکِ گرم ناسخ گر غمزانے میں گرے"

۹۵

جدنما کپڑے ہیں مجھ وحشی کے جسمِ زار پر
یوں کلہ[۱] سر پر ہے جیسے آبلہ ہو خار پر

دورِ جامِ مے تصدق ہے اگر رفتار پر
خونِ دل مینائے مے ہے قامتِ دلدار پر

لختِ دل سینے سے دوڑے آتے ہیں سوئے مژہ
دیکھو اعجازِ محبت گل ہیں عاشق خار پر

ایسے ہم روئے، رہا پرواز سے مرغِ نگاہ
بھیگنے سے، طائروں کے ہوتے ہیں بیکار پر

کس قدر ہے آپ کے دستِ حنائی کا اثر
کتنے ہی چٹکی میں رنگ آیا لبِ سوفار پر

او بتِ کافر ترے موئے کمر کے شبہے میں
مدتوں مرتے رہے ہم رشتۂ زنار پر

ہے گلِ تر سے گلِ تصویر کی قیمت زیاد
فوق ہے ہاں بے حقیقت کو حقیقت دار پر

گل ہیں خوش خلقی سے مقبولِ نظر اے تندخو
باغِ عالم میں نظر پڑتی ہے کس کی خار پر

قطرۂ شبنم گلوں پر جب کہ دیکھے باغ میں
سوجھی پھبتی خندۂ دنداں نمائے یار پر

ساغرِ مے ہے دوات اپنی، نَےِ مطرب قلم
لکھتے ہیں اشعار دیوار و درِ خمار پر

۱۔ مصطفائی طبع دوم میں: ”یوں کلہ“ ہے (کذا)

عازمِ گلگشت وہ میکش ہے کیا جو آسماں
تانتا ہے شامیانہ ابر کا گلزار پر
بندہ گیا مضموں جو اس کے روئے آتش ناک کا
پڑ گئے چھالے زبانِ کلکِ گوہر بار پر
عندلیبیں کہتی ہیں سن کر صریرِ کلکِ فکر
توڑیں منقاروں کو اب اس زاغ کی منقار پر
دیکھ کر اس گل کو ہر غنچہ بھی چلّانے لگا
نالے کب موقوف ہیں بلبل تری منقار پر
جان لے عالم کہ گھر ہے ناسخِ میخوار کا
چاہیے بوتل کے ٹکڑے ہوں مری دیوار پر

۹۶

غش مجھے آیا جو میں پہنچا درِ دلدار پر
پاؤں کے بدلے رکھا سر سایۂ دیوار پر
شعر کہتا ہوں کسی کی ابروئے خمدار پر
قط نہیں میرے قلم پر، باڑھ ہے تلوار پر
میرے غم میں اشک ہیں مژگانِ چشمِ یار پر
دار بستِ تاک ہے گویا درِ خمار پر
فاش ہوتا ہے چھپاتا ہوں میں جتنا رازِ عشق
داغِ سودا بن گیا طرّہ مری دستار پر
رہنے دے بس یوں ہی اے جراح تو ٹانکے نہ دے
ہنستے ہیں چاکِ گریباں زخمِ دامندار پر
جانتا ہے دیکھ کر مجھ کو اترتا ہے لہو
یہ گماں ہے اس کو میرے دیدۂ خونبار پر

کوئے جاناں میں ہوں پر محروم ہوں دیدار سے
ہائے خندہ خندہ زن ہیں دیدۂ بیدار پر
دور کرتے ہیں نہانے میں صنم موباف کو
کیچلی برسات میں ہے بار جسمِ مار پر
اس کی زلفیں دور کیں آیا زوالِ حسن بھی
بس خزانہ رہ چکا جب آئی آفت مار پر
آسماں کا منطقہ ٹھہرا لیا ہے جس طرح
وہم یوں موئے کمر کا ہے جہاں کو یار پر
کھوڈی ہے تصویرِ شیریں اس لیے فرہاد نے
روح بھی پٹکا کرے سر حشر تک کہسار پر
بیٹھنے کا قصد کرتا ہوں جو کوئے یار میں
سایہ چڑھ جاتا ہے مارے بغل کے دیوار پر
ہو نہ دنیا میں کسی کو انتظارِ خوابِ وصل
یہ نوشتہ ہے بیاضِ دیدۂ بیدار پر
کام کیا ہے مجھ کو اے ناسخ کسی فرار سے
جان و دل سے ہوں میں عاشق حیدرِ کرّار پر

۹۷

آنکھ جب سے پڑ گئی موئے میانِ یار پر
رونگٹا بارِ گراں ہے میرے جسمِ زار پر
ہے نگاہِ یار ہردم میرے جسمِ زار پر
بجلیاں گرنے لگی ہیں سینکڑوں اک خار پر
جو ہرگی رو ہے وہ دیوانہ ہے چشمِ یار پر
ہے گریباں چاک ہر گل نرگسِ بیمار پر

زلف کے صدمے زیادہ رخ سے ہیں مجھ زار پر[۱]
دن سے افزوں رات بھاری ہوتی ہے بیمار پر

ناتوانوں کے الم سے اہلِ غفلت کو ہے عیش
خوش[۱] ہوئے سب ناخنِ مطرب لگا جب تار پر

لوحِ تربت کی جگہ شایاں ہے تیرا نقشِ پا
مر گیا ہوں اے پری پیکر تری رفتار پر

خط نہیں ہے مانعِ نظارۂ رخسارِ یار
سیرِ گلشن میں نظر پڑتی ہے کس کی خار پر

گھر میں ہے پر ہیں خریدار اس کے یوسف سے زیاد
خود فروشی کب بھلا موقوف ہے بازار پر

جسمِ خاک آلودہ مجھ حیراں کا ہے دیوار ساں
ہے عیاں روزن کا عالم دیدۂ بیدار پر

ہو گیا میں قتل فرقت میں جو دیکھا ماہِ عید
خون ثابت ہے مرا اس مغربی تلوار پر

بس یہی تدبیر اب ان کے بھگا دینے کی ہے
جی میں ہے ہو جاؤں عاشق چند روز اغیار پر

اپنی قسمت میں ہے غم کھانا گوارا کیوں نہ ہو
آگ کھانا شاق ہے کب مرغِ آتش خوار پر

واں وہ انگشتِ حنائی سے بجاتے ہیں ستار
یاں دلِ پر خوں کے ٹکڑے ہیں مژہ کے تار پر

جب گیا گلگشت کو گلزار میں وہ شرمگیں
پٹیاں بندھوائیں چشمِ نرگسِ بیمار پر

۱۔ مصطفائی طبع دوم ۔ نسخہ مطبع مجتبائی ۔ بہارستانِ سخن ، طبع ۱۸۴۶ء :
"خوش ہوئے سب"۔

جم گیا ہے اس قدر میرا لہو چھٹتا نہیں
شاخِ مرجاں کا ہے عالم یار کی تلوار پر
جوشِ سودا سے سیہ تھا کیا ہی ناسخ کا لہو
ہے سیہ تاب اس بتِ سفاک کی تلوار پر

۹۸

عاشق و معشوق سب مرتے ہیں میرے یار پر
ذرے کیا، خورشید غش ہے روزنِ دیوار پر
جب غزل کرتے ہیں موزوں قامتِ دلدار پر
تو الف لکھتے ہیں جائے صاد ہم اشعار پر
خوف آتا ہے کسی مغفور کی مژگاں نہ ہو
دشت میں پڑنے نہیں دیتا قدم میں خار پر
زینۂ بام ترقی ہے بلند و پستِ دہر
دم میں پہنچا تا فلک، عیسیٰ چڑھا جب دار پر
ہے یہ میرے ضعف کا روزِ جدائی میں اثر
شام ہے اور دھوپ چڑھ سکتی نہیں دیوار پر
طاقِ کعبہ پر لگایا ہے کسی نے آئنہ
یا جبینِ صاف ہے یہ ابروے خم دار پر
شب جو الٹی اس نے روئے حیرت افزا سے نقاب
چاندنی مثلِ سفیدی رہ گئی دیوار پر
سر برہنہ ہو گیا جوشِ جنوں سے آفتاب
دیکھ کر بیچش کا طرہ تری دستار پر
باغباں کا کیوں نہ ہو رضواں سے عالی تر دماغ
آج پھولوں کا ہے طرہ یار کی دستار پر

[illegible]

مجھ سے روپوشی کا شکوہ سن کے بولا وہ صنم
گرتی ہے بجلی خدا کے طالبِ دیدار پر

دیدۂ گریاں سے ہم چشمی جو کی تو مثلِ برق
کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو ابرِ دریا بار پر

دیکھیو ناسخ سرِ شیخِ معمم کی طرف
کیا کلس مسواک کا ہے گنبدِ دستار پر

ردیف زای معجمہ

۹۹

تاثیرِ زلف سے ہے خطِ روئے یار سبز
کرتا ہے جسم کو اثرِ زہرِ مار سبز

عاشق کے دل کے حال سے ہے کس کو اطلاع
باطن میں پر شرر ہے بظاہر چنار سبز

اک دن ہوئی صنوبرِ دل کو نہ تازگی
بے برگ ہو کے نخل ہوئے لاکھ بار سبز

لاریب ہیں یہ گلشنِ فردوس کے شجر
سیّد نہ کیوں لباس کریں اختیار سبز

پست[1] و بلند عالمِ بالا کو ایک ہے
کرتا ہے کوہ و دشت کو ابرِ بہار سبز

تاثیر دیکھو افعیٔ کاکل کے زہر کی
موباف سرخ ہو گئے ہیں لاکھ بار سبز

۱- مصطفائی طبع دوم : ''پست و بلند عالم میں بالا کو ایک ہیں'' ۔

گلزارِ صحنِ یار کی یعنی طرف ہے یہ جو
عارض پہ خطِ سبز نہیں ہیں یہ خطوِ سبز

مینائے بادہ کا جو تصور ہے ساقیا
آنکھوں کے ڈورے ہو گئے وقتِ خمار سبز

ہیں گل عذار ماہِ محرم میں سبزپوش
گویا کہ پھول سرخ ہیں اور شاخسار سبز

ٹھوکر لگے جو توسنِ بادِ بہار کی
مانندِ برگ سنگ سے نکلیں شرار سبز

رو رو کے خط کے غم میں نکالا ہے تو نے خط
سبزہ نہ کس طرح ہو لبِ جوئبار سبز

یک رنگ ہر سفید و سیہ ہے بہار میں
گویا ہے رنگِ ابلقِ لیل و نہار سبز

فیضِ بہار عام یونہی ہے تو آج کل
سنبل کی شاخ سا ہے مرا جسمِ زار سبز

عالم تمام صید ہے دامِ بہار کا
کرتا ہے چوب تیر کو خونِ شکار سبز

ہم خاک ہو گئے ہیں خطِ سبزِ یار پر
مثلِ گیاہ سودہ ہو اپنا غبار سبز

مارا جنوں نے مجھ کو شروعِ بہار میں
لازم ہے شامیانہ بروئے مزار سبز

ناسخ کمالِ یار پہ جوشِ بہار ہے
کیا روئے سرخ پر ہے خطِ مشکبار سبز

ردیف صاد مہملہ

۱۰۰

اس قدر زیرِ فلک اے سرو گل اندام رقص
کر رہا ہے لولیِ گردوں کو بے آرام رقص

سیکڑوں مردے نکل پڑتے ہیں ہر ٹھوکر کے ساتھ
فتنۂ محشر وہ ہے جس کا رکھا ہے نام رقص

مرغِ خوش‌خواں اس چمن کا ہوں کہ جس کے صحن میں
آسماں طاؤس ساں[1] کرتا ہے صبح و شام رقص

لگتی ہیں مینائے گردوں کو ہزاروں ٹھوکریں
کرتے ہیں مستی میں جب ہم رندِ مے آشام رقص

ہو گیا پیری میں عیش اپنا جوانی سے دوچند
ہاتھ میں رعشے سے کرتا ہے جو مے کا جام رقص

دور دامن ہو گیا ہے مجھ کو مثلِ آسیا
پیستا ہے دل کو تیرا اے بتِ خود کام رقص

گر عوض ناقوس کے جا کر میں اک نالہ کروں
بت کدے میں ہر طرف کرتے پھریں اصنام رقص

تو وہ ہے صیاد او ظالم کہ تجھ کو دیکھ کر
کرتے ہیں بدلے تڑپنے کے اسیرِ دام رقص

جی اٹھے مردے ہزاروں سن کے گھنگرو کی صدا
واسطے رندوں کے لایا موت کا پیغام رقص

ناچنے گانے کا کیا رتبہ ہے اس کے سامنے
ہر سخن اس کا ہے اے ناسخ غنا، ہر گام رقص

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخہ مطبع مجیدی: "آسماں طاؤس ساں گرتا ہے" اور یہی درست ہے۔

ردیف شین معجمہ

۱۰۱

رکھتے ہیں گل عشق رخ شوقِ قد جانانہ شمع
گل ہوئے ہیں شکلِ بلبل ، صورتِ پروانہ شمع

کیوں کر اُس کے آنسوؤں کا تار ٹوٹے ایک دم
کہتی ہے میرا زبانِ حال سے افسانہ شمع

دیکھتے ہی قامتِ جاناں کو حیراں ہیں تمام
فاختہ ، شمشاد و بلبل ، شاخِ گل ، پروانہ شمع

اُس کے نورِ رخ کے آگے بوستانِ بزم سے
دور ہوتی ہے برنگِ سبزۂ بیگانہ شمع

شرم سے اُڑ جائے شعلہ کیوں نہ جگنو کی طرح
دیکھے محفل میں جو نورِ فندقِ جانانہ شمع

اشک مالا موتیوں کا ، دود کلغی[1] ، شعلہ تاج
رکھتی ہے تختِ لگن میں شوکتِ شاہانہ شمع

عرس ہے شاید شہیدِ چشمِ مستِ ناز[2] کا
ساغرِ مے ہیں چراغ اور شیشۂ میخانہ شمع

بزمِ عشرت ہے بیاباں ، چاندنی ہے جائے فرش
جانتا ہوں غول کی آنکھوں کو میں دیوانہ شمع

کیوں نہ میں تشبیہ دوں زلفوں کو دودِ شمع سے
شمع کا شعلہ ہے چہرہ ، قامتِ جانانہ شمع

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی بہارستانِ سخن : ''اشک مالا موتیوں کا دودِ گل کے''

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
''عرس ہے شاید شہید چشمِ بیستِ یار کا''

کیا موثر ہے مرے سوزِ دروں کا ماجرا
ہو زباں افسانہ گو کی کہتی ہے افسانہ شمع

وصل کے معنی یہ ہیں ہوں عاشق و معشوق ایک
شمع سے ملتے ہی بنتے ہیں پر پروانہ شمع

پنجۂ نازک جو ہیں مہندی سے شعلے شمع کے
صاف آتے ہیں نظر اب ساعدِ جانانہ شمع

جرمِ اظہارِ محبت پر نہ کیوں سر ہو قلم
سامنے جاناں کے کیا روتی ہے گستاخانہ شمع

اک طرف ہے اشک افشاں اک طرف ہے خندہ زن
رکھتی ہے اوقات تیرے عشق میں مستانہ شمع

اور لکھنی ہے جنوں انگیز اب مجھ کو غزل
داغِ سودا کے رکھے روشن دلِ دیوانہ شمع

۱۰۲

ساقِ جاناں دیکھ کر بنتی ہے خود پروانہ شمع
شعر میں اس کو نہ باندھے گا بجز دیوانہ شمع

کیوں نہیں ہوتا تجھے غمِ عاشقِ جاں باز کا
دیکھ روتی ہے بروئے لاشۂ پروانہ شمع

ایسی تاریکی ہے، گم ہوتا ہے نورِ آفتاب
کب ہے ممکن کر سکے روشن سرا کاشانہ شمع

گر دکھا دے اپنے[1] بالے کی وہ مچھلی کا فروغ
ہو برنگِ ماہیِ بے آب بے تابانہ شمع

۱- بہارستانِ سخن طبع ۳ - ۱۸۴۶ع و طبع ۱۸۷۵ع :
"گر دکھا دے اپنے بالے کی وہ بجلی کا فروغ"

شاہِ عادل کی عدالت سے نہیں دنیا میں جور[1]
بزمِ عالم میں رہے اب کیوں نہ بے باکانہ شمع
کیا نزاکت ہے کہ جھنجھلا کر لگا کہنے وہ رات
محفلِ عشرت کو کر دیتی ہے آتش خانہ شمع
رکھتی ہے بے سبحہ تیرے نام کو وردِ زباں
اپنے رشتے میں پروئے اشک کا ہر دانہ شمع
اس لیے اے شمع رو فانوس میں رکھتے ہیں بند
جل نہ جائے تجھ پہ[2] آ کر صورتِ پروانہ شمع
ہوں وہ پروانہ کہ در تک باوجودِ عذرِ لنگ
نکلے استقبال کو محفل سے بے تابانہ شمع
سبزۂ خط ہے نہ سارے جسم میں اک رونگٹا
لب عسل ہیں بے مگس، قامت ہے بے پروانہ شمع
لالہ[3] گل کو گلستاں میں بنا دے گر چراغ
شاخِ شبّو کو کرے نورِ رخِ جانانہ شمع
نشۂ مے ہے جو منہ سے نکلی پڑتی ہے زباں
چاہتی ہے دستِ ساقی سے پئے پیمانہ شمع
تیری پابوسی کی حسرت میں جلے گی عمر بھر
گنتی ہے فانوس کو محفل میں زنداں خانہ شمع
جلتے ہیں معشوق جاتے ہیں جو عاشق اور پاس
کیوں نہ محفل میں جلاوے شہپرِ پروانہ شمع

۱- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع مہدی : ''دنیا میں چور'' -
۲- بہارستانِ سخن طبع ۴۷ - ۱۸۴۶ء و طبع ۱۸۷۵ء : ''جل نہ جائے تجھ پر'' -
۳- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع مہدی : ''لالہ و گل کو'' -

اور لکھتا ہوں شبِ تاریکِ فرقت میں غزلہ
ہے مری آتش زبانی بہرِ خلوت خانہ شمع

۱۰۳

ایسا پروانہ زمانے میں کبھی دیکھا نہ شمع نے غالبا
طور کا شعلہ ہے پروانہ، رخِ جانانہ شمع

حالِ دل یادِ لبِ جاناں میں یہ ہے جس طرح
شہد سے ہو کر جدا جلتی ہے مایوسانہ شمع

جل رہے ہیں جوہرِ آئینہ پروانوں کی طرح
آئنہ فانوس عکسِ عارضِ جانانہ شمع

دشمنی کرتا ہے جس سے ہو امیدِ دوستی
روشنی کی جا جلاتی ہے مرا کاشانہ شمع

مجھ سے نفرت، غیر سے اس شعلہ رو کو ہے تپاک
ہے مگس سے آشنا، پروانے سے بیگانہ شمع

ایسی شرمندہ ہے اڑ جائے ابھی مثلِ شرار
بزمِ جاناں میں جو پائے شہپرِ پروانہ شمع

گر کے بجلی نے نکالی ہے مری حسرت یہ آج
سچ تو ہے کوئی کہاں روشن مرا کاشانہ شمع

ہے خیالِ روئے تاباں روشنی ممکن نہیں
ہے یہ تاریکی نہیں جلتی مرا ویرانہ[1] شمع

بیٹھتے دیکھا نہیں ہرگز کسی نے ایک دم
گنتی ہے اس بزم کو ایسا مسافرخانہ شمع

۱۔ مصطفائی طبع اول: "مرا پروانہ شمع" ہے۔

سر پہ سوزانِ داغِ سودا ، پاؤں میں زنجیرِ اشک
تیری محفل میں کھڑی ہے صورتِ دیوانہ شمع
لگن اس خاطر بناتے ہیں کہ تجھ کو دیکھ کر
پھر پابوسی نہ دوڑی آئے بے تابانہ شمع
جانتی ہے وہ مری آتش زبانی ہم نشیں
ہو سکے گی بزمِ عالم میں کبھی گویا نہ شمع
غول بے مشعل نہیں آتے ہیں مارے خوف کے
چیخ کر بھاگے اگر دیکھے سرا ویرانہ[۱] شمع
منہ دکھا دیتا ہے پروانوں کو گر وہ شعلہ رو
بھول جاتی ہے ابھی سب نازِ معشوقانہ شمع
شاہِ ملکِ عشق ہوں مرنے پہ بھی لیتا ہوں باج
گل چڑھا جاتی ہے بلبل قبر پر ، پروانہ شمع
کچھ فقط تو ہی نہیں ناسخ دل و جاں سے نثار
بزم میں پروانے ہیں سب اور صاحب خانہ شمع

۱۰۴

وصل میں تھی رونقِ محفل تو آتی چنگ و شمع
آہ و افغاں ، داغِ سوزاں اب ہے یاں آہنگ شمع
شعلے عارض ، دود زلفیں ، قد ہیں سانچے میں ڈھلے[۲]
کیا تفاوت ہے میانِ دلبرانِ شنگ[۳] و شمع

۱- مصطفائی طبع اول : ''سرا پروانہ شمع'' ۔
۲- نسخۂ مطبع مجدی : ''قد ہے سانچے میں ڈھلا'' ۔
۳- مصطفائی طبع اول - بہارستانِ سخن (انتخاب) طبع ۲۷ - ۱۸۳۶ع و طبع ۱۸۷۵ع : ''سنگ و شمع'' ۔

سنگ وش اور شمع پاس اس کے پھرون میں دور دور
کیوں نہ دیکھوں دیدۂ حسرت سے سوے سنگ و شمع

روشن اس کے سینۂ پُر نور سے ہوتی ہے بزم
نور سے یکساں ہے[1] وہ آئینۂ بیرنگ و شمع

داغِ سوزاں اس پہ آفت ، شعلہ ہے اس پر و بال
شعلہ رو یکساں ہے تیرا عاشقِ بے ننگ و شمع

کھینچے گر نقشہ ترے رخسارِ آتش رنگ کا
کیا[2] عجب یکرنگ ہو کر خامۂ ارژنگ و شمع

گوری گوری انگلیوں پر فندقوں کا رنگ ہے
قدرتِ حق سے ہے یاں توام گلِ اورنگ و شمع

شعلہ رخسارانِ سنگیں دل سے تھا جو ہم کو انس
بعدِ مردن بھی ہمارے سینے پر ہے سنگ و شمع

حسنِ یوسف سے ہوئی پُر نور ایسی راہِ مصر
روشنی میں تھا برابر میل ہر فرسنگ و شمع

میکشو اس سے زیادہ مت کرو زیر و زبر
ہے برائے محتسب کافی بس اک مے چنگ و شمع

گیسوئے شبرنگ و خطِ سبز و روئے آتشیں
ہے شبِ تاریک اور فانوسِ مینا رنگ تو شمع

یار میرا سنگ دل ہے اور میں ہوں موم دل
دیکھ لے جس نے کہ دیکھا ہو نہ ربطِ سنگ و شمع

۱۔ مصطفائی طبع اول ۔ بہارستان سخن (انتخاب) طبع ۱۸۳۶ء و طبع ۱۸۷۵ء : ”آئینۂ بیرنگ و شمع“ ۔

۲۔ نسخۂ مطبع مجتبائی ۔ بہارستان سخن (انتخاب) طبع ۱۸۷۵ء : ”کیا عجب یکرنگ ہو کر“ ۔

خاک پر جا کر اندھیری قبر میں لیٹے ہیں شاہ
جانتے جب ہم کہ لے جاتے ہو ہلل اور نگ و شمع

شمع ساں جلتا ہے سوزِ عشق سے ملتا نہیں
ٹھیکہ ہے میری وفاداری کا پائے سنگ و شمع

بزم میں ہر شب اسی کے رشک سے جلتی ہے یہ
شاہ رو! کیا نسبتِ رخسارِ شوخ و شنگ و شمع

عاشق اس پر مرتے ہیں، دیتے ہیں جی اس پر پتنگ
ہے برابر شان میں وہ روئے آتش رنگ و شمع

شام سے تا صبح ہے مجھ کو جو اب سیرِ لغات
سامنے رکھتا ہوں اپنے نسخۂ فرہنگ و شمع

تھا بقا اک رات اے ناسخ پسِ محمل رواں
گوش و چشم اپنے لگائے بر صدائے زنگ و شمع

ردیف غین معجمہ

۱۰۵

عریانیِ جنوں میں مرے کام آئے داغ
طاؤس کی طرح ہے بدن پر قبائے داغ

سوداگرانِ مشک کا ملتا نہیں دماغ
سہم کی ہے تلاش جو ہم کو برائے داغ

جلتا ہوں سر سے پاؤں تلک مثلِ آفتاب
حاصل[۱] ہوا نہ مجھ کو فلک سے سوائے داغ

۱- مصطفائی طبع اول: "حاصل ہوا نہ ہم کو"۔

ہوتا ہے کرم خوردہ گلِ لالہ جس طرح
ناسور یوں ہیں میرے جگر میں برائے داغ

بے داغ آسماں نے نہ رکھا کسی کو یاں
ہر ایک مہجبیں نے بھی چیچک کے پائے داغ

شکوہ نہیں ہے جوششِ سودائے عشق کا
مانندِ شمع سر ہے ہمارا برائے داغ

سودائی ہم ہیں ایسے کہ ہر سال لالہ ساں
ہوگا ہماری خاک سے نشو و نمائے داغ

جرّاح اپنے پنبہ و مرہم کو دور رکھ
بھڑکیں گے اس سے اور مرے شعلہ ہائے داغ

کیوں کر گلوں کی خاطرِ نازک تو توڑتا
گلشن میں عندلیب سے میں نے چھپائے داغ

مرنے کا غم نہیں یہ مگر داغ ہے مجھے
دامن سے اس نے میرے لہو کے چھڑائے داغ

جنت کو جائیں گے لیے دوزخ بغل میں ہم
ناسخ یونہی جو بعدِ فنا ہے بقائے داغ

۱۰۶

دیکھی نہیں جہاں میں مثلِ نگاہِ یار تیغ
ہوتی نہیں ہے جس طرح ہمسرِ ذوالفقار تیغ

مرگ کی ہے جو بے خودی مستیٔ عشق ہے یہی
موجِ شراب مجھ کو تھی یار کی آب دار تیغ

ابروئے یار اور مژہ کرتی ہے آج مجھ کو قتل
آتے ہیں تیر متصل، پڑتی ہے بار بار تیغ

قتل کیا ہے بے خطا، تو نے جو مجھ کو بے وفا
جوشِ سرشک خوں ہوا روتی ہے زار زار تیغ
جوہروں میں جو ہے عیاں دیدۂ منتظر کی شکل
رکھتی ہے دستِ یار میں میرا ہی انتظار تیغ
غیر ہے سخت جاں مگر، ڈالے جو یاں ہیں شعلہ ور
پڑتی ہے جبکہ سنگ پر ہوتی ہے شعلہ بار تیغ
تیغِ نگاہِ یار کا جب سے ہوا ہے غلغلہ
خوف سے مثلِ شاخِ بید رہتی ہے بے قرار تیغ
دوست جو ہے دلا کبھی اُس سے نہ ہوگی دشمنی
آ کے گلے جو لگ گئی کرتی ہے مجھ کو پیار تیغ
زخموں سے غیرتِ چمن کس کا کیا ہے نخلِ تن
آج برنگِ شاخِ گل رکھتی ہے جو بہار تیغ

۱۰۷

جس مکاں میں ہو ترے رخسار کا روشن چراغ
ہے یقیں بن جائیں دیواروں کے سب روزنِ چراغ
جب تلک ہے حسن، معشوقوں پہ عاشق ہے[1] نثار
گرد ہیں پروانے بھی جب تک کہ ہے روشن چراغ
جوشِ وحشت نے کیا ایسا مجھے آتش قدم
خانۂ زنجیر میں ہونے لگے روشن چراغ
روشنی ایسی ہے اُس کے سینۂ پُر نور کی
ہو گیا مجھ کو یقیں ہے زیرِ پیراہن چراغ

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجیدی۔ بہارستانِ سخن (انتخاب) طبع ۱۸۴۶ء و طبع ۱۸۷۵ء:
"جب تلک ہے حسن، معشوقوں پہ عاشق ہیں نثار"

ہیں جو روشن طبع بغض ان سے سیہ کاروں کو ہے
چور کو جس طرح آتا ہے نظر دشمن چراغ

روشن ایسا اس گلِ عارض سے ہے بستانِ بزم
تیرہ آتا ہے نظر مثلِ گلِ سوسن چراغ

ہیں جو عمدہ اُن سے مفلس بہرہ ور ہوتے نہیں
آتشِ یاقوت سے ہوتا نہیں روشن چراغ

ٹانکنے آیا جو پانِ زخمِ دلِ سوزانِ مسیح
بن گیا رشتہ فتیلہ چشمۂ سوزن چراغ

کر دوں روشن آتشِ داغِ جدائی سے اگر
برق ساں کرنے لگے بیتابی و شیون چراغ

جھڑتے ہیں سنگِ لحد سے ٹاپیں لگنے میں شرر
میری تربت پر جلاتا ہے ترا توسن چراغ

کوئی پروانہ جلے گا تو جلوں گا غم سے میں
دوستو! ہرگز نہ رکھنا تم پئے مدفن چراغ

ہوتی ہے نورِ خرد سے اہلِ غفلت کو گریز
بیشتر انساں بجھاتے ہیں دمِ خفتن چراغ

داغِ حسرت جل اٹھا گلگشت میں تیرے بغیر
آتشِ رنگِ چمن سے ہو گیا روشن چراغ

پھونک مارے غنچۂ لب سے اگر وہ رشکِ گل
بزم میں پھیلائے بجھ کر نکہتِ گلشن چراغ

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع محمدی ۔ بہارستان سخن طبع
۱۸۶۲ع ۔ و بہارستان سخن طبع ۱۸۷۵ع ... میں یہ مصرعہ
"دوستو ہرگز نہ تم رکھنا پئے مدفن چراغ" ص ۲۰۸

کیوں نہ ہو پوچ فلک کا حمق ظاہر خلق پر
دن کو جب روشن کرے خورشید کا کودن چراغ

اس نے کل اسکندری آئینے میں دیکھا جو منھ
بن گیا عکسِ فروغِ حسن سے آہن چراغ

جس شبستاں میں ہو صائب کلکِ ناسخ شعلہ رو[۱]
چاک سازد جامۂ فانوس را بر تن چراغ

ردیف قاف

۱۰۸

سنبلِ شبگوں کی جا دیکھی شبِ تارِ فراق
ہو گیا میں دل کے پھنستے ہی گرفتارِ فراق

وصل میں بھی ہائے جس دل کو نہ ہوتا تھا قرار
اے فلک تو نے کیا اس کو گرفتارِ فراق

ردیف کاف فارسی

۱۰۹

بہ رنگِ گل مجھے کیا چاہیے گریباں چاک
کہ مثلِ غنچہ ہزاروں ہیں دل میں پنہاں چاک

تصور اس دلِ صد چاک میں ہے اس مہ کا
ہوا ہے جس کے اشارے سے ماہِ تاباں چاک

ہر ایک لالۂ صحرا ہے تیرا داغ بدل
ہر ایک گل ہے چمن میں ترا گریباں چاک

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع بھنگی۔ بہارستان سخن، طبع ۱۸۴۶ع و بہارستان سخن طبع ۱۸۷۰ع : "اشعلہ ریز"۔

تو ایسا ماہ لقا ہے کہ تیرے سامنے ہو
کتاں کی طرح گریبانِ ماہِ کنعاں چاک

یہی دعا ہے خدا سے کہ ہوں بیاباں مرگ
نہ میرے غم سے ہو پیراہنِ عزیزاں چاک

جو زیست چاہے کرے مال سے تہی پہلو
صدف کے سینے کو کرتے ہیں دیکھ ناداں چاک

نہیں ہے جادہ میں وحشی پھنسا جو زنداں میں
مرے فراق میں ہے سینۂ بیاباں چاک

کیا کلالِ قضا نے خمیرِ خاکِ بتاں
یہ مہر و ماہ پیالے ہیں، چرخِ گرداں چاک

لکھوں میں دشتِ جنوں کا اگر کوئی مضموں
یقیں ہے ناسخ ابھی ہو تمام دیواں چاک

ردیف میم

۱۱۰

کیا اسیری میں کریں شکوہ ترا صیاد ہم
واں بھی کچھ دامِ رگِ گل سے نہ تھے آزاد ہم

دام دودِ نالۂ پیچاں ہے، دانے اشک ہیں
یعنی ان کافر پری زادوں کے ہیں صیاد ہم

آج کل سے کچھ نہیں اپنی زباں معجز بیاں
نطق عیسیٰ کی طرح رکھتے ہیں مادر زاد ہم

خیمہ زمیں عجب ہے بے بوفا، یہ آسماں بے مہر ہے
ہم بنی بھی ہے اک اپنا نیا عالم کریں ایجاد ہم

روک لے اک بات کی بات اپنے دستِ تیغ کو
دے لیں اے قاتل رقیبوں کو مبارکباد ہم

اس نے تلواریں جڑیں فریاد پر جوں جوں ہمیں
ہر دہانِ زخم سے کرنے لگے فریاد ہم

قیدِ ہستی تک ہیں تیرے دامِ گیسو میں اسیر
تن سے سر آزاد ہو جائے تو ہوں آزاد ہم

جب سے دیکھی ہے گلِ رخسارِ جاناں کی بہار
ہو رہے ہیں صورتِ برگِ خزاں برباد ہم

خندہ زن ہوتا نہیں اپنا دہانِ زخم بھی
کوئی دنیا میں نہ ہوگا جیسے ہیں ناشاد ہم

پہلے تیشہ مارتے خسرو کو اے شیریں دہن
جی نہ کھوتے مفت اپنا ہوتے گر فرہاد ہم

چل بسے اپنے عہد سے افسوس سودا اٹھ گیا
کس سے مانگیں جا کے ناسخ اس غزل کی داد ہم

۱۱۱

بند آتا ہے نظر، جاتے ہیں سو سو بار ہم
جانتے ہیں یار کے دروازے کو دیوار ہم

مانگتے ہیں یہ دعا سونے کے وقت اے یار ہم
ہوں ترے پاؤں کی آہٹ سے کبھی بیدار ہم

عین غفلت میں ہیں مثلِ نرگسِ بیمار ہم
دیکھنے کو اپنی آنکھیں رکھتے ہیں بیدار ہم

[illegible] کوئے یار میں ہیں رات دن بیدار ہم
[illegible] آنکھیں وا رکھتے ہیں مثلِ روزنِ دیوار ہم

لقد دل دیتے ہیں اک محبوبِ بازاری کو آج
زور سودا مول لیتے ہیں سرِ بازار ہم

کیوں جنازے کو اٹھا کے سب نے شرمندہ کیا
ایک کے دل پر نہ جیتے جی ہوئے تھے بار ہم

ناتواں ہرچند ہیں پر ایک شب اے رشکِ ماہ
پھاندیں گے دیوار مثلِ سایۂ دیوار ہم

خوابِ غفلت اس کو کہتے ہیں کہ چھینٹوں سے ابھی
سبزۂ خوابیدہ چونک اٹھے ، نہ ہوں بیدار ہم

بادشاہی کر رہے ہیں انزوائے فقر میں
پائے خفتہ کو کہیں اب طالعِ بیدار ہم

یہ سمجھ کر خوش نہ ہو واعظ کو غائب[1] ہو گئے
مے کشی سے فرقتِ ساقی میں ہیں بیزار ہم

سارے عالم میں ہیں فاقے، بس یہیں[2] ہے اکل و شرب
چھوڑیں کیا ماہِ مبارک میں درِ خمار ہم

پھنس گئے ہیں واعظا گردابِ دورِ جام میں
زیست بھر ہوں گے نہ اس دریائے مے سے پار ہم

جب چبھا گلبرگ میں کانٹا ، ہمارا دل دکھا
نرگسِ بیمار کے غم میں ہوئے بیمار ہم

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
”یہ سمجھ کر خوش نہ ہو واعظ کہ تائب ہو گئے“

۲۔ مصطفائی طبع اول و طبع دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
”سارے عالم میں ہیں فاقے بس نہیں ہے اکل و شرب“

ہوش آنے پہ کھلا مژگاں پہ[1] محبوبوں کی ہیں
عالم وحشت میں جن کو جانتے ہیں خار ہم

بادۂ جنت سے مستنبط ہوا یہ مسئلہ
باغ میں اے محتسب کیونکر نہ ہوں میخوار ہم

ہیں جو غافل ان کو سونے[2] پر بھی آجاتی ہے اینڈ
پنبۂ توشک یہ ہیں منصور سے بیدار ہم

ہے سراپا راست اور اس کا دہن معدوم ہے
کیوں نہ اس کے قد کو سمجھیں تیر بے سوفار ہم

عمر گزری اک بت کافر نظر آیا نہیں
حشر میں کیونکر خدا کا پائیں گے دیدار ہم

دوڑتے ہیں پیچھے قاتل کے گریباں پھاڑ کر
رکھتے ہیں کیا اشتیاق زخم دامن دار ہم

نفرت ایسی ہو گئی نظارہ بازی سے ہمیں
گنتے ہیں تار نظر کو رشتۂ زنار ہم

سب رگیں تن پر نظر آتی ہیں مثل تار ساز
کرتے ہیں ناسخ جو اک مطرب پسر کو پیار ہم

ردیف نون

۱۱۲

دل سبک وضعوں سے اپنا آشنا ہوتا نہیں
سنگ مقناطیس ہرگز کہربا ہوتا نہیں

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی :
"ہوش آنے پر کھلا مژگاں یہ محبوبوں کی ہیں"

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی :
"ہیں جو غافل ان کو سولی پر بھی آجاتی ہے اینڈ"

خط کو روئے یار پر نشو و نما ہوتا نہیں
سبزۂ بیگانہ گل سے آشنا ہوتا نہیں

تو بھی آغوشِ تصور سے جدا ہوتا نہیں
اے صنم جس طرح دور اک دم خدا ہوتا نہیں

ہیں جوانی میں جو ظالم ہوں گے اظلم پیری میں
کوئی جز مارِ کہن سال اژدہا ہوتا نہیں

فقر سے ایسی مری خاطر کو ہے چسپیدگی
محو اعضا سے نشانِ بوریا ہوتا نہیں

دانۂ باروت بنتے ہیں مرے تخمِ امید
تا نہ برق آن پر گرے نشو و نما ہوتا نہیں

نشۂ عرفاں نہیں جب تک دلا ہے قیل و قال
تا نہ ہو لبریز ساغر بے صدا ہوتا نہیں

بن گیا تصویر ہر دل میں تصورِ یار کا
آئنے میں جا کے عکس اُس کا جدا ہوتا نہیں

موذیوں کو روندتے پھرتے ہیں ہم وحشت میں بھی
کب سرِ خارِ مغیلاں زیرِ پا ہوتا نہیں

ہو سریرِ سلطنت یا تختۂ تابوتِ فقر
ہر دماغ و دل سرا شاہ و گدا ہوتا نہیں

بحر وحدت میں ہوں میں گو سر گیا مثلِ حباب
چوب کیا تلوار سے پانی جدا ہوتا نہیں

تیرے دیوانے ہیں معشوقانِ عالم ایسے ہوئے
کون گل ہے جس کا پیراہن قبا ہوتا نہیں

باغِ عالم میں برنگِ سبزۂ بیگانہ ہوں
غیرِ پامالی کوئی یاں آشنا ہوتا نہیں

۱۱۳

ماہِ نو ہے مثلِ ابرو لیکن اس کا رُو نہیں[۱]
ماہِ کامل صورتِ رو ہے مگر ابرو نہیں

مشک میں خوشبو ہے ، پیچ و تاب مثلِ مو نہیں
پیچ ہیں سنبل میں مثلِ مُو مگر خوشبو نہیں

کون سا تن ہے کہ مثلِ روح اس میں تو نہیں
کون گل ہے جو ترا مسکن برنگِ بُو نہیں

جامِ نرگس میں کہاں شبنم جو نکلے آفتاب
یار کے آگے مری آنکھوں میں اک آنسو نہیں

یاد گیسو میں ہوا میرا یہ دھجّی سا بدن
مجھ پہ پھبتی کہتے ہیں موباف ہے ، گیسو نہیں

کیوں نہ ہو فرہاد ناکام اور خسرو کامیاب
زورِ زر کے سامنے کچھ قوتِ بازو نہیں

جسم ایسا گھل گیا ہے مجھ مریضِ عشق کا
دیکھ کر کہتے ہیں سب تعویذ ہے بازو نہیں

دیکھے ہیں ہنسنے میں جس دن سے دُرِ دندانِ یار
چین مثلِ گوہرِ غلطاں کسی پہلو نہیں

عشق میں بدمست ہوں میں پر کوئی واقف نہیں
نشہ ہے جامِ مۓ الفت میں لیکن بُو نہیں

۱- یہ شعر نسخۂ مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع ہندی طبع ۱۲۵۸ھ میں مقدم ہے ۔ (مرتب)

زلفِ جاناں میں نہیں کوئی دلِ وحشی اسیر
یہ عجب تاتار ہے جو ایک بھی آہو نہیں

ہو گیا ہے یہ قرانِ آفتاب و ماہِ نو
یار کے رخسارِ آتش رنگ پر ابرو نہیں

ہو گیا ہے مثلِ مو تارِ نگہ اپنا سیاہ
آگے آنکھوں کے صنم جب سے ترے گیسو نہیں

رات دن ناقوس کہتے ہیں بآوازِ بلند
دیر سے بہتر ہے کعبہ گر بتوں میں تو نہیں

قمریاں دیوانی ہیں کیونکر گلے میں ہو نہ طوق
باغ میں اک سرو مثلِ قامتِ دلجو نہیں

۱۱۴

زور ہے گرمیٔ بازار ترے کوچے میں
جمع ہیں تیرے خریدار ترے کوچے میں

دیکھ کر تجھ کو قدم اٹھ نہیں سکتا اپنا
بن گئے صورتِ دیوار ترے کوچے میں

دیر ویراں ہیں ترے عہد میں کعبہ ہے خراب
جمع ہیں کافر و دیں دار ترے کوچے میں

پاؤں پھیلائے زمیں پر میں پڑا رہتا ہوں
صورتِ سایۂ دیوار ترے کوچے میں

روز یاں سیکڑوں بے ہوش پڑے رہتے ہیں
ہے مگر خانۂ خمار ترے کوچے میں

پاسبانوں کی طرح راتوں کو بے تابی سے
نالے ہم کرتے ہیں اے یار ترے کوچے میں

زور ہے عشق میں یہ تفرقہ پردازی کا
ہم ہیں زنداں میں ، دلِ زار ترے کوچے میں

آرزو ہے جو سروں میں تو یہیں دفن بھی ہوں
ہے جگہ تھوڑی سی درکار ترے کوچے میں

گر یہی ہیں ترے ابرو کے اشارے قاتل
آج کل چلتی ہے تلوار ترے کوچے میں

جیسے جنت میں ہیں ادریس رہوں میں بھی مدام
لائیں گر طالعِ بیدار ترے کوچے میں

حالِ دل کہنے کا ناسخ جو نہیں پاتا بار
پھینک جاتا ہے وہ اشعار ترے کوچے میں

۱۱۵

قامتِ یار کو ہم یاد کیا کرتے ہیں
سرو کو صدقے میں آزاد کیا کرتے ہیں

زلفِ شب رنگ کو ہم یاد کیا کرتے ہیں
شبِ تاریک میں فریاد کیا کرتے ہیں

نگہِ یار کو ہم یاد کیا کرتے ہیں
دیکھ کر برق کو فریاد کیا کرتے ہیں

کوچۂ یار کو ہم یاد کیا کرتے ہیں
جا کے[1] گل زار میں فریاد کیا کرتے ہیں

گھر جو بے یار ہے ویراں تو تصور میں مدام
خانۂ دل کو ہم آباد کیا کرتے ہیں

۱- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع مجیدی : "جا کے گلزاروں میں" -

رشک سے نام نہیں لیتے[1] کہ سن لے نہ کوئی
دل ہی دل میں اسے ہم یاد کیا کرتے ہیں

گزرے ہیں کوچہ کاکل سے صبا کے جھونکے
نکہتِ گل کو جو برباد کیا کرتے ہیں

ہوتے ہیں جاتے ہی مکتب میں پری رو خونریز
کیا یہ جلّادوں کو استاد کیا کرتے ہیں

پھونک دیں نالۂ سوزاں سے اگر چاہیں رقیب
ہم فقط خاطرِ صیّاد کیا کرتے ہیں

ہوتی ہے آفتِ خط قہرِ خدا سے نازل
یہ صنم ہم پہ جو بیداد کیا کرتے ہیں

ملک الموت اگر کہیے انھیں تو ہے بجا
قتل بے تیغ پری زاد کیا کرتے ہیں

تو وہ صیاد ہے جو وار کے تجھ پر لاکھوں
طائرِ روح کو آزاد کیا کرتے ہیں

انتقام اس کا کہیں لے نہ فلک، ڈرتا ہوں
جھوٹے وعدوں سے جو وہ شاد کیا کرتے ہیں

تیرا دیوان ہے کیا سامنے اُن کے ناسخ
جو کہ قرآن پہ ایراد کیا کرتے ہیں

۱۱۶

ہے عجب رنگ کی وحشت ترے دیوانے میں
جی نہ آبادی میں لگتا ہے، نہ ویرانے میں

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی : "رشک سے لیتے نہیں نام"۔

ہوں وہ میکش کہ نہ مستی میں کہوں راز کبھی
لاکھ قُلقُل کہے شیشہ مجھے مےخانے میں
آفتاب اس میں اگر آئے، تو ا بن جائے
نور کا دخل نہیں میرے سیہ خانے میں
حشر تک جی میں ہے، بیہوش رہوں میں ساقی
کاش مے بھر دے مری عمر کے پیمانے میں
بلزکی ہے ہوا قاتل مری حالت کا شریک
یاں لگا زخم تو واں درد اٹھا شانے میں
کس طرح طائرِ دل ہو ترے چہرے پہ نثار
شمع رو طاقتِ پرواز ہے پروانے میں
بال توڑے تری زلفوں کے نہ بیدردی سے
جس[1] مرے ہاتھ کے مانند ہو گر شانے میں
عشق میں دل نے پھنسایا تو ہوا غیر کو رنج
نہیں اپنے میں مروت جو ہے بیگانے میں
پارۂ شیشۂ دل نصب ہے ہر روزن میں
کیجیے عیش زمستاں مرے کاشانے میں
یاں تو بجلی بھی سنبھل جاتی ہے گرتے گرتے
شمع کے ٹھہرے[2] قدم کیا مرے ویرانے میں
نوش کر شوق سے جی کھول کے صرفہ کیا ہے
خوف بدہضمی کا ناسخ نہیں غم کھانے میں

۱- یعنی گن، وصف۔ اثر، تاثیر، برکت۔ شکتی، طاقت، قدرت۔ وقار۔ (فرہنگ آصفیہ جلد دوم، ص ۱۰۴)۔
۲- نسخۂ مطبع جھدی: ''شمع کے ٹھہریں قدم''۔

۱۹۶

خونِ کفک سے رنگ رگِ گل ہے خار میں
پرزے برنگِ گل ہے گریباں بہار میں

داغِ جنوں کھلے ہیں مرے جسمِ زار میں
حیرت ہے اتنے پھول کھلے[1] ایک خار میں

ڈورا خلال کا نہیں دندانِ یار میں
رشتہ پڑا ہے یہ گہرِ آب دار میں

جاتا ہے وہ جدھر کو یہ قدموں کے ساتھ میں
ریگِ رواں ہے خاک مری کوئے یار میں

پہنچا وہ جب کہ دور میں پہنچا قریبِ مرگ
عمرِ رواں کے طور ہیں رفتارِ یار میں

ہے مجھ کو یہ اشارۂ نوروز اب کے سال
جز عشقِ زلف کچھ نہ کروں سال[2] یار میں

عاشق ہوا ہوں دوستو میں اپنی شکل کا
میرا ہے عکس آئنۂ روئے یار میں

آنسو میں اس طرح ہے مرا جسمِ ناتواں
رشتہ ہو جس طرح گہرِ آب دار میں

اک آن میں نوازشِ فندق سے اے پری
سونے کے تار ہو گئے تیرے ستار میں

سایہ نہ دھوپ میں ہے نہ آئینے میں ہے عکس
باقی نہیں ہے خاک مرے جسمِ زار میں

۱- نسخۂ مطبع مجدی: "حیرت ہے اتنے پھول لگے"۔
۲- نسخۂ مطبع مجدی: "سال نار میں"۔

کھٹکا نہیں جہاں میں ملا / مجھ کو داغِ عشق
دیکھو کہ ایک خار نہیں لالہ زار میں
ہو مثلِ گرد و باد بہم ربطِ باد و خاک
آئے سمندِ یار جو میرے غبار میں
یوں گور میں ہے ساتھ ہمارے خیالِ زلف
جس طرح کوئی اژدہا رہتا ہو غار میں
دِکھلا گیا کبھی نہ وہ چشمِ سیاہ کو
آنکھیں مری سفید ہوئیں انتظار میں
اوراقِ گل رگوں سے جو مسطر کشیدہ ہوں
رنگیں غزل اک اور لکھوں میں بہار میں

۱۱۸

کیہ کر مُوا ہوں حسرتِ دندانِ یار میں
ہوں دفن روزنِ گہرِ آب دار میں
یاں داغ زیبِ نخلِ بدن ہیں بہار میں
شعلہ بجائے گل ہے درختِ چنار میں
دیوان بھی ہوا جو گریباں کے ساتھ چاک
گلبرگ اُڑتے پھرتے ہیں بادِ بہار میں
مثلِ تدرو سوغِ نگہ کیوں نہ ہو نثار
مانندِ ماہ نور ہے اُس کے عذار میں
مُہ داغ سینہ ہو جو کرے ضبطِ سوزِ عشق
لالہ عیاں نہاں ہے سرِ کوہسار میں
اہلِ جہاں نے فرض کیا ہے مرا وجود
شکلِ خطوط چرخ ہے جسمِ نزار میں

آسودگی سے دہر میں بچنا محال ہے
خوں کافروں کے لگتے رہے ذوالفقار میں

کھایا نہ زہر رشک ترے دانت دیکھ کر
دندانِ مار ان گئے دانۂ انار میں

کج طینتوں کو خاک ہو صحبت سے راستی
تھا اژدہا بھی ساتھ پیمبر کے غار میں

مضموں نگاہِ یار[۱] کا لکھتا ہوں میں اگر
بجلی چراغ بنتی ہے شب ہائے تار میں

جو ہیں ملال میں گلِ صد برگ کی طرح
ان کو پسند رنگِ خزاں ہے بہار میں

باروت میں لگا دے کوئی آگ جس طرح
کرتے ہی عشق دل نہ رہا اختیار میں

مانندِ برگِ گل نہ ہو شعلے میں روشنی
روشن کروں جو شمع شبِ ہجرِ یار میں

موجیں ہوا کی چلتی ہیں مانندِ برگِ کاہ
سوزش یہ آج تک ہے ہمارے غبار میں

کاغذ کی جا ہو بالِ سمندر تو میں لکھوں
مضمون گرم ہیں قلمِ شعلہ بار میں

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"مضموں نگاہِ یار کے لکھتا ہوں میں اگر"

۱۱۹

واعظ! نہ منع بادہ کشی کر خمار میں
خوں ہو حلال ہے ہو حرام اضطرار[2] میں

آنکھیں بتوں کی لگ رہی ہیں زلفِ یار میں
کیونکر نہ ہو مقامِ غزالاں تتار میں

آوارہ مثلِ گرد ہوں ہر رہ گذار میں
سونپی عنانِ صبر کفِ نے سوار میں

کیا خوش ہوں وصلِ شاہدِ ناپائدار میں
ہے خاک گرد باد کی صورت انار[3] میں

تڑپا[4] کروں گا حشر تلک میں مزار میں
یا رب نہ موت آئے مجھے ہجرِ یار میں

ڈورے نہیں ہیں نشے کے چشمانِ یار میں
آہو اسیر ہو گئے دامِ شکار میں

ڈورے نہیں ہیں نشہ کے چشمانِ یار میں
آہو اسیر ہو گئے دامِ شکار میں

رویا لپٹ کے میں تو لگا کہنے ہنس کے یار
مانندِ ابر برق ہے تیرے کنار میں

۱۔ مصطفائی طبع دوم اور نسخہ مطبع ہدی طبع ۱۲۵۸ھ یہ غزل الگ نہیں ہے بلکہ پچھلی غزل کے ساتھ مسلسل ہے۔

۲۔ "اضطرار" مصطفائی طبع دوم۔ نسخہ مطبع ہدی طبع ۱۲۵۸ھ میں صحیح۔

۳۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخہ مطبع ہدی:
"ہے خاک گرد باد کی صورت کنار میں"

۴۔ یہ شعر نسخہ مصطفائی اور نسخہ مطبع ہدی طبع ۱۲۵۸ھ میں مقدم ہے۔

دونا ہے حسن سانپ نے ڈالی ہے کینچلی[1]
موباف کیا ضرور ہے گیسوئے یار میں

جس نے پہ وہ سوار ہوا[2] لشکر کیا
شیریں ادائیاں ہیں یہ اس نے سوار میں

گرتے ہیں تارے کرمک شب تاب کی طرح
کرتا ہوں آہ گر میں شب ہجر یار میں

بے لطف وہ مزہ[2] ہے نہ ہو جس میں لخت دل
روز ازل سے ربط ہے گل اور خار میں

اس سرو قد کا دست حنائی ہے شعلہ زن
یاں[3] آگ لگ رہی ہے یہ برگ چنار میں

بے یار خم میں یوں نظر آتی ہے موج مے
جس طرح اژدہا کوئی پھرتا ہے[4] غار میں

گر آنکھ ہے تو باطن انساں کی دید کر
کیا کیا طلسم دفن ہیں مشت غبار میں

ناسخ وہ محو عشق ہوں سمجھا میں زلف یار
پہنچا عذاب سانپ جو آئے مزار میں

۱۷۰

سر رگڑوں آستان بت نازنین سے میں
ہے جی میں داغ سجدہ مٹاؤں جبیں سے میں

۱۔ مصطفائی طبع دوم ۔ نسخہ مطبع مجدی طبع ۱۲۵۸ھ : ''کینچلی'' ۔
۲۔ مصطفائی طبع دوم ۔ نسخہ مطبع مجدی طبع ۱۲۵۸ھ : ''مزہ'' ۔
۳۔ مصطفائی طبع دوم ۔ نسخہ مطبع مجدی طبع ۱۲۵۸ھ : ''یہاں'' ۔
۴۔ مصطفائی طبع دوم ۔ نسخہ مطبع مجدی طبع ۱۲۵۸ھ : ''پھر'' ۔

کافی ہے سر پہ داغِ جنوں ، دل میں نامِ یار
بیزار ہوں فلک ترے تاج و نگیں سے میں
تصویرِ یار کی جو مجھے کھینچ دے کوئی
سمجھاؤں مرغِ دل کو گلِ کاغذیں سے میں
کہتا ہے چینِ گیسوئے مشکیں میں دل مرا
کچھ مرتبے میں کم نہیں خاقانِ چیں سے میں
آیا نہ کہکشاں میں یہ عالم نظر کبھی
کیا جلوہ[1] دیکھتا ہوں تری آستیں سے میں
دن رات ہے یہی سفرِ خشکی و تری
رکھتا ہوں کام شعر کی بحر و زمیں سے میں
ہے اُنس چینِ گیسوئے مشکیں سے جس قدر
رکھتا ہوں نفرت اتنی ہی چینِ جبیں سے میں
ناسخ نہ ہوجیو مگسِ خوانِ اغنیا
سنتا ہوں یہ سخن لبِ نانِ جویں سے میں

۱۲۱

بھرا رہتا ہے خونِ دل ہمیشہ دیدۂ تر میں
شراب اس کے عوض کب ہوگی ساقی اپنے ساغر میں
جو وہ خورشید تاباں خلق سے پوشیدہ ہے گھر میں،
بجائے ذرہ جاتی ہیں نگاہیں روزنِ در میں
ہمارے دل میں رہتا ہے تصور تیری آنکھوں کا
کھلے ہیں پھول نرگس کے یہاں شاخِ صنوبر میں

۱۔ مصطفائی طبع دوم ۔ نسخۂ بمبئی طبع ۱۲۵۸ھ : "جلوے" ۔

نہیں ہیں یہ صنم بھولے جو چمکے بت عدو بیٹھے ہیں
چھپی ہے یوں شرارت، ہوں شرارے جیسے پتھر میں

نہیں جلتا سرِ مو سبزۂ خط آتشِ رخ سے
تفاوت یاں نہیں بالوں میں اور بالِ سمندر میں

گلا مقتل میں ہم نے کیا مزے[1] لے لے کے کٹوایا
مگر کھولا ہے قاتل قند تو نے آبِ خنجر میں

مرا وعنا غزال آ کر لحد پر جا نہیں سکتا
کب ہے گلدام کا عالم یہاں پھولوں کی چادر میں

کیا ہے اس سراپا نور کو تحریر خط ہم نے
بجا ہے باندھیے گر بازوئے مرغِ منور میں

لبِ جاں بخشِ جاناں پر ہوا آغاز سبزے کا
نہیں معلوم کائی جم چلی ہے یا یہ کوثر میں

زباں دانتوں تلے دابی جو اس نے یہ نظر آیا
کہ ہے اک پارۂ یاقوت بھی اس سلک گوہر میں

صفِ مژگاں میں اس کی چشم وحشت زا نہیں ناسخ
کھڑا ہے کوئی آہو نیزہ بازوں کے یہ لشکر میں

۱۲۲

یاں ازل سے داغِ سودا ہے دلِ آگاہ میں
سنگ اسود جس طرح ہو نصب بیت اللہ میں

جا سکے کیا کوئی اس قاتل کی جولاں گاہ میں
سایۂ مژگاں بچھا دیتا ہے کانٹے راہ میں

۱- مصطفائی طبع دوم، نسخۂ مطبع مجتبائی طبع ۱۲۵۸ھ : "مزا" -

فیلسوف محتسب کی دیکھنا اے میکشو!
توڑتا ہے شیشہ مے میکدے کی راہ میں

آبرو ریزی جو غیروں کی ہوئی وقتِ گریز
آب پاشی ہو گئی میری شہادت گاہ میں

خلق نے بہتان پر باندھی کمر، کب ہے کمر
ہے کہاں اُس کا دہن اک بات ہے افواہ میں

حسنِ جاناں ایک عالم پر رہے ممکن نہیں
یاں کمی بیشی رہا کرتی ہے نورِ ماہ میں

دل میں رہتا ہے، پر آنکھوں کو نظر آتا نہیں
کیا تفاوت اب رہا اس بت میں اور اللہ میں

وہ بہشتی رو لگا بھرنے جو پانی ناز سے
ڈلو میں آیا نظر خورشید، یوسف چاہ میں

ہوں تری تاثیر کا قائل جو اے مضمونِ شوق
یار کو مکتوب پہنچے، نامہ بر ہو راہ میں

ہے وہ مجنوں جو نظر آتا ہے زیرِ آسماں
کون لیلیٰ ہے جنوں انگیز اس خرگاہ میں

مثلِ نرگس ایک ٹیلے[1] پر ہیں آنکھیں منتظر
کھل گیا اے گل یہ تیری فرقتِ جانکاہ میں

ہیں ملازم بادشاہِ حسن کی سرکار کے
ہم فلوسِ داغِ حسرت پاتے ہیں تنخواہ میں

بعدِ مردن اس کو راحت، اُس کو ہے حسرت نصیب
فرق اتنا ہی نظر آیا گدا و شاہ میں

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخہ مطبع مجدی :
''مثلِ نرگس ایک تنکے پر ہیں آنکھیں منتظر'' نسخہ ۱۰

جسم کاہیدہ ہے غم سے، دل ہے سوزاں داغ سے
شعلۂ آتش نہاں ہے اپنی برگِ کاہ میں

رشکِ نخلِ وادیٔ ایمن ہے ہر برگِ گیاہ
سنگ ریزے طور ہیں اُس کی تجلی گاہ میں

خوش عبث ہوتے ہیں نادان ماہِ نو کو دیکھ کر
اک مہینہ عمر کا ہوتا ہے کم ہر ماہ میں

سر بتوں کے آستانے سے نہ اٹھے حشر تک
یہ دعا ناسخ کی ہے یا رب! تری درگاہ میں

۱۲۳

بے سبب کیوں کر کہوں ہر گل ہے خنداں باغ میں
کچھ تو دیکھا ہے جو یوں نرگس ہے حیراں باغ میں

یوں تصور ہے دلِ پُر داغ میں اُس چال کا
جس طرح سے کبک ہوتے ہیں خراماں باغ میں

نیشِ عقرب کی طرح لگتی ہے ہر موجِ نسیم
موجِ گل بے یار ہے اب مارِ پیچاں باغ میں

پھینک دیں[1] ہر برگِ گل کو نوچ کر منقار سے
بلبلیں دیکھیں اگر رخسارِ جاناں باغ میں

ہوش رونے کا ہوا ہے کوئے جاناں کو چلیں
آئی ہے برسات تو جاتے ہیں انساں باغ میں

دیدۂ قمری اگر روشن ہوں تیرے نور سے
سرو بن جائیں ابھی سروِ چراغاں باغ میں

۱- مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع بھدی: "پھینک دے"۔

قطرۂ شبنم نہیں اے رشکِ گل تیرے حضور
عجز سے گل نے نکالے ہیں یہ دنداں باغ میں
ہجر میں ہے عندلیبوں پر سمندر کا گماں
ہو گیا آتش کدہ ہر اک خیاباں باغ میں
اٹھ گئی ہے کس کے روئے شعلہ افشاں سے نقاب[1]
عندلیبیں ہو گئیں سب مرغِ بریاں باغ میں
سامنے خورشید کے جس طرح پنہاں ہوں چراغ
ہو گئے یوں گل ترے آتے ہی پنہاں باغ میں
رنگِ عشرت کر گیا پروازِ باغِ دہر سے
مجھ کو حیرانی ہے گل کیوں کر ہیں خنداں باغ میں
ہاتھ آئے ہیں جو تجھ سے داغِ[2] عشق اے رشکِ گل
نخلِ گل ہیں صورتِ طاؤس رقصاں باغ میں
نکہتِ زلفِ صنم کے سونگھنے والے ہیں ہم
بوئے گل سے ہو دماغ اپنا پریشاں باغ میں
رات کو گلگشت کی اس نے تو یہ سمجھے تدرو[3]
سیر کو اترا فلک سے ماہِ تاباں باغ میں

۱۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجدی میں ''اٹھ گئی ہے کس کے روئے شعلہ افشاں سے نقاب'' درست ہے۔

۲۔ صرف مصطفائی طبع دوم میں ''داغِ عشقِ رشکِ گل'' چھپا ہے جو سہو کتابت ہے۔

۳۔ ''تذرو'': ایک قسم کا جنگلی مرغ جو نہایت خوش رنگ، خوبصورت اور خوش رفتار ہوتا ہے۔ یہ پرندہ استرآباد اور مازندران کے جنگلوں میں اکثر ہوتا ہے۔ اس لفظ کو چکوا کے معنی میں لینا اور دال مہملہ سے لکھنا غلط ہے۔ (نور اللغات، جلد دوم، ص ۲۳۸):-

۱۲۵

واں ہزاروں ہیں گریباں چاک ، یاں گل ہے نگار
مجھ کو یاد آتا ہے ناسخ کوئے جاناں باغ میں

۱۲۶

بیشتر[1] نشۂ ایجاد سے بے ہوش ہوں میں
خم گردوں بھی نہ تھا جب سے کہ مے نوش ہوں میں

بھاگتا ہوں مے گلرنگ سے میں کوسوں دور
فرقت یار میں مستوں کا مگر ہوش ہوں میں

حسرت وصل میں دریا کی طرح بہتے ہیں اشک
مثل ساحل ہمہ تن روز و شب آغوش ہوں میں

ناز سے خنجر قاتل نہیں ہوتا عریاں
ہوس قتل میں مدت سے کفن پوش ہوں میں

قطع کی زلفیں تو کر ڈال مرا سر بھی قلم
تو سبکدوش ہوا ، کیوں نہ سبکدوش ہوں میں

نہیں ممکن خم گردوں میں ٹھہرنا میرا
مستی عشق سے وہ بادۂ سرجوش ہوں میں

ہمہ تن وصف سراپا کے[2] صنم میں ہوں زباں
ایک وصف دہن تنگ میں خاموش ہوں میں

یار آتا ہے عیادت کو نہ تو آتی ہے
تیری خاطر سے بھی اے موت فراموش ہوں میں

۱- مصطفائی طبع اول ۔ نسخۂ مطبع تھذی : "پیشتر" ۔
۲- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع تھذی : "ہمہ تن وصف سراپائے صنم" ۔

اپنی آواز سے یہ انس ہے مجھ کو ناسخ
مثلِ دف بزمِ جہاں میں ہمہ تن گوش ہوں میں

۱۲۵

جو بے گناہ ہیں اُن کا بھی خون حرام نہیں
مقامِ عشق[1] ہے یہ کعبے کا مقام نہیں

نگارِ تیغِ زباں ہوں ، بسانِ زخمِ دہاں
دہانِ زخم سزاوارِ التیام نہیں

جو مجھ کو یار نے مارا تو غیر کو کرو قتل
عزیزو ! اس کے سوا اور انتقام نہیں

نہیں جہاں میں کوئی منکرِ امام ایسا
کہ شیخِ شہر کے سجدے میں بھی امام نہیں

عروجِ حسن میں کیونکر ہو تجھ کو بیمِ زوال
تو آفتابِ فلک ہے ، چراغِ بام نہیں

نہیں حلال کوئی شے یہاں بغیرِ شراب
اسی طرح سے بجز توبہ کچھ حرام نہیں

تمام صفحۂ عالم ہے ایک ہی صفحہ
سرِ کتاب کا یہ اک ورق تمام نہیں

نہ سجدۂ درِ جاناں سے سر اٹھاؤں گا
یہ وہ نماز ہے جس کا کبھی سلام نہیں

تمام خلق ہے گردش میں چرخِ مینائی
بس ایک قابلِ گردش ہمارا جام نہیں[2]

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی : "مقامِ عشق یہ ہے" ۔
۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی :
"بس ایک قابلِ گردش ہمارا جام نہیں"

محال پیری میں ہے لطف نوجوانی کا
چراغِ صبح میں نورِ چراغِ شام نہیں
جو خیر چاہے دلا، کر نہ عشق ابروئے یار
یہی ہے تیغ کہ جس کے لیے نیام نہیں
زمانہ محو ہوا دل جو ہے کسی پر محو
مرے نگینے میں ناسخ کسی کا نام نہیں

۱۲۶

بساؤں نافۂ مشکِ ختن مُوبافِ گیسو میں
لگاؤں سرمہ تیری خاکِ پا کا چشمِ آہو میں
جھکی رہتی ہیں پلکیں بہرِ سجدہ طاقِ ابرو میں
لکھا ہے آیۂ سجدہ مقرر صفحۂ رو میں
چمکتا ہے سنہرا رنگ ایسا اس پری رو کا
کہ ہے جزوِ بدن سونے کا تعویذ اس کے بازو میں
ترا کوچہ وہ گلشن ہے کہ جب اس کا خیال آیا
زیادہ ہو گئے سب داغِ دل پھولوں سے خوشبو میں
جو میزانِ خرد ہو، ہیں برابر اسفل و اعلیٰ
ہمیشہ سنگ و زر ہم وزن ہے دیکھو ترازو میں
دکھایا کہکشاں میں جلوۂ قوسِ قزح ہم کو
کئی رنگوں کے جب تعویذ باندھے اس نے بازو میں
عوض افسوں کے جادوگر مرے اشعار پڑھتے ہیں
کہ وقتِ فکر دل رہتا ہے اس کی چشمِ جادو میں
خطِ رخسارِ جاناں کے تصور میں جو روتا ہوں
تو ہے درِ نجف کی طرح مُو ہر ایک آنسو میں

کہاں وہ بو کہ جس سے مشکِ ازفر کا لہو سوکھے
بہ رنگِ زلف گو بل پڑ گئے ہیں شاخِ آہو میں

کبھی مسجد میں خم ہوتا نہیں مانندِ گلدستہ
جھکا ہے سر مرا جب سے تری محرابِ ابرو میں

ہزاروں پا بہ زنجیر اس کے ، یہ پابند ہے آہی
تفاوت ہے قدِ دلجو میں اور سروِ لبِ جو میں

کبھی ہے دھیان عارض کا ، کبھی یادِ مژہ دل کو
کبھی ہیں خار پہلو میں ، کبھی گلزار پہلو میں

خیالِ روئے جاناں میں جو ماروں ہاتھ زانو پر
عیاں ہو پنجۂ خورشیدِ تاباں میرے زانو میں

کسی میں زر، کسی میں سنگ یہ ہے پھیر قسمت کا
برابر گرچہ ناسخ دونوں پلّے ہیں ترازو میں

۱۲۷

دلِ بے تاب سے ہے پیچ و تاب اے جاں گیسو میں
کہ تھا سیماب جیسے جزوِ اعظم سار جادو میں

بدن ہے گورا گورا اور چہرہ ہے بھبھوکا سا
لگایا ہے گلِ لالہ خدا نے شاخِ شبّو میں

ہوا سے بلبل اڑ کر آئے[1] ہیں جو اس کے چہرے پر
غزالِ[2] چشم شوخی کر رہے ہیں چینِ گیسو میں

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی : "ہوا سے بال اڑ کر آئے ہیں" ۔
۲- مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع بھدی میں درست اور بامعنی ہے : "غزال چشم شوخی کر رہے ہیں" ۔

گزرتی ہے نسیمِ زلفِ یار اس راہ سے اکثر
نہ ہوگی روزنِ دیوار سے بو نافِ آہو میں

مشبّک[1] اس قدر تیری نگہ سے میں ہوا ہوں یوں
کہ ہے سوراخ موتی کی طرح ہر ایک آنسو میں

ہزاروں قتل ہوتے ہیں مگر یہ آب داری ہے
کہ لگتا ہی نہیں ہرگز لہو شمشیرِ ابرو میں

تصور اب تو کر موقوف اے دل تیرِ مژگاں کا
ہوئے ہیں خاک تودہ کی طرح سوراخِ پہلو میں

لکھا ہے نقش کوئی ساحری کا خونِ عاشق سے
نظر آتے نہیں یہ لال ڈورے چشمِ جادو میں

گماں ہے چار ابرو ہونے کا اس ماہ پر بے جا
عیاں ہے ابروؤں کا عکس یہ آئینہ رو میں

کوئی سر رکھ کے اس پر سو گیا تھا خواب میں اک دم[2]
رچی ہے نکہتِ زلفِ معنبر میرے زانو میں

اگر پرتو فگن گلشن میں وہ خورشیدِ تاباں ہو
ابھی ہڑتے ہیں عکسِ گل سے تبخالے لبِ جو میں

ترے بس میں جو مجھ کو دیکھتا ہے رو کے کہتا ہے
کوئی انساں نہ آ جائے کسی انساں کے قابو میں

تری آنکھیں نہیں یہ دونوں پلے ہیں ترازو کے
ہمیشہ نیک و بد کو تول ناسخ اس ترازو میں

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجدی: "مشبک اِس قدر تیرِ نگہ سے"۔
۲۔ نسخۂ مطبع مجیدی: "یکدم"۔

۱۲۸

خامشی مجھ کو ہوئی قفلِ دہن اِن روزوں
چھٹ گیا مشغلۂ شعر و سخن اِن روزوں

دہنِ یار کے مانند ہوا ہے معدوم
ڈھونڈتے پھرتے ہیں ہم اپنا دہن اِن روزوں

گم ہوئی ہے سری گلبانگ سے راہِ منقار
کیوں نہ ہوں گرمِ فغاں زاغ و زغن اِن روزوں

رشک مو سے کمرِ یار ہوں سر سے پا تک
کیا ہی کاہیدہ ہوا میرا بدن اِن روزوں

ناتوانی نے کیا مردہ مجھے جیتے جی
پیرہن تن پہ ہے مانندِ کفن اِن روزوں

زیست سے تنگ دل ایسا ہے کہ اب ڈوب مرے
نظر آئے جو کوئی چاہِ ذقن اِن روزوں

ہیں جفائیں جو یہی اہلِ وطن کی ناسخ
مجھ سے چھٹتا نظر آتا ہے وطن اِن روزوں

۱۲۹

سو ہیں جوہر ایک تیغِ ابروئے خمدار میں
ورنہ وہ بیکار ہے ، ہو بال جس تلوار میں

آفتابِ حشر پر ہے انتقام اس کا جو ہم
چین کرتے ہیں کسی کے سایۂ دیوار میں

دم بہ دم کوڑے لگاتا ہوں میں برقِ آہ کے
توسنِ عمرِ رواں تا گرم ہو رفتار میں

خط کو ہے دُرِ نجف کے بالوں سے تشبیہ تمام
کچھ نہ فرق آیا فروغِ عارضِ دلدار میں

مردمک دانہ ہے بہرِ مرغِ دل تو دام میں
نشے کے یہ لال ڈورے چشمِ مستِ یار میں

جو حسیں ہے گھر میں اُس کا بیٹھنا ممکن نہیں
ماہِ کنعاں کو پھرایا حسن نے بازار میں

ہے گماں خط کا جسے تجھ پر ہو اس کا منہ سیاہ
پڑ گیا ہے عکسِ زلف آئینہ رخسار میں

برگِ گل ہر ایک پر ہے ، غنچۂ گل ہے قفس
جانے نالہ نکہتِ گل ہے مری منقار میں

جا رہا ہے کوئے جاناں میں رقیبِ روسیاہ
زاغ نے باندھا ہے اپنا آشیاں گلزار میں

تھا بجائے شیرِ مادر ، شیرِ جوئے کوہ کن
پرورش پائی ہے میں نے دامنِ کہسار میں

میرے اشکِ گرم کا پیتے ہی قطرہ ، پڑ گئے
لاکھ تبخالے زبانِ مرغِ آتش خوار میں

آتشِ رنگِ حنا سے رقص میں رکھتے ہی ہاتھ
سیکڑوں بل پڑ گئے موئے میانِ یار میں

ہے تصور رات دن اک یاسمن رخسار کا
کیوں نہ آ جائے سفیدی دیدۂ بیدار میں

غسلِ میت جس کو کہتے ہیں وہ ہے غسلِ شفا
موت ہے بحرانِ کامل عشق کے آزار میں

دیکھ کر چشمِ ترِ عشاق کو کہتا ہے وہ
قطرۂ شبنم ہیں جامِ نرگسِ بیمار میں

ایسے لکھے رنگیں مضامین لاسخ نازک خیال
یک[1] قلم اوراقِ گل ہوں دفترِ اشعار میں

۱۳۰

دیکھ لے جوڑا بسنتی جب وہ جسمِ یار میں
پھولے کیوں سرسوں نہ چشمِ نرگسِ بیمار میں

لختِ دل غم نے پروئے آنسوؤں کے تار میں
دانۂ یاقوت بھی ہیں موتیوں کے ہار میں

سیکڑوں گردن کے ڈورے کیجیے اس پر نثار
باڑھ کا ڈورا وہ ہے قاتل تری تلوار میں

بھر کے مشکیں آبلوں کی اب پلا دیجے سبیل
پڑ گئے ہیں پیاس سے کانٹے زبانِ خار میں

چہرے پر ناسور دو ہیں خوں فشانی کے لیے
اور آنکھیں ہیں کسی کے روزنِ دیوار میں

کیا عجب تارِ کفن بن جائیں گر تارِ نگاہ
جان نکلی ہے بدن سے حسرتِ دیدار میں

کچھ نظر آئی نہ او کافر مجھے تیری کمر
سال ہا اُلجھی رہی تارِ نگہ زنّار میں

مار ڈالا بات میں، ٹھوکر سے زندہ کر دیا
سحر ہے گفتار میں، اعجاز ہے رفتار میں

رسم ملکِ حسن میں ہے گل فروشوں کی طرح
داغِ سودا بیچتے ہیں لالہ رو بازار میں

۱۔ نسخۂ مطبع مجتبائی طبع ۱۲۵۸ھ: "ایک قلم" ہے۔

آفتابِ عارضِ تاباں نظر آتا نہیں
سایہ ساں پھروں پڑا رہتا ہوں کوئے یار میں

کیا لطافت ہے کہ منہ میں پان جب اس نے لیا
سبزۂ خط سا نظر آنے لگا رخسار میں

فصلِ گل ہے، سارے خارستاں گلستاں ہوگئے
لختِ دل مژگاں میں ہیں، خونِ کفِ پا خار میں

موسمِ گل کر گیا پروازِ باغِ دہر سے
یاں ابھی تنکے ہیں بہرِ آشیاں منقار میں

طرز آڑائی ہے پیارے نالۂ دل دوز کی
چھید پڑ جائیں نہ کیوں منقارِ موسیقار میں

ہمصفیرو! گوش بر آوازِ ہو اِک دم رہو
نالۂ موزوں ہیں کچھ باقی ابھی منقار میں

۱۳۱

ہے ستارہ ذو ذنب یا رخ ہے زلفِ یار میں
خال ہے خورشید میں یا تل ہے یہ رخسار میں

دیکھ لے گر سالکِ سرِ حلقۂ زلفِ یار میں
دالت سارے کند ہو جائیں جہانِ مار میں

ہم زبانِ شمع سے سنتے ہیں ہجرِ یار میں
چاہیے گھل گھل کے مرنا عشق کے آزار میں

بدنما ہے کیچلی جب تک ہے جسمِ مار میں
حسن ہے موباف سے وہ چند زلفِ یار میں

میرے دل میں ہے غمِ خال و خطِ جاناں سے داغ
مشک بھی تھوڑا چھڑک دو سرمۂ زنگار میں

کور کو آنکھیں ہوئیں ، رونا ہو کم ، ممکن نہیں
ہوتی ہے اکثر سفیدی ابر ِ دریا بار میں

مثل ِ شانہ عشق ِ گیسو میں ہوا ہے چاک چاک
تار ِ گیسو سے لگیں ٹانکے دل ِ افگار میں

ہے اثر کس کی نگاہ ِ تفرقہ انداز کا
بلبلیں ہیں دام میں ، آوارہ گل بازار میں

گرمیٔ بازار ِ یوسف آگے اس یوسف کے کیا
منہ دکھاتے ہی لگا دے آگ جو بازار میں

جو کہ ہیں خوں خوار ان کو رنج دنیا میں نہیں
خندہ ہے موجود جب دیکھو لب ِ سوفار میں

کب چھٹے ایذا رسانی موذیوں کی بعد ِ مرگ
استخواں لگتا ہے ظالم کا ہر اک سوفار میں

راہ ِ خوں ریزی میں او قاتل جو رکھا ہے قدم
چلتے چلتے پڑ گئے چھالے تری تلوار میں

آفتاب ِ حشر بھی مجھ کو بچا کر جائے گا
سونے والا ہوں کسی کے سایۂ دیوار میں

ساقی ِ کوثر پلاتا ہے مے ٔ خم ِ غدیر
مست ہوں ناسخ میں عشق ِ احمد ِ مختار میں

۱۳۲

وحشت ِ وحشت میں مجھے فکر ِ تن ِ عریاں نہیں
خار ہوں لیکن خیال ِ گوشۂ داماں نہیں

باغ میں وہ گل ہے خنداں ، ناسخ ِ گریاں نہیں
ہے طلسم ِ تازہ ، خالی برق ہے باراں نہیں

ڈر نہیں گر وقت بے وقت آئیں باہر طفلِ اشک
شیر کے ناخن کی ہیکل ہے صفِ مژگاں نہیں

ایک شقِ آفتاب اُس میں نمایاں دو ہلال
ہے[1] عیاں دو معجزے ، خندان لبِ جاناں نہیں

مثلِ فانوسِ خیالی گرد تصویریں بھی ہیں
کون ہے اس شمع رو کا جو بلاگرداں نہیں

نورِ رُخ میں یہ عیاں ، پنہاں وہ پیشِ آفتاب
تیرے دانتوں کے برابر اخترِ تاباں نہیں

خار اور خونخوار ہیں باغِ جہاں میں ہم نصیب
موسمِ گل میں شگفتہ غنچۂ پیکاں نہیں

شکلِ صاحب درد و بیدرد ایک سی ہے پر ہے فرق
زخم ہیں ہرچند خنداں پر لبِ خنداں نہیں

جائے کافور سحر بھی مشک افشاں ہے فلک
سایۂ زلفِ صنم ہے یہ شبِ ہجراں نہیں

ہم نے گل دیکھے ہزاروں سوجھتا ہے اُس کو خاک
نرگسِ شہلا برنگِ دیدۂ حیراں نہیں

دوں میں آنکھوں میں برنگِ مردمِ دیدہ جگہ
پر کروں کیا بزمِ عالم میں کوئی انساں نہیں

لاغری سے یاں نہیں ہے جسم لیکن جان ہے
جس طرح سے جسم تصویروں کا ہے اور جاں نہیں

کیا عجب گر مے کشی ہو عہدِ پیری میں مباح
شرب اکلِ طفل ہے ، منہ میں اگر دلداں نہیں

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہادی طبع ۱۲۵۸ھ : "ہیں" ۔

گو نظر آتا نہیں لیکن دہانِ یار ہے
کون کہتا ہے جہاں میں چشمۂ حیواں نہیں

نامۂ اعمال ناسخ ہے تری زلفِ سیاہ
آفتابِ حشر ہے یہ عارضِ تاباں نہیں

۱۳۳

کیوں نفسِ داغِ جنوں پر آج مشک افشاں نہیں
کیا دلا تجھ کو خیالِ گیسوئے جاناں نہیں

آفتابِ حشر بھی تلرا ہے اُس کی شام کا
گردشِ ایّام میں صبحِ شبِ ہجراں نہیں

وصل کی شب ہو چکی صبحِ قیامت ہے عیاں
صور کی آواز ہے، مرغِ سحر نالاں نہیں

کل تلک آراستہ دیکھی ہے جس جا بزمِ رقص
آج واں کوئی بگولوں کے سوا رقصاں نہیں

کل جہاں چاؤش کرتے تھے صدائے دورباش
غیرِ شیر و گرگ آج اُس جا کوئی درباں نہیں

سبزۂ خط ہے دہانِ یار نظروں سے نہاں
خضر ہے لیکن نشانِ چشمۂ حیواں نہیں

تیرِ قاتل کو سمجھتا ہوں برلگِ شاخِ گل
گل یہ ہے بولدی[1] نہیں ہے، غنچہ ہے پیکاں نہیں

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مہدی : ''بولدی''۔ (بولدی : (ہ) مونث بہ معنی جوار کی بالی۔ وہ کلی جو قریب کھلنے کے ہو)۔ بولدی (ہ بفتح اول و سکون دوم و سوم و کسر چہارم۔ مونث) درخت کا کلا جو پھول گرنے کے بعد پھوٹے۔ جوار کی بالی۔ کچنار کا پھول (بولدی واؤ معروف) راجپوتانہ کے ایک شہر کا نام جہاں کی گنگار آبداری میں مشہور ہے۔ اسی وجہ سے ہر عمدہ کٹار کو بولدی کہتے ہیں۔ (نور اللغات، حصہ اول، ص ۱۰۰) م

چشمِ تر کو کیوں نہ ہو دستِ حنائی کا خیال
کب سمندر ہے کہ جس میں پنجۂ مرجاں نہیں

وا ہیں اپنے دیدۂ تر انتظارِ یار میں
کھل رہے ہیں یاں کنول لیکن مہِ تاباں نہیں

ہجر میں روؤں نہ کیوں رونے کے یہ ایام ہیں
سخت بے موقع ہے گر برسات میں باراں نہیں

بت پرستی کیا بری ہے ، گر خدا ملتا نہیں
کفر[1] میں کامل ہو ناسخ ، گو تجھے ایماں نہیں

۱۳۲

پہنچا ستاں پہ اس کے ابھی میرا سر کہاں
نخلِ مرادِ عشق نے پایا ثمر کہاں

طولِ شبِ فراق کے شکوے سے فائدہ
میں جاں بلب ہوں مجھ کو امیدِ سحر کہاں

ترکیب کو کمال ہے تاثیر زاہدا!
بے بادہ ہے دعائے قدح میں اثر کہاں

جاتا ہے صیدگہ میں[2] وہ چھوڑ کر مجھے
اے مرغِ روح تیرے گئے بال و پر کہاں

آنکھوں میں منتظر ہیں عبث پارہ ہائے دل
آتا ہے ناوکِ نگہِ یار ادھر کہاں

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع مجلائی :
"کفر میں کامل ہو ناسخ گر تجھے ایماں نہیں"

۲- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع مجلائی :
"جاتا ہے صید گاہ کو وہ چھوڑ کر مجھے"

ہو خاک کوئی منعمِ ظالم سے منتفع
حلقوم آبِ تیغ سے ہوتا ہے تر کہاں

حاصل نہیں ہے دستِ تمنا کو غیرِ یاس
اس باغ میں چنار نے پایا ثمر کہاں

ظالم سے اہلِ فیض کو ہوتا نہیں گزند
ہے نخلِ میوہ دار کو رنجِ تبر کہاں

نفرت شبِ وصال ، سحر سے لے کر دلا
اک دن شبِ فراق میں ہے یہ سحر کہاں

ہم[1] کو تری کمر کی صنم ہے عبث تلاش
جس کو خدا چھپائے وہ آئے نظر کہاں

عاشق ہے پر ابھی نہیں فرقت ہوئی نصیب
ہے اضطراب کی تجھے ناسخ خبر کہاں

۱۴۵

غیرِ کوثر کسی دریا کا میں سبّاح نہیں
بیشۂ شیرِ خدا بن کہیں سیّاح نہیں

بولے سب دیکھ کے گلشن میں اسے میرے بغیر
گل ہے بلبل نہیں ، ممدوح ہے مداح نہیں

دور ساحل ہے تو ہو تہ تو ہے کشتی کے تلے
جوشِ طوفاں ہے مددگار جو ملّاح نہیں

۱۔ صرف مصطفائی طبع اول میں اس شعر اور مقطع کا ایک ایک مصرع لے کر مقطع اس طرح درج ہے جو سہو کتابت ہے :
"ہمکو تری کمر کی صنم ہے عبث تلاش
ہے اضطراب کی تجھے ناسخ خبر کہاں"

ظلم طولِ شبِ فرقت کے تطاول نے کیا[1]
داد رس کوئی بجز فالق[2] الاصباح نہیں

زخمِ خنداں سببِ حسن ہوا گل کے عوض[3]
ہوں وہ مجروح کہ منت کشِ جرّاح نہیں

سبزۂ پشتِ لبِ لعل کو حجّام نہ چھو
خطِ یاقوت یہ ہے قابلِ اصلاح نہیں

ہے ہوس یار ملے ہم سے، کرے غیر کو ترک
مطلب اپنا وہ ہے جو قابلِ انجاح نہیں

روشنائی سے ہوئی روشنیٔ خلوتِ فکر
جز قلم اور مری بزم میں مصباح نہیں

ہیں جو اربابِ توکل وہ ہوں کس کے محتاج
کشتیٔ نوح کو کچھ حاجتِ ملّاح نہیں

غم نہیں خلق اگر دشمنِ جاں ہے ناسخ
ملک الموت سوا قابض[4] الارواح نہیں

۱۳۶

کوئی اے سفّاک ایسا ناتواں ہوتا نہیں
زخم کاری ہے لہو اپنا رواں ہوتا نہیں

تیرے ہونٹوں پر غبارِ خط عیاں ہوتا نہیں
آتشِ یاقوت کا جیسے دھواں ہوتا نہیں

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی طبع ۱۲۵۸ھ میں ''کیا'' درست ۔
۲- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : ''خالق الاصباح'' ۔
۳- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی طبع ۱۲۵۸ھ :
''زخم خنداں سببِ حسن ہوا گل کی روش''
۴- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : ''قابضِ ارواح'' ۔

دل ہی اُس کا جانتا ہے جس پہ گزرا ہے یہ حال
عشق کا صدمہ زبانوں سے بیاں ہوتا نہیں

کر دیا ہے عیب بیں، چشمِ تصوّر نے مجھے
حسن تیرا لاکھ پردوں میں نہاں ہوتا نہیں

خاکساروں سے ہے ہر جا سرکشوں کی سرکشی
وہ زمیں ہے کون جس پر آسماں ہوتا نہیں

جو سعادت مند ہیں رہتے ہیں وہ بے خانماں
دہر میں پیدا ہما کا آشیاں ہوتا نہیں

ہاتھ اپنے طوق ہوں کس میں کمر ہے بے نشاں
کس کا بوسہ لیجیے، ظاہر دہاں ہوتا نہیں

جتنے ہیں صاحب سخن اُن کی طبیعت نرم ہے
ہے دلیل اس پر زباں میں استخواں ہوتا نہیں

دم ہے چھوٹک جسمِ عاشق میں، ہے خامی کی دلیل
خوب جل جاتی ہے جو شے پھر دھواں ہوتا نہیں

عشق کا ہو درد اے ناسخ نہ کیونکر لادوا
زخم ہائے تیرِ مژگاں کا نشاں ہوتا نہیں

۱۳۷

ہو جو تیرا روئے رنگیں پرتو افگن آب میں
جائے ماہی بلبلوں کا ہو نشیمن آب میں

کھول دے زلفیں لبِ دریا کہ لہریں شرم سے
ڈوب جائیں صورتِ زنجیرِ آہن آب میں

تو لبِ دریا اگر جائے اندھیری رات کو
قمقمے سارے حبابوں کے ہوں روشن آب میں

ہے جو افتادہ اُسے کیا ضربِ دشمن سے گزند
تیر لگنے سے نہیں پڑتا ہے روزن آب میں

رات دن روتا ہوں اک خورشید رو کے عشق میں
کیوں نہ مثلِ نیلوفر ہوں تا بہ گردن آب میں

لعلِ خنداں کا تصور دیدۂ گریاں میں ہے
دیکھنا لعلِ بدخشاں کا ہے معدن آب میں

جمع ہوتے ہیں نہانے کو ہزاروں گل بدن
روز آتے ہیں نظر پھولوں کے خرمن آب میں

پاک ہیں آلودگی سے جو ہیں وارستہ مزاج
تر نہیں ہوتا کبھی صرصر کا دامن آب میں

تو نے منہ دریا میں دھویا ہے جو اے رشکِ چمن
شاخِ گل موجیں بنیں، پھولا ہے گلشن آب میں

جو ہوا باآبرو دنیا میں وہ ہے دل فگار
جیسے پڑتا ہے گھر بننے سے روزن آب میں

وہ اِدھر رخصت ہوا، اُٹھا اُدھر طوفانِ اشک
تیرتا جاتا تھا اُس قاتل کا توسن آب میں

ہیں بری اہلِ فنا سیلِ بلائے دہر سے
غرق ہوتا ہے کوئی کب بعدِ مردن آب میں

دیتی ہے اکثر زبانِ چرب آفت سے نجات
جس طرح ہوتا نہیں ہے غرق روغن آب میں

کیوں سراپا مچھلیاں پُرخار آتی ہیں نظر
کیا تری پلکیں ہوئی ہیں سایہ افگن آب میں

کس قدر اعمال[1] سے خفت اٹھائی بعدِ مرگ
کیا عجب ترتا پھرے گر سنگِ مدفن آب میں

جو کوئی نکلا وطن سے خوں ہوا اُس کا جگر
سبز ہے جب تک کہ ہے مرجاں کا مسکن آب میں

یوں جہاں میں ہر ہے رزقِ عالمِ بالا پہ دھیان
ہے صدف محتاجِ نیساں اور مسکن آب میں

مے کشی سے یہ دلِ سوزاں ہے نالاں ہجر میں
آگ کا معمول ہے کرتی ہے شیون آب میں

گریہ ہے ترسا بچوں کے غم میں ناسخ جوشِ اشک
کیا تعجب غرق ہو جائے جو لندن آب میں

۱۳۸

سوائے مکر زمانے میں رسم و راہ نہیں
وہ کون جا ہے جہاں چاہ زیرِ کاہ نہیں

میں گو کہ حسن سے ظاہر میں مثلِ ماہ نہیں
ہزار شکر کہ باطن مرا سیاہ نہیں

ہوئی ہے مجھ کو جرس سے یہ بات اب ثابت
شکستہ دل جو ہوا اُس کے لب پہ آہ نہیں

جگر کے داغ ہیں بے لطف، گر نہ ہو ناسور
جہاں میں کون ہے وہ باغ جس میں چاہ نہیں

ہمیشہ کام میں غیروں کے ہیں سعادت مند
ہما کو اپنے لیے فکرِ عز و جاہ نہیں

۱۔ نسخۂ مصطفائی طبع دوم میں ''اعمال'' کے بجائے ''آمال'' لکھا ہے۔

عبث ہے یار کو مجھ دل جلے کے قتل میں سوچ
چراغِ کشتہ کا کوئی بھی داد خواہ نہیں

سفیدیٔ کفنِ مردہ سے ہے واں مہتاب
شبِ لحد بھی مرے روز سے سیاہ نہیں

جما ہے بزمِ صنم میں رقیبِ سبز قدم
میں کیونکر اس کو اکھاڑوں وہ کچھ گیاہ نہیں

گرا تھا جس میں عزیزو کبھی مہِ کنعاں
ہنوز چشمۂ خورشید ہے وہ چاہ نہیں

ہجومِ فوجِ عدو سے جہاں میں اے ناسخ
سوائے قلعۂ مرقد کہیں پناہ نہیں

۱۳۹

مردِ وارستہ کہیں قیدِ مکاں کرتا نہیں
طائرِ نکہت خیالِ آشیاں کرتا نہیں

روز اک شام و سحر کرتا ہے پیدا بہرِ خلق
صبح میری شامِ غم کو آسماں کرتا نہیں

رشک ہے جن کا خدا کو بھی یہ وہ ہیں زاہدا
کچھ تو دیکھا ہے جو میں ترکِ بتاں کرتا نہیں

ہوں میں دیوانہ ، ہوا گر چپ تو چپ ہی رہ گیا
اس لیے میں ایک دم ضبطِ فغاں کرتا نہیں

ہے ہر اک آفت سے ایمن مسکنِ اہلِ فنا
باغِ جنّت کو خدا ہرگز خزاں کرتا نہیں

رحم کر عشّاق پر گر چاہیے عمرِ دراز
پیرِ گردوں طفلِ ظالم کو جواں کرتا نہیں

کیا خراباتِ جہاں ہے اپنی توبہ سے خراب
کوئی بھی اب مے فروشی کی دکاں کرتا نہیں

عیب اپنے آپ کر دیتے ہیں ہم بدمست فاش
شیشۂ مے جس طرح مے کو نہاں کرتا نہیں

ہائے یہ کہنا ترا رکھ کر مری چھاتی پہ ہاتھ
اب تو اس دم نالۂ آتش فشاں کرتا نہیں

جامِ مے میں دیکھتا ہوں میں جہاں کو مثلِ جم
گو سکندر کی طرح سیرِ جہاں کرتا نہیں

ہے میانِ یار ممکن ، جسمِ ناسخ ممتنع
عشق ایسا بھی کسی کو ناتواں کرتا نہیں

۱۴۰

سربکف پھرتا ہوں میں ، لیکن کوئی قاتل نہیں
گردنِ خم گشتہ شاید تیغ کے قابل نہیں

اُس پری پیکر کے سر سے پاؤں تک اک تل نہیں
ہے عجب کافور جس کو حاجتِ فلفل نہیں

زندگانی خلق کو ہے دستِ قاتل سے محال
کشتۂ حسرت ہے ، جو تلوار سے بسمل نہیں

ہو رہا ہے کیا چمن بے بلبلِ نالاں اداس
داغِ حسرت ہیں مرے سینے میں لیکن دل نہیں

سمجھے گھر غفلت میں گو ہم خانۂ زیں کو والے
توسنِ عمرِ رواں رفتار سے غافل نہیں

کیا ہے نسبت ماہِ نو کو ابروئے خمدار سے
تیغ کی صورت ہے پر اُس کا کوئی گھائل نہیں

رات دن رہتا ہے یارانِ عدم کا اشتیاق
کوئی میرا نامہ بر جز طائرِ بسمل نہیں
گر شبیہ اُس طفل کی بن جائے ہر طفلِ سرشک
اے مصوّر[1] تیری صنّاعی کو کچھ مشکل نہیں
سبزۂ خط کی اُسی[2] سے ایک دن ہوگی نمود
تخمِ ریحاں ہے، عذارِ یار پر یہ تل نہیں
کس کا نالہ ہے نہیں ہے جس میں فریادِ جرس
کون وہ سینہ ہے اُس لیلیٰ کا جو محمل نہیں
غرقِ دریائے شہادت ایک عالم ہو گیا
ناسخ آبِ تیغِ قاتل کا کہیں ساحل نہیں

رخشہ

۱۴۱

کیا بحرِ حسن کی ہے کمر پیچ و تاب میں
یہ پیچ و تاب کب ہیں بھلا موجِ آب میں
ہے ہجر مجھ میں تجھ میں یہ موہوم زندگی
اک دم جدا ہوا سے ہوا ہے حباب میں
صدمے دیے ہیں مجھ کو یہ اک رشکِ حور نے
مصروف ہیں ہزاروں فرشتے حساب میں
تعبیر ہے کہ یار کی پڑ جائے گی نگاہ
بجلی گری ہے رات کو کل مجھ پہ خواب میں

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجیدی:
"اے تصور تیری صنّاعی کو کچھ مشکل نہیں"
۲- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجیدی:
"سبزۂ خط کی امی سے ایک دن ہوگی نمود"

تلوار میوۂ حلق پہ حسرت نے پھیر دی
اک جا جو دیکھے عاشق و معشوق ڈاب میں

شب سے زیادہ صبح ہماری ہوئی سیاہ
جو شیب میں کیا ، نہ کیا تھا شباب میں

نسبت ہے کیا ہلال کو اس کی رکاب سے
خالی ہلال ہائے حنائی رکاب میں

ہم مست بھی ہیں تارکِ لذّات زاہدا
اک دن تو دیکھ کیسی ہے تلخی شراب میں

سودائے چشم یار کی ہے یہ بھی اک دلیل
خشکی کمال ہے جو ہرن کے کباب میں

بحرِ فنا میں مجھ سے ہے سائل زبانِ موج
ہے روح جسم میں کہ ہوا ہے حباب میں

صبحِ شبِ وصال کے ہوتے ہی ہم کہاں
ہے زہر ساقیا قدحِ آفتاب میں

کیا پڑ گیا ہے عکس تری چشمِ مست کا
نرگس کی شاخ بن گئی ہر موجِ آب میں

بحرِ فنا میں ضد ہے تعیّن سے یک دگر
پانی جو موج میں ہے وہی ہے حباب میں

پیاسا رہے ہمارے لہو کا یونہی رقیب
تلوار کی طرح ہو اگر غرق آب میں

اے کلکِ فکر ایسی غزل اس زمیں میں لکھ
چھانٹا نہ جائے شعر کوئی انتخاب میں

۱۴۲

عکس اُس کی زلف کا نہیں جامِ شراب میں
بال آتے ہیں نظر قدحِ آفتاب میں

مستوں کا عیش تلخ ہے دیرِ خراب میں
یہ رمز ہے جو ہوتی ہے تلخی شراب میں

غوّاص اپنی فکر ہوئی جب کہ آب میں
دریائے موج زن نظر آیا حباب میں

آئی قیامت اُس نے لگایا ہے منہ سے جام
ہے اتّصال ماہ میں اور آفتاب میں

غفلت سے اپنا طالبِ دیدار آپ ہوں
میرا ہی چہرہ ہے جو نہاں ہے نقاب میں

دیکھیں ثبات اہلِ زمین آسمان کا
ہے صاف آسمان کا نقشہ حباب میں

ہے جی میں آفتاب پرستوں سے پوچھیے
تصویر کس کی ہے ورقِ آفتاب میں

عاشق نہیں ہے کون دُرِ گوشِ یار کا
عالم ہے غرق ایک ہی موتی کی آب میں

ساغر میں عکسِ رخ، رخِ گلگوں پہ ہے عرق
موتی جو آگ میں ہے تو شعلہ ہے آب میں

ہوتے[۱] ہی روز اُس گلِ بے خار کے حضور
تارِ شعاع خارِ گلِ آفتاب میں

۱- مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجیدی : "ہوتے ہیں روز" -

آرام سے وہی ہے جو پھیرے خدا سے منہ
دیکھو ہے مرغِ قبلہ نما آفتاب میں

بیدار دل جو ہیں آنھیں سونے سے کیا ضرر
یوسف[۳] ہوا ستاروں کا مسجود خواب میں

غفلت سرائے دہر میں ہے غافلوں کی چاہ
انسان دور دور سے آتے ہیں خواب میں

عبرت کے واسطے یدِ قدرت نے غافلو!
کھینچی شبیہِ افسرِ شاہی حباب میں

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
ناسخ ہیں خاکِ رہگذرِ بوتراب میں

۱۴۳

اُس گل کی شکل پھرتی ہے چشمِ پُر آب میں
اشکوں میں لختِ دل نہیں، گل ہیں گلاب میں

دُونی بہارِ حسن ہے کیفِ شراب میں
بھڑکے نہ کیونکر آتش رنگِ گل، آب میں

ساقی کہاں شراب ہے دیرِ خراب میں
پانی کی ہے تلاش عبث اس سراب میں

ہم عرش تک پہنچتے ہیں کیفِ شراب میں
دشوار قطعِ راہ نہیں آفتاب میں

اُس کی نگاہ پڑتی[۱] ہے چشمِ پُر آب میں
گویا کہ برق کوندتی[۲] رہی ہے سحاب میں

۱- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع پھدی: ''اُس کی نگاہ پھرتی ہے''۔
۲- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع پھدی: ''گویا کہ برق کوندہ رہی ہے''۔

پنہاں ہے وہ بہار ہے اس کے سحاب میں
نسبت ہے کیا شراب میں اور آفتاب میں
روشن ہے داغ گریۂ چشمِ پُر آب میں
پوشیدہ آفتاب نہیں ہے سحاب میں
کرتا ہے اک جہان بسر شب کو خواب میں
ہوں کیوں نہ مست بادۂ غفلت شباب میں
دریا ہوا ہے رشکِ فلک عکسِ یار سے
خورشید جلوہ گر ہیں ہر موجِ حباب میں
دم بھر یہ بزمِ عیش غنیمت ہے ساقیا
ہم بادہ خواری کرتے ہیں جامِ حباب میں
بے وجہہ زلفِ یار الجھتی ہے بار بار
کیونکر رہے نہ موئے کمر پیچ و تاب میں
لیتے ہیں رنج مرشدِ کامل مرید کا
مہتاب میں ہے داغ جلن آفتاب میں
سب بولے برجِ قوس میں داخل ہے آفتاب
رکھا جو اس نے پائے حنائی رکاب میں
بالوں میں یوں وہ گوشۂ ابرو نظر پڑا
ہو جس طرح ہلال نمایاں سحاب میں
بے یار جام میں مرے آنسو ٹپک پڑے
پیتے ہیں جیسے پانی ملا کر شراب میں
چھوڑی نہیں عذارِ عرقناک پر یہ زلف
گویا کہ تو نے مشک ملایا گلاب میں
کیوں بال خوری کا ہے خطِ یار میں گماں
ہم سے ستو لگا ہے یہ کیڑا کتاب میں

ہے رات چودھویں مجھے ساقی پلا شراب
روشن ہو آفتاب شبِ ماہتاب میں
فاسخ نہیں ہے اس کے سوا فخر کچھ مجھے
ہوں امتِ جنابِ رسالتؑ مآب میں

۱۲۲

سہ گیا میں بے قراری سے اسے کچھ غم نہیں
کشتۂ سیماب ہوں جو لائقِ ماتم نہیں
بوستانِ وصفِ عرق آلودہ رخ میں ہے کتاب
حرف ہیں یہ گل نہیں ، نقطے ہیں یہ شبنم نہیں
اس قدر مجھ کو بخیلوں سے پڑا دنیا میں کام
اتنی شہرت پر یقینِ ہمتِ حاتم نہیں
یہ دہانِ جام سے آواز آتی ہے مدام
آج یاں جز کاسۂ سر کچھ نشانِ جم نہیں
نام تیرا میرے ہونٹوں سے جدا ہوتا نہیں
اب پری پیکر دہن میرا کم از خاتم نہیں
ہو مرا محبوب میرے درد کا کیونکر شریک
شکوہ بیجا ہے کہ کچھ وہ اور میں توام نہیں
رونگٹا آن پر نہیں اس پر عیاں خطِ شعاع
تیرے گالوں کے برابر نیرِ اعظم نہیں
گزرے عاشق اپنے معشوقوں سے تجھ کو دیکھ کر
سامنے خورشید کے ربطِ گل و شبنم نہیں

۱- یہ شعر مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع ہدی میں مقدم ہے ، یعنی غزل کا بارھواں شعر ہے ۔

تو جو آیا باغ میں تو چشمِ بد کے واسطے
آگ ہے یہ گل نہیں ، اسپند ہے شبنم نہیں

ابروئے قاتل پہ جی دیتے نہیں انساں عبث[1]
پیکرِ و شمشیر و خنجر میں بھی ہرگز دم نہیں

تر وہ گل ہے آبِ خجلت سے جو میں رویا بہت
خوب سی بارش نہ ہو جب تک دلا شبنم نہیں

ہوتی ہے سامانِ غفلت سے بھی اک عبرت مجھے
جام سے دیکھا تو دھیان آیا جہاں میں جم نہیں

اپنے استغنا سے ہے باغِ جہاں ایسا خجل
کون شاخِ پُر ثمر ہے جس کی گردن خم نہیں

رنگ اسے کہتے ہیں بنتا ہے عرق منہ پر شہاب
اختلاطِ گل سے رنگیں قطرۂ شبنم نہیں

باعثِ رنجِ اہلِ دنیا سے ہے ناسخ گفتگو
غیرِ خاموشی ہے زخمِ دہاں مرہم نہیں

۱۲۵

صبحِ فرقت ، تیرگی میں شام سے کچھ کم نہیں
چاند نکلا ہے افق سے نیّرِ اعظم نہیں

جانور ہے ، جس کو عشقِ کاکلِ پُر خم نہیں
جو[2] نہ آ جائے فریبِ یار میں ، آدم نہیں

۱- مصطفائی طبع اوّل و دوم - نسخۂ مطبع مجتبائی :
''ابروئے قاتل پہ جی دیتے نہیں انساں فقط''۔
۲- نسخۂ مطبع مجتبائی : ''جو نہ آ جائے فریبِ مار میں'' -

اپنی صورت پر کیا پیدا آپ نے اللہ نے
کیوں سزاوارِ پرستش صورتِ آدم نہیں

ہے فروتن اس لیے زاہد کہ ہوں سب سرنگوں
قامتِ محراب کچھ بہرِ تواضع خم نہیں

نکہتِ[1] گل کہتی جاتی ہے زبانِ موج سے
قابلِ نظارہ رنگِ گلشنِ عالم نہیں

جان پڑ جاتی ہے اس میں جس سے ہوتا ہے دوچار
عکس بھی جاناں ترا آئینے میں بے دم نہیں

مر گیا میں سونگھ کر آترا ہوا موباف ِ زلف
یہ غلط میں جانتا تھا کینچلی میں سم نہیں

زلف سے مل کر کیا غارت دلِ پُر داغ نے
سانپ اور طاؤس سا بھی دشمنِ آدم نہیں

شام کے ہوتے ہی کیوں آنے نظر آثارِ صبح
وصل کی شب اور روزِ ہجر گر توام نہیں

جام کو کیا دیکھ کر حیران ہے بیجا شراب
کم ہوئی جمِ غفیر اے دل فقط کیا جم نہیں

قہر ہے ترکِ نماز آیا نظر ماہِ صیام
میکدے میں آج کیوں شیشے کی گردن خم نہیں

کر سلیاں وہ پری رو ہے دیارِ حسن میں
قامتِ خم گشتہ اپنا بھی کم از خاتم نہیں

راست[2] ہونے سے نہ کھونکر پیشِ چشمِ مستِ یار
جام ہی لبریز ہے، شیشے کی گردن خم نہیں

۱۔ مصطفائی طبع دوم ۔ نسخہ مطبع ہدی : "نکہت گل کہتی جاتی ہے۔"
۲۔ مصطفائی طبع دویم اور نسخہ مطبع ہدی میں "راستو ہو بنی" پڑھا جاتا ہے۔

کیوں مقابل ہے یہ روزِ ہجر کا پیلِ سفید
ناتواں ہوں میں مریضِ عشق ، کچھ رستم نہیں
شکل ان کی دیکھ کر ہوتا ہے استغنا مجھے
یہ بخیل اس عہد کے ناسخ کم از حاتم نہیں

۱۲۶

ہے عرق آلودہ رُخ پر زلفِ جاناں ، غم نہیں
سلسلہ پانی کا جو ہے زینہار اُس میں سم نہیں
لال مجھ پر روئے گل گوں یار کا کس دم نہیں
کب مزاجِ کاکلِ عنبر فشاں برہم نہیں
مر گیا میں ، گل عذاروں کی مژہ پُر نم نہیں
یہ عجب گل زار ہے جو قطرۂ شبنم نہیں
اہلِ دولت کو اگر ہے بخل ، مطلق غم نہیں
ہم کو بھی حاجت نہیں دنیا میں گر حاتم نہیں
میرے مرنے سے بھلا کیا چشم تر ہوں شعلہ رو
چشمۂ خورشید کو دیکھو کہ مطلق نم نہیں
زیرِ ابرو تیری آنکھیں ہیں گریز اتنی ہے کیوں
صید افگن سے غزالانِ حرم کو رم نہیں
جو کوئی ہے با تواضع ، ہے سلیمانِ زماں
مثلِ خاتم خم اگر قامت نہیں ، حاتم[۱] نہیں
پڑ گیا پرتو جو تیرے روئے آتش ناک کا
صاف تبخالے لبِ گل پر ہیں یہ شبنم نہیں

۱- مصطفائی طبع دوم : "خاتم" ۔

دوست دنیا میں نہیں کوئی کسی کا بے غرض
ہو گئی جب صبح شمع مردہ کا پھر غم نہیں
آنکھ نرگس کی نہیں ہرگز جھپکتی اس لیے
ایک لمحے میں بہارِ گلشنِ عالم نہیں
ہیں شرر پتھر میں پنہاں پر جہاں آگاہ ہے
کون ہے جو میرے سوزِ عشق سے محرم نہیں
چشمِ جاناں سے جو الفت ہے دلا دیوانہ ہو
آہوانِ دشت کو مجنوں سے مطلق رم نہیں
زلفِ جاناں کا کوئی مضموں کیا جب سے رقم
میرے خامے کے برابر افعیوں میں سم نہیں
یار کی محرابِ ابرو کے تصور میں مدام
دیدۂ کعبہ ہے گریاں چشمۂ زمزم نہیں
یار کو ناسخ یہ لکھ مصراعِ استادِ قدیم
دیر کی تم نے ذرا آنے میں تو پھر ہم نہیں

۱۴۷

مشرقِ خورشید تیرے نور سے ہے در نہیں
کون ہے بارہ دری میں آج جو ششدر نہیں
خلق کو فرصت زیارت سے یہ کیوں دم بھر نہیں
یار کا موئے کمر کچھ موئے پیغمبرؐ نہیں
ہے سرِ عریاں مرصع داغِ سودا سے تمام
شاہِ اقلیمِ جنوں ہوں، حاجتِ افسر نہیں
بلبلیں کیا، تو وہ ہے صیاد اے رشکِ چمن
طائرِ بوئے چمن کے تیرے آگے پر نہیں

عالمِ سفلی سے ہے تا عالمِ علوی سیاہ
ہے شبِ فرقت ، فلک[1] پر چاند کیا ، اختر نہیں

ایک ساعت بھی زمانے میں ہوا ہم کو نہ اوج
آسماں پر کیا ہمارے بخت کا اختر نہیں ؟

ہے سحابِ گوہر افشاں اُس کے مطبخ کا دھواں
عود ہے ہیزم نہیں ، یاقوت ہے اخگر نہیں

ہر کسی کا کام رکھتا ہے ادھورا آسماں
گر ہم پہنچا سرِ شوریدہ تو پتھر نہیں

سوچ اے غافل بھلا کیوں کر تجھے آوے نظر
تیری آنکھوں سے وہ مثلِ مردمک ماہر نہیں

ہے[2] شبِ فرقت کرے آرام اب بختِ سیاہ
آج مجھ کو احتیاجِ بالش و بستر نہیں

پار ہو جائے نہ کیوں ہردم ترا تیرِ نگاہ
آئینہ ہے دل مرا ، کچھ سدِّ اسکندر نہیں

دوستی کس کی یہاں ہے ایک دشمن ایک کا
ہے بجا اُس کو جو میری دوستی باور نہیں

خم میں ہے جوشِ شراب اور خشک ہے سرِہوشِ خم
دل میں ہے طوفانِ اشک اور آنکھ اپنی تر نہیں

عندلیبوں سے گلوں کی بے وفائی ہے عبث
کون ہے جس کی لحد پر پھولوں کی چادر نہیں

۱- مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجدی میں "ہے شبِ فرقت ، فلک پر" درست ہے ۔ "پلنگ" غلط ہے ۔
۲- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"ہے شب فرقت کرے آرام اب بختِ سیاہ"

ہو گئی ہے رات میری جان کو دیوِ سیاہ
آج ہم بستر جو ناسخ وہ پری پیکر نہیں

۱۴۸

چین دنیا میں زمیں سے تا فلک دم بھر نہیں
داغ ہیں یہ گل نہیں، ناسور ہیں اختر نہیں
غیرِ خوں ریزی سپاہی کا کوئی جوہر نہیں
کاٹ ہو تلوار میں کیا عیب اگر جوہر نہیں
سر رہے یا جائے کچھ ہم میکشوں کو ڈر نہیں
کون سا مینائے مے اے محتسب بے سر نہیں
چشمِ جاناں پر پسینا کیا ہے گر زیور نہیں
گوشِ گل کو غیرِ شبنم حاجتِ گوہر نہیں
وہ بتِ شیریں ادا کرتا ہے مجھ کو سنگ سار
یہ شکر پارے برستے ہیں جنوں پتھر نہیں
ہو رہا ہے ایک عالم تیرے ابرو پر نثار
کون گردن ہے جہاں میں جو تہِ خنجر نہیں
دم نکلنے پر جو آتا ہے نہیں رکتا ہے پھر
دیکھ لو قصرِ حباب اے اہلِ غفلت در نہیں
مفلسوں کے منہ سے ہوتی ہے بہت شرمندگی
زرد یہ اے منعمو! بے وجہ روئے زر نہیں
جس جگہ چلتا ہے سیڑھے ہوئیوں تیرا فرس
ذائقے میں واں برابر خاک کے شکّر نہیں
"لن ترانی" سنتے ہیں، دیدار سے محروم ہیں
یعنی اس حیرت کدے میں کور ہیں ہم، کر نہیں

آدمی تو کیا وہ کہتا ہے نشانِ پا سے بھی
کیوں پڑا ہے میرے کوچے میں تیرا کیا گھر نہیں

اے تصور کیوں بتوں کو جمع کرتا ہے یہاں
دل مرا کعبہ ہے کچھ بت خانۂ آزر نہیں

خوش نما ہے، ہو حسینوں میں کجی یا راستی
کچھ خطِ روئے صنم کو حاجتِ مسطر نہیں

شکوہ جو بے نوکری کا کرتے ہیں نادان ہیں
آپ آقا ہے، کسی کا جو کوئی نوکر نہیں

طفل چلتے ہیں جب اپنے پاؤں، کہتی ہے قضا
غیرِ آغوشِ لحد اب دامنِ مادر نہیں

ہے خراباتِ جہاں میں بھی وہ ساقی سے نفور
جو کہ اے ناسخ غلامِ ساقیٔ کوثر نہیں

۱۲۹

ہماری کیف سزاوارِ احتساب نہیں
خیالِ چشم ہے، کچھ ساغرِ شراب نہیں

بتوں کے پردے میں ہم دیکھتے ہیں نورِ خدا
خدا[1] کے دیکھنے کی اے کلیم تاب نہیں

وفورِ اشک سے کیوں ہے گلے تلک پانی
ہمارا کاسۂ سر، کاسۂ حباب نہیں

یہ ضبطِ گریہ میں عالم ہے بے قراری کا
کہ برق کوندتی ہے، بارشِ سحاب نہیں

۱- مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجیدی:
''کہ صاف دیکھنے کی اے کلیم تاب نہیں''

بشر کے جسم میں ہے جانِ مایۂ غفلت
سوائے دیدۂ تصویر کس کو خواب نہیں

دلا ہے موسمِ پیری محلِ جامِ شراب
بغیرِ صبح کوئی وقتِ آفتاب نہیں

میں غش سے اس کے چھڑکتے ہی ہوشیار ہوا
کسی صنم کا پسینا ہے، یہ گلاب نہیں

بہت[1] قریب ہے ہم وحشیوں کو وحشت ہے
ہمارے دشت میں ناسخ کہیں سراب نہیں

۱۵۰

جاں بلب ہے دل مرا اُس زلفِ عنبرفام میں
غیر ممکن ہے نہ ہو مومن کو ایذا شام میں

آفتاب اُس پر تو اس پر چہرۂ پُرنور ہے
فرق کیا ہے آسماں میں اور اُس کے بام میں

بعدِ مدت کلفتِ غم سے ہوا صاف اپنا دل
دیر تک ہم تم نہائے کل جو اک حمام میں

ایک جا ہے چشمِ جاناں میں نگاہِ قہر و مہر
تلخ و شیریں مغز دو گویا ہیں اک بادام میں

خندۂ صبحِ شبِ عشرت سے یہ مفہوم ہے
موت کا پیغام بھی تھا وصل کے پیغام میں

ہمتِ ساقی سے ایسی وسعتِ مشرب ملی
مثلِ جم بحرِ جہاں گویا ہے اپنے جام میں

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی : "بہت قریب ہے" ۔

کیوں نہ ہوں طولِ شبِ فرقت ہو قصرِ روزِ وصل
رات دن ہے آسماں مصروف اپنے کام میں

پختۂ مغز آتشِ سودا کو کیا رونے سے کام
مادہ ہے خوں فشانی کا کبابِ خام میں

شورِ محشر سا ہے، پر تاثیر نالوں میں نہیں
مردے بھی چونکے ولیکن بخت ہے[1] آرام میں

حرف لاینفک زباں پر ہو گئے مثلِ نگیں
کیا اثر نامِ خدا ہے اُس صنم کے نام میں

عین کعبے میں بھی میخانہ گریباں گیر ہے
داغ ہے ناسخ ہی اپنے جامۂ احرام میں

۱۵۱

یہ اپنی شکل سے اب آپ شرمسار ہوں میں
نہ آئنے میں کبھی عکس سے دوچار ہوں میں

قوی ہوں گو ستمِ آسماں سے زار ہوں میں
اُلجھ کے دامنِ محشر پھٹے وہ خار ہوں میں

نہ وحشی ہوں نہ کوئی نخلِ میوہ دار ہوں میں
یہ کیا سبب ہے جو اے چرخ سنگسار ہوں میں

دمِ خرامِ چمن نقشِ پا سے پھولتے ہیں
بجا ہے گر وہ کہے موسمِ بہار ہوں میں

جو آئنے کو میں روشن کروں، تو آ بن جائے
وہ کارگاہِ جہاں میں سیاہ کار ہوں میں

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی :
"مردے بھی چونکے و لیکن بخت ہیں آرام میں"

کٹی پیادہ روی میں تو راہِ منزلِ عشق
سمجھوں تو بادِ[1] کے گھوڑے پہ اب سوار ہوں میں

ہمیشہ سنگ سے رہتا ہے تیغِ یار کو کام
بجا ہے گر وہ کہے تیغِ کوہسار ہوں میں

کمالِ عشق میں ملتا ہے رتبۂ معشوق
سرشکِ خوں کے سبب آپ گل عذار ہوں میں

ہے میری خاک نشینی سے خلق کو آرام
دلا حقیقۃً عالم میں سایہ دار ہوں میں

بنا ہے جسم مرا لاغری سے طائرِ روح
کسی خدنگِ نگہ کا کہاں شکار ہوں میں

اگرچہ یاس سراسر ہے لیکن اے ناسخ
خدا سے وصلِ صنم کا امیدوار ہوں میں

۱۵۲

کبھی مل جائے خدا ، اس کی مجھے یاس نہیں
اے صنم پر ترے ملنے کی مجھے آس نہیں

آس کہتے ہیں جسے ، آس نہیں پاس نہیں
یاس سے ہر کسی حالت میں مجھے یاس نہیں

وصل کانٹوں سے ہوا ، شادی سے مالیدہ ہوئے
دشتِ وحشت میں مرے پاؤں پہ آماس نہیں

اس کے دانتوں کے تصور میں جو دم نکلا ہے
استخواں ریزی کم از ریزۂ الماس نہیں

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - استنخۂ مطبع بھی : "پاؤں" -

مژدۂ عمر کو پہنچے ہے درو کرتا ہے
ماہِ نو اس کے سوا کیا ہے اگر داس نہیں

باوہا بیٹھ کے کعبے میں لنڈھائی ہے شراب
محتسب کیا ہے خدا کا ہمیں جب پاس نہیں

خط وہ لکھتا ہے مجھے لکھنے نہیں دیتے رقیب
ماجرا یہ بھی کم از قصۂ قرطاس نہیں

ساتھ شیشوں کے بدن ٹوٹنے لگتا ہے سرا
واعظا مجھ کو کبھی توبہ سے راس نہیں

قابلِ قرب نہیں بے ادبوں کی صحبت
دور رہ اُن سے دلا جن کو ترا پاس نہیں

طپشِ دل مجھے دیوار پھندا دیتی ہے
درِ جاناں میں جو ہے قفل تو وسواس نہیں

رہتے ہیں ظلِّ حمایت میں علم کی ناسخ
حامی اپنا کوئی جز حضرتِ عباس نہیں

۱۵۳

دلِ پُر داغ آویزاں ہے[1] اس کی زلفِ پیچاں میں
ہوئے ہیں پھول یا لالے کے پیدا سنبلستاں میں

جہاں کے عشق بازوں کا ہے مجمع کوئے جاناں میں
نہ پروانہ ہے محفل میں، نہ بلبل ہے گلستاں میں

بھلا دیکھیں تو کیوں کر روکتا ہے باغباں ہم کو
خزاں کے ساتھ ہم آئیں گے اب کے اس گلستاں میں

۱- مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجدی طبع ۱۲۵۸ھ: "دلِ پُر داغ آویزاں ہیں"۔

نہیں داغِ جنوں کو کچھ مضرّت آہ و گریہ سے
چراغ اپنا ہے مثلِ برق روشن باد و باراں میں
پسینا یار نے پونچھا ہے جب دستِ حنائی سے
دُرِ غلطاں نظر آئے ہیں مجھ کو دستِ مرجاں میں
عبث ہے اے دلِ پُر داغ ارادہ کوئے جاناں کا
گزر طاؤس کا ممکن نہیں ہے باغِ رضواں میں
ہوا راہِ طلب میں سست زہدِ خشک سے زاہد
رواں کب ہے دریا کی طرح ریگِ بیاباں میں
یہی ہیں اتحادِ عاشق و معشوق کے معنی
زلیخا کو ہو سودا اور یوسف جائے زنداں میں
ڈھلک آتے ہیں رخساروں سے جو قطرے پسینے کے
گہر بنتے ہیں دریا کی طرح چاہِ زنخداں میں
تصور سیرِ گلشن میں جو آیا کوئے جاناں کا
بجائے گل سرِ پُرداغ ہے اپنے گریباں میں
مجھے روتے جو دیکھا، ہو گیا روپوش غصّے سے
کہ پنہاں جس طرح خورشید ہو جاتا ہے باراں میں
نہیں ممکن کہ ہو اصلاح ظالم کی طبیعت کو
رہے خوں ریز خنجر گر بجھائیں آبِ حیواں میں
نکالا کاروانِ خط نے بھی آ کر لے اے ناسخ
مرا دل کیا بُری ساعت گرا چاہِ زنخداں میں

۱۵۴

اے جنوں یاں کوئی جز ضعف گلوگیر نہیں
طوق گردن میں نہیں، پاؤں میں زنجیر نہیں

نالے کر ابروئے جاناں کے تصور میں خلا ۱
ہے گماں واقعی بے کار ترا تیر نہیں
احتیاط اس قدر اس کی تو عبث کرتا ہے
جسم آخر ہے ترا خاک، کچھ اکسیر نہیں
ہوئی اس بزم میں بے طور زباں جس کی دراز
شمع کی طرح سے سر کٹنے میں تاخیر نہیں
کیوں سرِ قلم نہ کہیں دفترِ کونین کو ہم
فرد وہ کون ہے جس میں تری تصویر نہیں
وعدے میں عذرِ دہن، آنے میں ہے عذرِ حنا
کون ہے ناز ترا جس میں کہ تزویر نہیں
فکر ہے غورِ طلسماتِ جہاں میں حیران
غیرِ نسیاں کوئی اس خواب کی تعبیر نہیں
لال منہ خشم سے اس کا ہو تو ڈر ہو نہ دلا!
آتشِ گل میں جلا دینے کی تاثیر نہیں
ہے جو قسمت کا لکھا آئے گا بر رُو ہر طرح
خطِ رخسار کو کچھ حاجتِ تحریر نہیں
تنگ ہوں زیست سے، ہو جاؤں کسی پر عاشق
کوئی اور اس کے سوا مرنے کی تدبیر نہیں
آج تیرا جو تصرف ہے تو کل
کشورِ حسن کسی کے
کیوں مری قبر سے جاتا ہے
اے پری خاک مری

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ ...
”ہے گماں واقعی بیکار

تیری تلوار کے ہیں زخم ، کوئی دیکھ تو لے
شہم کر ، لاشہ مرا قابلِ تشہیر نہیں

قاصدا ! حال سراپا ہے ، سراپا مرقوم
اپنا مکتوب کم از کاغذِ تصویر نہیں

اس زمیں میں یونہی اشعار پڑھے جا ناسخ
دل کے بہلانے کی اور اب کوئی تدبیر نہیں

۱۵۵

مٹ گئے نقشِ حیات ، اور آہ سے تاثیر نہیں
اے پری خواں یہ پری زادوں کی تسخیر نہیں

نطقِ عیسیٰ[۳] میں ترے نطق سے تاثیر نہیں
دستِ موسیٰ[۳] میں ترے ہاتھ سے تنویر نہیں

کیوں دلا ! پیری میں بھی مرنے کی تدبیر نہیں
ہو چکی صبح بس اب کوچ میں تاخیر نہیں

کارِ حیرت زدگاں میں ہے کہاں غیر کو دخل
شمعِ تصویر کو کچھ حاجتِ گلگیر نہیں

کوئی غفلت بھی حقیقت سے نہیں ہے خالی
کون سا خواب ہے جس کے لیے تعبیر نہیں

اے بتو ہوتے ہیں دیوانے خدا کو بھی عزیز
کیسے عصیاں کریں ان کے لیے تعزیر نہیں

خالد[۳] دل نہ کرو منہدم اے اصحاب الفیل
مثلِ کعبہ یہ کسی بندے کی تعمیر نہیں

جانتا ہے تو مرا درد ، بیاں کیا ہے ضرور
دہنِ زخم کو کچھ حاجتِ تقریر نہیں

بس دلا صورتِ ہستی کو کوئی دم ہے ثبات
یہ جہاں آئنہ ہے، کاغذِ تصویر نہیں

اے سہی سرو ترے کان کے پتوں کی طرح
برگ ہائے شجرِ طور میں تنویر نہیں

ابروئے یار کے مانند بنائے پیش طاق
اور مسجد کی کسی واسطے تعمیر نہیں

خط سے غمگیں نہ ہو، اصلاح سے کر صاف عذار
محو جو ہو نہ سکے، یہ خطِ تقدیر نہیں

بد زبانی ہے وہاں، گرچہ ہے معدوم دہن
یاں ہے موجود دہن، خوف سے تقریر نہیں

کیوں دمکتا ہے وہ کندن کی طرح سر تا پا
جائے خاک اس کے عناصر میں جو اکسیر نہیں

گل رخوں کا جو تصور ہے سخن سنجی میں
گل فشانی ہے یہ ناسخ، تری تقریر نہیں

۱۵۶

قابلِ روحِ سبک رو بدنِ پیر نہیں
ایک دم ساکنِ آغوشِ کماں تیر نہیں

تیرے ابرو سی مہ نو کی جو شمشیر نہیں
ترکشِ مہر میں بھی مثلِ مژہ تیر نہیں

خط نمایاں نہ ہو یا رب رخِ جاناں پہ کبھی
یہ وہ مصحف ہے جسے حاجتِ تفسیر نہیں

ایک[1] کو عالمِ حسرت میں نہیں ایک سے کام
شمعِ تصویر سے روشن شبِ تصویر نہیں

سایہ ساں دھوپ ہے تیرہ ترے سائے کے حضور
نقشِ پا سی کہیں خورشید میں تنویر نہیں

تیری شمشیر سے جب تک یہ جدا ہے قاتل
خوں ہمارا عرضِ جوہرِ شمشیر نہیں

مرتے[2] ہیں آپ گلا کاٹ کے عاشق اس پر
یہ دلا ! ابروئے خمدار ہے ، شمشیر نہیں

سر و ساماں ہو بہم زیرِ فلک ، مشکل ہے
سر مرا ہے تو کفِ یار میں شمشیر نہیں

ایک عالم ہے تری نیچی نگاہوں کا[3] شہید
خمِ گردن کے برابر خمِ شمشیر نہیں

سے جنھیں بات مسیحا سے بھی ہوتی نہ کبھی
قدرتِ حق ہے یہ اے بت تری تقریر نہیں

ہے صنم رشکِ طلا رنگ سنہرا تیرا
خاک کے سامنے کچھ رتبۂ اکسیر نہیں

کر دیا ہے اسی حسرت نے مجھے دیوانہ
ہاتھ میں یار کے دروازے کی زنجیر نہیں

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع ہدی :
"ایک کو عالم حیرت میں نہیں ایک سے کام"

۲- مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع ہدی میں یہ شعر مؤخر ہے اور اگلا شعر مقدم - (مرتب)

۳- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع ہدی :
"ایک عالم ہے تری نیچی نگاہوں سے شہید"

شیفتہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

۱۵۷

جب سے کہ بتوں سے آشنا ہوں
بیگانہ خدائی سے ہوا ہوں
کیوں کر کہوں عارفِ خدا ہوں
آگاہ نہیں کہ آپ کیا ہوں
جب ہجر میں باغ کو گیا ہوں
میں آتشِ گل میں جل بجھا ہوں
فرقت میں جو سر پٹک رہا ہوں
مشغولِ[1] نمازِ کبریا ہوں
منہ زرد ہے تنکے چن رہا ہوں
اے وحشت کیا ہیں کہربا ہوں
بیگانہ ہوں کیوں بکرے آشنا سے
بیگانوں[2] سے میں بھی آشنا ہوں
منہ[3] ان کا نہیں ہے شکر ورنہ
ہر بت کہتا کہ میں خدا ہوں
امیدِ وصال آپ کہاں ہے
اس گل سے بہ رنگِ بو جدا ہوں

۱- مصطفائی اول و دوم - نسخہ مطبع بھدی : "مشغول نماز سے رہا ہوں"
۲- مصطفائی اول و دوم - نسخہ مطبع بھدی :
"بیگانوں سے بھی میں آشنا ہوں"
۳- یہ شعر مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخہ مطبع بھدی میں مقدم ہے - (مرتب)

کیوں دوست نہ خوش ہوں جانے ماتم
سیماب کی طرح مر گیا ہوں

خلقت خوش ہو جو میں ہوں پامال
گلزارِ جہاں میں کیا حنا[۱] ہوں

ہنس دوں گا دم میں مثلِ گل آپ
غنچے کی طرح سے گو خفا ہوں

آتش قدمی سے جلتے ہیں خار
اے قیس میں وہ برہنہ پا ہوں

کرتے ہیں گریز مجھ سے منحوس
بے شبہ میں سایۂ ہما ہوں

ہوں قافلۂ عدم سے آگے
اس راہ میں نالۂ درا ہوں

ناسخ کی یہ التجا ہے یارب!
مر جاؤں تو خاکِ کربلا ہوں

۱۵۸

اس ابر میں یار سے جدا ہوں
بجلی کی طرح تڑپ رہا ہوں

گلبن[۲] ہوں اگرچہ ہوں میں بے برگ
بلبل ہوں اگر تو بے نوا ہوں

۱۔ مصطفائی طبع دوم : ''گلزار جہاں میں کیا خزاں ہوں''
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی :
''گلبن ہوں اگر تو ہوں میں بے برگ''

دن رات تصوّرِ پری ہے مجھ
دیوانہ میں ان دنوں بنا ہوں
گو بیٹھ رہا ہوں اک جا لیک
پامال بسانِ نقشِ پا ہوں
افتادۂ خاک ہوں و لیکن
میں سایۂ شہپرِ ہُما ہوں
چلتا نہیں آپ گرچہ اک گام
پر میل کی طرح رہنما ہوں
اے ابرِ شبِ فراق دے ساتھ
رونے پر مستعد ہُوا ہوں
کیونکر مری خاک بھی[1] نہ ہو سرو
میں سرو قدوں کا خاکِ پا ہوں
تو رنگِ چمن میں ہوشِ بلبل
تو نکہتِ گل تو میں صبا ہوں
سر رکھ کے کبھی وہ سو گیا تھا
اب تک زانو کو سونگھتا ہوں
وحشت نے نکالا اس گلی سے
کانٹوں پر اس کو کھینچتا ہوں
آئینۂ دل میں ہے ترا عکس
دن رات میں تجھ کو دیکھتا ہوں
ثابت ہے گناہِ خشکیِ زہد
تر دامنِ موجِ بوریا ہوں

۱- مصطفائی اول و دوم ، نسخۂ مطبع ہندی :
"کیونکر میری خاک سے نہ ہوں سرو"

ممکن نہیں ہے اجتماعِ ضدین
تو بت ہے، میں بندۂ خدا ہوں
ہے مہر و وفا سراسر آس میں
ناسخ کیوں کر آسے نہ چاہوں

۱۵۹

آ گیا تھا رات کیا وہ ماہِ کامل خواب میں
چاندنی کا ہے اثر زخمِ دلِ بیتاب میں

ہے خیالِ سبزۂ عارض دلِ بیتاب میں
رہتی ہے اکسیر کی بوٗ یہاں سیماب میں

اس قدر روئے ہیں آغازِ[1] شبِ فرقت میں ہم
شام کو خورشید ڈوبا اشک کے گرداب میں

چاندنی میں ہم نے کی[2] بے یار جو سیرِ چمن
داغِ خوں گویا لگے تھے چادرِ مہتاب میں

ساقی و مطرب ہوں کم سن اور ہو کنجِ چمن
چاہیے اسباب اتنا عالمِ اسباب میں

ہے تعجب آسمانِ تفرقہ انداز سے
ایک جا ہیں عاشق و معشوق کیونکر ڈاب میں

شعلہ ہے تا صبح ہر شب دیکھتے ہو رنجِ فراق
کیا رہا اب آدمی میں فرق اور سرخاب میں

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجیدی : ''اسقدر روئے ہیں ہم''
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ؛ نسخۂ مطبع مجیدی :
''چاندنی میں ہم نے جو بے یار کی سیرِ چمن''

ضعفِ پیری میں کہاں طاقت کہ مسجد جاؤں میں
سجدے کرتا ہوں قدِ خم گشتہ کی محراب میں

شاخِ مرجاں موجِ عکسِ دستِ رنگیں سے بنی
پرتوِ رُخ سے ہوئے روشن کنول تالاب میں

یہ ترے روئے مخطط پر عرق آیا نہیں
خوشہ پرویں عیاں ہے خرمنِ مہتاب میں

بزمِ مے میں کچھ نہیں معلوم ہوتا کوہِ غم
بارِ سنگیں جیسے ہو جاتا ہے ہلکا آب میں

گوہرِ مضموں لیے پھرتے ہیں دیواں شہر شہر
ہے رواں میرا سفینہ موتیوں کے آب میں

طالبِ حق ہے اگر مت سالکوں کا ساتھ چھوڑ
مل گیا دریا میں جو کچھ مل گیا سیلاب میں

کیوں نہ اے ناسخ ہوں میں اعجازِ ساقی کا مقر
آفتاب اس نے دکھایا ہے شبِ مہتاب میں

۱۶۰

یوں مری آنکھیں عیاں ہیں اشک کے سیلاب میں
جیسے آتے ہیں نظر ترتے کنول تالاب میں

اپنے تو دستِ حنائی کو اگر دھوئے وہاں
لال ہو جائیں ابھی سب مچھلیاں تالاب میں

کس[1] نے چہرے سے اٹھائی ہے لبِ دریا نقاب
کوندتی ہیں بجلیاں لہروں کے بدلے آب میں

۱- مصطفائی طبع اول: ''کس نے چہرے سے اٹھایا ہے لبِ دریا نقاب''

استفادہ سخت دل، کیا دل گدازوں سے کریں
کب! ملائم ہو اگر برسوں رہے سنگ آب میں

اشک کے قطرے میں یہ مجھ ناتواں کا حال ہے
کوئی آ جاتا ہے تنکا جس طرح سیلاب میں

جلوۂ بینی ہے یوں محرابِ ابرو کے تلے
شمعِ روشن جس طرح رکھ دے کوئی محراب میں

دانے ہیں انگیا کی چڑیا کو بُنت کی چُنّیاں
پلتی ہے ہانی[2] کی مچھلی موتیوں کے آب میں

رشک[3] کے معنی یہ ہیں سوتے ہیں جیسے میرے بخت
سوچ رہتا ہے کہیں تجھ کو نہ دیکھیں خواب میں

خط نظر آتا ہے گر اس کے ذقن پر کیا عجب
جمع ہو رہتے ہیں تنکے بیشتر گرداب میں

چشمِ تر میں ہے تصور روئے جاناں کا مدام
پھنس گیا ہے عکس یہ خورشید کا گرداب میں

ہو گئے ہیں کور اگر اعدا عداوت سے تو کیا
نور ہیں اشعارِ ناسخ دیدۂ احباب میں

۱۶۱

زینتِ فتراک ہونے کے لیے آمادہ ہوں
کب سواری آئے گی، میں منتظر استادہ ہوں

۱۔ مصطفائی طبع اول ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"کب ملائم ہو، رہے برسوں اگر سنگ آب میں"

۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : "پلتی ہے بالی کی مچھلی" ۔

۳۔ مصطفائی طبع اول ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"اشک کے معنی یہ ہیں سوئے ہیں جیسے میرے بخت"

گرم رو مجھ سا نہ ہوگا کوئی بھی آتش قدم
تیز رفتاری میں میں سیماب آتش دادہ ہوں

کون صیاد آج آتا ہے چمن میں بلبلو!
رنگ گل کہتا ہے اڑ جانے کو میں آمادہ ہوں

میکدے میں توڑ کر خم بہر عذر معصیت
محتسب رندوں سے کہتا ہے کہ مست بادہ ہوں

انتظار و یاس سے گلزار کوئے یار میں
سرو ساں استادہ ہوں گہ سایہ ساں افتادہ ہوں

رہنمائی میری کرتی ہے مجھے پامال خلق
خضر راہ منزل مقصود مثل جادہ ہوں

کہہ رہا ہے انتظار یار میں ہر سرو باغ
عمر گذری، منتظر اک پاؤں سے استادہ ہوں

ہاتھ دوڑائیں گے اک دن میری بیعت کو سبو
بعد میں پیر مغاں کے صاحب سجادہ ہوں

جاتے ہیں ہر وقت زاہد جانب ظرف وضو
کیوں نہ میں مائل بھلا سوئے سبوئے بادہ ہوں

باقی ہے ہر اک سے میری خاطر نازک شکست
دم بہ دم میں شیشہ بالائے سنگ افتادہ ہوں——

آئے جو میرے بجھانے کو وہ جل کر خاک ہو
سوز غم سے تودۂ باروت آتش دادہ ہوں

حشر میں ناسخ بھی اپنا کہوں گا سلسلہ ۲۰
میں اسیر حلقۂ گیسوئے سید زادہ ہوں ۲۰

۱٦۲

کشتی[1] مے آج سرعت میں ہوا سے کم نہیں
نوح اگر ساقی نہیں تو ناخدا سے کم نہیں

پستے ہیں ہر ہر قدم پر دانہ ہائے آبلے
اے جنوں گردش ہماری آسیا سے کم نہیں

ایک ہیں دریا کی لہریں ، دور کیا نزدیک کیا
جو یہاں ناآشنا ہے ، آشنا سے کم نہیں

کیا اڑا آتا ہوں تیرے بادپا کے ساتھ ساتھ
آج خاک و آب و آتش بھی ہوا سے کم نہیں

زیست بھر ڈھونڈھا کہیں ملتا نہیں تیرا سراغ
بت ہے ، پر پوشیدہ رہنے میں خدا سے کم نہیں

ساتھ[2] تیرا چھوڑ دے گا ، راہ میں رہ جائے گا
اے مسافر جسم تیرا نقشِ پا سے کم نہیں

دور[3] دیں ہے جو ترے دل میں ابھی ہوتا ہے درد
بادۂ گلرنگ اے زاہد دوا سے کم نہیں

قالبِ بے روح تھا مینا سو گویا ہو گیا
آتشِ مے ساقیا آبِ بقا سے کم نہیں

بزمِ عشرت میں ہیں طبلے غافلو طبلِ رحیل
یہ مجیروں کی صدا بانگِ درا سے کم نہیں

۱- یہ غزل مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجیدی طبع ۱۲۵۸ھ (دیوان اول) میں موجود نہیں ۔ البتہ دیوانِ دوم میں صفحہ ۲۰۰ کے حاشیے پر (تینوں نسخوں میں) درج ہے ۔

۲- مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مجیدی ص ۲۰۰ : ''ساتھ تیرا'' ۔

۳- مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مجیدی ص ۲۰۰ : ''درد دیں'' ۔

دوستو ! لانا نہ شیرینی ہماری قبر پر
خوانِ گردوں میں ستاروں[1] سے بتاسے کم نہیں

کیا برلگِ بید تھرّانے لگے شمشاد و سرو
باغ میں وہ سرو قد بادِ صبا سے کم نہیں

میرے مرنے سے کفِ افسوس گلگوں ہو گئے
اُن کو خالی ہاتھ بھی ملنا حنا سے کم نہیں

تو نے کی گلگشت ، سارا باغ تجھ پر ہنس گیا
پھول ، پتّا ، پنکھڑی ، بُوٹا حنا سے کم نہیں

۱۶۳

تلخ[2] باتیں آپ کی شیریں سخن سے کم نہیں
چینِ پیشانی بھی زلفوں کی شکن سے کم نہیں

کیسی گرمی ہو ، برہنہ شرم سے ہوتے نہیں
پیرہن بھی آپ کو جزوِ بدن سے کم نہیں

تو حسیں ایسا ہے تجھ پر مرتے ہیں سارے حسیں
ماہِ کنعاں کو بھی پیراہن کفن سے کم نہیں

ہے شبِ فرقت نظر آنے لگے سامانِ موت
چادرِ مہتاب بھی مجھ کو کفن سے کم نہیں

بعد مرنے کے بھی عشقِ زلفِ پیچاں ساتھ ہے
بال بال اُس کا مجھے رگ ہائے تن سے کم نہیں

۱- مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مہدی ، ص ۲۰۰ : ''ستاروں کے بتا سے کم نہیں'' ۔

۲- یہ غزل بھی مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع مہدی طبع ۱۲۵۸ھ (دیوانِ اول) میں موجود نہیں ۔ البتہ دیوانِ دوم جو حاشیے پر ہے اس کے صفحہ ۲۰۰ پر درج ہے ۔

جائے نرگس چشمِ آہو ، جائے لالہ چشمِ غول
اے جنوں جنگل مجھے صحنِ چمن سے کم نہیں

یک الم ہوتے ہیں موزوں بحر[1] میں مضمونِ غم
جو ہماری بیت ہے ، بیت الحزن سے کم نہیں

گرچہ غربت ہے ، تصور میں مگر ہمدم ہے پاس[2]
میری تنہائی بھی مجھ کو انجمن سے کم نہیں

اور تو کیا کوئی بوسہ بھی دیا جاتا نہیں
دل ترا تنگی میں کچھ تیرے دہن سے کم نہیں

دونوں پتھر پوجتے ہیں تجھ سے کچھ نسبت نہیں
کعبہ بت خانے سے ، حاجی برہمن سے کم نہیں

لے چلا ہوں میں عدم کو بارِ غم ، بارِ گناہ
روح بھی میری گرانی میں بدن سے کم نہیں

ذبح کرتے ہی گلا کاٹے فراقِ یار میں
زخمہ زن مطرب مجھے شمشیر زن سے کم نہیں

جو ہوا دنیا میں پیدا فی الحقیقت مر گیا
آدمی کو جامۂ ہستی کفن سے کم نہیں

اس چمن میں ہے برنگِ گل بقائے آفتاب
بے ثباتی میں ستارے یاسمن سے کم نہیں

جنبشِ مژگاں نہیں گویا ہے جنبش میں زباں
ہر اشارہ تیری آنکھوں کا سخن سے کم نہیں

۱۔ نسخۂ مطبع مجدی : ”بحر میں مضمونِ غم“ ۔
۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی اور نسخۂ نول کشور طبع ہفتم ۱۹۰۷ء میں ”مگر ہمدم ہیں پاس“ ۔

نامور ہوتے بھی ہو جاتے ہیں اکثر بے نشاں
مہر کن کرتے ہیں جن کو گورکن سے کم نہیں
بھی لڑا دیتا ہے کیسی خو زمینِ سنگلاخ
خامہ تیشہ ہے تو! ناسخ کوہ کن سے کم نہیں

۱۹۴

صنم کوچہ ترا ہے، اور میں ہوں
پہ زندانِ دغا ہے اور میں ہوں
یہی کہتا ہے جلوہ میرے بت کا
کہ اک ذاتِ خدا ہے اور میں ہوں
ادھر آنے میں ہے کس سے تجھے شرم
فقط اک غم ترا ہے اور میں ہوں
کرے جو ہر قدم پر ایک نالہ
زمانے میں درا ہے اور میں ہوں
تری دیوار سے آتی ہے آواز
کہ اک بالِ ہما ہے اور میں ہوں
نہ ہو کچھ آرزو مجھ کو خدایا
یہی ہردم دعا ہے اور میں ہوں
کیا درباں نے سنگِ آستانہ
درِ دولت سرا ہے اور میں ہوں
ہسے تم ہر جو گلزارِ جہاں میں
گل اندام و حنا ہے اور میں ہوں

۲- مصطفائی اول و دوم- نسخۂ مطبع مجیدی- نول کشور طبع ہفتم:- "پہ زندانِ وفا ہے اور میں ہوں"

گیا وہ چھوڑ کر رستے میں مجھ کو
اب اس کا نقشِ پا ہے اور میں ہوں
زمانے کے ستم سے روز ناسخ
نئی اک کربلا ہے اور میں ہوں

۱۶۵

سب ہمارے لیے زنجیر لیے پھرتے ہیں
ہم سرِ زلفِ گرہ گیر لیے پھرتے ہیں
کون تھا صیدِ وفادار کہ اب تک صیّاد
بال و پر اس کے ترے تیر لیے پھرتے ہیں
تو جو آئے تو شبِ تار نہیں یاں ہر سو
مشعلیں نالۂ شب گیر لیے پھرتے ہیں
تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں
معتکف گرچہ بظاہر ہوں تصور میں مگر
کو بہ کو ساتھ یہ بے پیر لیے پھرتے ہیں
رنگِ خوبانِ جہاں دیکھتے ہی زاد کیا
آپ[۱] زور آنکھوں میں تصویر لیے پھرتے ہیں
جو ہے مرتا ہے، بھلا کس کو عداوت ہوگی
آپ کیوں ہاتھ میں شمشیر لیے پھرتے ہیں
سرکشی شمع کی لگتی نہیں گر ان کو بری
لوگ کیوں بزم میں گل گیر لیے پھرتے ہیں

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع ہدی:
"آپ زور آنکھوں میں اکسیر لیے پھرتے ہیں"

تا گنہگاری میں ہم کو کوئی مطعون نہ کرے
ہاتھ میں نامۂ تقدیر لیے پھرتے ہیں
قصرِ[1] تن کو یونہی بنوا نہ بگولے ناسخ
خوب ہی نقشۂ تعمیر لیے پھرتے ہیں

۱٦٦

دل[2] اُس کو دیا ہم نے تقصیر اسے کہتے ہیں
مارا غمِ فرقت نے، تعزیر اسے کہتے ہیں
ہم خواب میں واں پہنچے تدبیر اسے کہتے ہیں
وہ نیند سے چونک اٹھے تقدیر اسے کہتے ہیں
جو مجھ سے گریزاں تھا کل اس کو میں گھر اپنے
باتوں میں لگا لایا، تقریر اسے کہتے ہیں
میں خاک ہوا مر کر، وہ قاتل کو آیا
اکسیر اسے کہتے ہیں، تسخیر اسے کہتے ہیں
دیوانی سی جنگل میں پھرتی ہے پڑی لیلٰی
جذبِ دلِ عاشق کی تاثیر اسے کہتے ہیں
پی[3] جبکہ شراب اُس نے، کندن سا بدن دمکا
سونا اسے کہتے ہیں، اکسیر اسے کہتے ہیں

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی طبع ۱۲۵۸ھ :
"قصر تن کو یونہی بنوا یہ بگولے ناسخ"
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی طبع ۱۲۵۸ھ :
"دل اُس کو دیا میں نے"
۳۔ مصطفائی طبع اول و دوم :۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"پی جبکہ شراب اس نے کندن سا بدن دمکا"

شکل اس کی تصور نے کھینچی ورقِ دل پر
نقاش اسے کہتے ہیں، تصویر اسے کہتے ہیں
بے جرم کیا بسمل لاکھوں ہی جوانوں کو
سفاک اسے کہتے ہیں، بے پیر اسے کہتے ہیں
عقل سے اٹھانے کا جب قصد کیا اس نے
دانستہ میں غش لایا، تزویر اسے کہتے ہیں
سو قتل کیے، خوں ہے ابرو میں نہ مژگاں میں
شمشیر اسے کہتے ہیں، اور تیر اسے کہتے ہیں
جتنا وہ گریزاں ہے درپے دلِ نالاں ہے
صیاد اسے کہتے ہیں، نخچیر اسے کہتے ہیں
انجام کو کچھ سوچو کیا قصر بناتے ہو
آباد کرو دل کو، تعمیر اسے کہتے ہیں
ہیں پیشِ نظر اپنے ہر وقت تصور میں
پریوں کی بس اے ناسخ تسخیر اسے کہتے ہیں

۱۶۷

دل میں پوشیدہ تپِ عشقِ بتاں رکھتے ہیں
آگ ہم سنگ کے مانند نہاں رکھتے ہیں
نے سواری[1] تری دیکھیں تو ہوں گردِ دلبال
ہاتھ میں صبر کی جو لوگ عناں رکھتے ہیں
بزمِ جاناں میں کبھی بات نہ نکلی منہ سے
کہنے کو شمع کی مانند زباں رکھتے ہیں

۱- مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع ہدی طبع ۱۲۵۸ھ:
"لیسواری تری دیکھیں تو ہوں"

ایک مدت سے تمنا ہے قدم بوسی کی
سو پٹکتا ہوں صنم پاؤں جہاں رکھتے ہیں

مثلِ [1] پروانہ نہیں کچھ زرِ دل اپنے پاس
ہم فقط تجھ پہ فدا کرنے کو جاں رکھتے ہیں

یوں ہے دودِ دلِ سوزاں نفسِ سرد کے ساتھ
غربا جیسے زمستاں میں دھؤاں رکھتے ہیں

اس تنِ صاف پہ ہے موئے کمر تک پیدا
اور محبوب صفا ایسی کہاں رکھتے ہیں

طائرِ روح کو کر دیتے ہیں کیوں کر بسمل
تیر رکھتے ہیں پری رو نہ کماں رکھتے ہیں

ہو گیا زرد ، پڑی جب کہ حسینوں پہ نظر
یہ عجب گل ہیں کہ تاثیرِ خزاں رکھتے ہیں

تازگی ہے سخنِ کہنہ میں یہ بعدِ وفات
لوگ اکثر مرے جینے کا گماں رکھتے ہیں

بھا گئی کون سی وہ بات بتوں کی ورنہ
نہ کمر رکھتے ہیں کافر نہ دہاں رکھتے ہیں

عوضِ ملکِ جہاں ملکِ سخن ہے ناسخ
گو نہیں حکم رواں ، طبع رواں رکھتے ہیں

۱۶۸

تیر رہا ہے کھڑا وہ بتِ شنگ آب میں
جس نے نہ دیکھے ہوں سو دیکھے شلنگ آب میں

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخہ مطبع مجدی :
"مثلِ پروانہ نہیں کچھ زر و مال اپنے پاس"

ہجر کی شب جب ہوا جوش مرے رونے کا
صبح کو ترنظر آیا پلنگ آب میں

قافلۂ لختِ دل اشکوں میں یوں ہے رواں
کرتے ہیں جیسے سفر اہلِ فرنگ آب میں

نرم طبیعت کو کیا پہنچے عدو سے گزند
سنگ ہی ہو جائے غرق گر پڑے سنگ آب میں

کہتے ہیں ہردم مجھے دل میں تو خوش ہوں گے آپ
غیر سے چھینٹوں کی جب کرتے ہیں جنگ آب میں

صحبتِ نیکاں سے ہو فائدہ ظالم کو کیا
رفع نہ تلوار کا ہو کبھی زنگ آب میں

عارضِ رنگینِ یار عکس فگن ہوں اگر
خلق کو دل سے یقیں ہو کہ ہے رنگ آب میں

رات کو دریا میں تو آترے جو اے شعلہ رو
شمع سمجھ کر تجھے آئیں پتنگ آب میں

آب[1] سے سرسبز ہیں سارے نباتات اگر
سبز کیا آب[2] کو جب ملی بنگ آب میں

ناسخِ مہجور اگر جا کے نہانے لگے
آئیں نظر سب حباب چشمِ پلنگ آب میں

۱۶۹

غمِ شبیر[3] میں رو رو کے کروں تر دامن
جاؤں تا حشر کے میداں میں نہ میں تر دامن

۱-۲- مصطفائی اول و دوم ـ نسخۂ مطبع ہدی : "آب" ـ

طمعِ خام سے پھیلے جو کسی کے آگے
یارب ایسا تو مجھے ہو نہ میسر دامن

مثلِ گردوں تجھے گردش ہی رہے گی دن رات
زر سے زنہار نہ اے طالبِ زر بھر دامن

زندگی بھر تو صفائی رہی کیا قہر ہوا
ہے مری خاک سے قاتل کا مکدّر دامن

آستیں زن ہے یہاں کوئی چراغِ جاں پر
کھا گیا واں روشِ ناز سے ٹھوکر دامن

یہی کہتی ہوئی جاتی ہے چلی عمرِ رواں
میرے دامن سے نہ باندھے کبھی صرصر دامن

صبحِ محشر یہی کہتا میں اٹھوں گا ناسخ
دے مرے ہاتھ میں یا سبطِ پیمبر دامن

۱۷۰

ہے دلا کس کو دوام اس گردشِ افلاک میں
خاک کے پتلے ہزاروں مل گئے ہیں خاک میں

زاہدا! ہے فرق جتنا جود اور امساک میں
جان آتا ہی تفاوت ہے میں اور تریاک میں

کیا ہی چالاک ہے تیرے توسنِ چالاک میں
مرغِ دل اپنا فلک پرواز ہے فتراک میں

دیکھ کر دانتوں کی براق جو غش آیا مجھے
عالمِ انگشتِ حیرت ہے تری مسواک میں

ہوگئے نظروں سے غائب تیرے نظاروں کے ساتھ
کاہ تھی ہستی ہماری شعلۂ ادراک میں

فاقہ مستی پر قناعت ہو جو تم کو ہے کشو
ہے لبالب بادۂ عشرت خمِ افلاک میں

کہہ رہی ہے یہ لبِ جو ہر زبانِ موج ہے
پاک میں ہے کب وہ کیفیت جو ہے ناپاک میں

گر یہ ہے تیرے قدم سے باغ کی بالیدگی
دانۂ انگور ہوں گے شیشۂ ہے تاک میں

کر رہی ہیں عندلیبیں جان کر گلبن ہجوم
داغ ہیں میرے لہو کے یار کی پوشاک میں

مست عالم کو کیا چشمِ سیاہِ یار نے
ساغرِ مے کا ہے عالم ساغرِ تریاک میں

شش[1] جہت میں موجزن ہے تو ہی اے دریائے حسن
فرق کیا ہے ڈوبنے والے میں اور تیراک میں

مقبرے کو جانے شادی سمجھے[2] وہ دیوانہ ہے
دفن لاکھوں ہو گئے اس گنبدِ افلاک میں

دور سے دونوں کا نظارہ ہے نزدیکی محال
فرق کیا ہے آفتاب اور روئے آتش ناک میں

منتظر دل میں ہے ساکن جب سے[3] وہ پردہ نشیں
طور چلمن کا ہے میرے سینۂ صد چاک میں

۱۔ یہ شعر مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجدی طبع ۱۲۵۸ھ میں مقدم ہے ۔

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"مقبرے کو جانے شادی سمجھے سو دیوانہ ہے"

۳۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : "جب سے وہ پردہ نشیں" ۔

تفرقہ اندازیٔ دوراں ہے تو کم میں غافلو!
عالمِ ارواح میں ہے روح اور تن ہے خاک میں

ضعف سے ایسا خمیدہ ہوں چلوں گر ادو قدم
صورتِ دامن ہو آلودہ گریباں خاک میں

اس کے ہوتے آنے دے حمام میں مجھ کو اگر
ڈال دوں میں نقدِ جاں کو کیسۂ دلاک میں

دور ہو ہرچند پر وہ جذبۂ دل ہے یہاں
ہم اگر چاہیں ابھی تم دوڑے آؤ ڈاک میں

آتشِ رنگِ حنا سے بیشتر اے کوچہ گرد
آگ لگ اٹھتی ہے رستوں کے خس و خاشاک میں

ہیں گلِ خوشبو قبا میں جتنے تھے جنت کے پھول
ایسی خوشبو ہے پسینے سے تری پوشاک میں

زلفِ مشکیں مجھ کو رہ رہ کر دلا جاتی ہے یاد
لائی ہے اے نکہتِ گل کیوں مرا دم ناک میں

منہ تلک آتے ہیں ایسے شعلہ ہائے داغِ دل
شمع روشن کا ہوا عالم مری مسواک میں

عینِ دریا میں سکندر کی ہے پتلی جس طرح
مردمک یوں ہے ہمارے دیدۂ نم ناک میں

کہتے[1] ہیں جس کو سنہرا رنگ جو ہنگامِ غسل
تارِ زر بنتے ہیں ڈورے کیسۂ دلاک میں

کیوں اٹھا لائے ہیں ہمدم مجھ کو ناسخ بعدِ قتل
چین سے لاشہ پڑا تھا کوچۂ سفاک میں

۱۔ نسخۂ مطبع مجدی: "کہتے ہیں اس کو سنہرا رنگ"۔

۱۷۱

روح کو آرام دم بھر باغِ رضواں میں نہیں
خاک اپنی بعدِ مُردن کوئے جاناں میں نہیں

کیا ہوا ثابت جو کپڑے جسمِ جاناں میں نہیں
چاک کچھ معیوب یوسف کے گریباں میں نہیں

خوش قدوں کی خاک بہ اٹھتی ہے ہردم سرو قد
گردباد اے اہلِ غفلت اس بیاباں میں نہیں

آج نقاشی کی چھت لگوا، نہیں مانع کوئی
کل بجز خفّاش لیکن سقف ایواں میں نہیں

دیکھنا کل آپ سے کوئی نہ رکھے گا قدم
آج جانے کی اجازت جس گلستاں میں نہیں

تیرے رخسارِ عرق آلود سے نسبت ہے کیا
ایک قطرہ چشمۂ مہرِ درخشاں میں نہیں

دوست دشمن سب کے سب ہیں رفتنی مثلِ نسیم
گل تو کیا کانٹا بھی اک دن اس گلستاں میں نہیں

سبزۂ خط ہو گیا سرسبز ایسا کس طرح
بوند پانی کی ترے چاہِ زنخداں میں نہیں

ہے جو یوں مکروہ طبع پاک کو مضمونِ غیر
وصل کا مضمون شایاں اپنے دیواں میں نہیں

ہو گیا مرتے ہی میرے سرد بازارِ جنوں
آج اے اطفال کوئی سنگ داماں میں نہیں

نامِ حاتم رہ گیا ہے، ہو گیا برباد بخت
آدمی کیا دیو بھی ملکِ سلیماں میں نہیں

ہے تصور سے مرے ہر اشک میں تصویرِ یار
میری آنکھوں سے نہاں خورشید باراں میں نہیں

لقل میں ہو حسن کتنا پر ہے عارف-گرد اصل
فاختہ کا آشیاں سروِ چراغاں میں نہیں

ہر پری رو میں ہے مجھ مجنوں کی تاثیرِ جنوں
نالۂ زنجیر کس کی زلفِ پیچاں میں نہیں

اس پری کے کاکلِ پیچاں کے سودے میں مجھے
سانپ آتے ہیں نظر زنجیریں زنداں میں نہیں

کرتے ہیں ہر روز مجھ وحشی کو لڑکے سنگسار
کون سا دن ہے جو آدینہ دبستاں میں نہیں

مورچھل نادان ہلاتے ہیں کسے حیران ہوں
ہڈیاں بھی تربتِ فغفور و خاقاں میں نہیں

آبلے ورزش سے تیرے دستِ رنگیں میں پڑے
کون کہتا ہے کہ موتی دستِ مرجاں میں نہیں

کیا ہوا گر شعرِ ناسخ ہیں عقیدے کے خلاف
آیۂ منسوخ کیا موجود قرآں میں نہیں ؟

۱۷۲

باغباں ممنوں ترے ہم اس گلستاں میں نہیں
چڑ دلِ صد چاک گل اپنے گریباں میں نہیں

کیا چنبیلی میں ہے جو اس گل کے دنداں میں نہیں
لعل خنداں میں جو ہے گل ہائے خنداں میں نہیں

ذکر کیا شاہ و گدا کا اصل میں دونوں ہیں ایک
فرق مر جانے کے بعد انساں و حیواں میں نہیں

رحمتِ حق جوش پر ہے کیوں نہ عصیاں کیجیے
شغل بہتر ہے کشی سے ابر و باراں[1] میں نہیں

اسفل و اعلیٰ مشابہ ہیں بہم ، لیکن ہے فرق
اوجِ انجم دیدۂ غولِ بیاباں میں نہیں

قدر کیا اس کو بھلا داغِ دلِ عشاق کی
داغِ چیچک تک کوئی اعضائے جاناں میں نہیں

ہے سراپا نور 'تو نامِ خدا ظلمت سے دور
سر سے پا تک تل بھی تیرے جسم تاباں میں نہیں

غول کی آنکھیں چراغ اور آشیاں قندیل ہے
ایک شب تاریکی اپنے کنجِ[2] ویراں میں نہیں

کیا سرے تلوے میں کانٹا ہے کسی نے دیکھنا
غیر کا نقشِ قدم تو کوئے جاناں میں نہیں

خضر سے کہوا ہی چھوڑوں گا ترے خنجر تلے
آبِ آہن کی حلاوت آبِ حیواں میں نہیں

کس قدر گھونگھٹ میں تاباں ہے وہ روئے آتشیں
روشنی ایسی چراغِ زیرِ داماں میں نہیں

خانۂ دل ہے مشبّک آہِ بے تاثیر سے
آج تک روزن کوئی دیوارِ جاناں میں نہیں

کیوں ہے حسنِ سبز کو عمرِ ابد مانندِ خضر
آبِ حیواں گر ترے چاہِ زنخداں میں نہیں

دیکھتے جذبِ زلیخا کھینچتا کیوں کر آپ سے
کیا کریں یوسف ترے چاہِ زنخداں میں نہیں

۱- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع ہدی : "ابر و باراں میں نہیں" -
۲- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع ہدی : "کنج ویراں میں نہیں" -

دم دبا جاتے تھے جن کے سامنے شیرِ ژیاں
غیرِ روباہ و شغال اب ان کے ایوان میں نہیں

کیا تری جالی کی کُرتی میں چمکتا ہے بدن
یہ فروغ اے سرو قد سروِ چراغاں میں نہیں

آمدِ موسیٰ[۴] و ہارون[۳] کی قوی ہے یہ دلیل
کون سا فرعون ہے جو فکرِ ساماں میں نہیں

جو ترا جی چاہتا ہے بس وہی کرتا ہے تو
وہ پری ہے تو کہ فرمانِ سلیماں میں نہیں

ہے نہاں صبحِ شبِ غم کیا ہوئی تاثیر ختم
سورۂ والشمس شاید اپنے[۱] قرآں میں نہیں

پُر ہیں آنکھیں گو سمندر کی طرح پر ضبط سے
ایک قطرہ بھی ہمارے ابرِ مژگاں میں نہیں

یار کے دستِ حنائی سی ہے چالاکی کہاں
دیکھ لو کوئی بھی مچھلی دستِ مرجاں میں نہیں

بے وطن ہو کو زمانے میں ہوئے نالاں بشر
آشنا نالوں سے نے ہرگز نیستاں میں نہیں

گاؤ خوری سود خوری ایک سی دونوں میں ہے
کچھ تفاوت ان دلوں ہندو مسلماں میں نہیں

آبِ حیواں پر سکندر سے یہ ساقی نے کہا
میکشی کر ، لطف کچھ بھی آبِ حیواں میں نہیں

سینکتا ہوں اپنی آنکھیں روئے آتش ناک سے
منقلِ داغِ فراق اب کے زمستاں میں نہیں

۱- مصطفائی طبع دوم : ''تیرے قرآں میں نہیں'' ۔

مثلِ مجنوں کس لیے صحرا بہ صحرا ہے خراب
کیا رسائی تجھ کو لاسخ کوے جاناں میں نہیں

۱۷۳

ہماری آہ وہ سن کر جو واہ کرتے ہیں
غزل سرا ہوتے ہیں ہم کہ آہ کرتے ہیں
مزا ملے گی جو انسان چاہ کرتے ہیں
یہاں فرشتوں کو محبوسِ چاہ کرتے ہیں
کبھی جو ہم شبِ فرقت میں آہ کرتے ہیں
دھویں سے اور جہاں کو سیاہ کرتے ہیں
جو عشقِ زلفِ صنم کا گناہ کرتے ہیں
عذاب گور میں مارِ سیاہ کرتے ہیں
ہے اپنے رونے سے فرقت میں بزم طوفاں خیز
ہم آج کشتیٔ مے کو تباہ کرتے ہیں
گدائے میکدہ کس چین سے ہیں خاک نشیں
بہ عیش تخت پہ کب بادشاہ کرتے ہیں
خبر نہیں جنھیں کچھ انقلابِ گردوں کی
غرورِ نیّرِ اقبال و جاہ کرتے ہیں
نہ کیجیے گورِ غریباں کو شہرِ خاموشاں
کہ داد داد ترے داد خواہ کرتے ہیں
ہم اُس صنم کی پرستش میں محو ہیں زاہد
خدا کا جس پہ بشر اشتباہ کرتے ہیں
غنیم موت ہے ، اُس سے بھلا لڑے گا کون
عبث جناب فراہم سپاہ کرتے ہیں

یہ ہم کو سوجھے ہیں زلفِ سیاہ کے مضموں
کہ آج دستے یہ دستہ سیاہ کرتے ہیں

کسی کے دل میں رہے تا نہ حسرتِ شاہی
فقیر اس لیے نام اپنا شاہ کرتے ہیں

بشر ہے کچھ نہیں کاہیدہ اس کے قامت پر
وہ دم میں سرو کو بھی برگِ کاہ کرتے ہیں

سیاہ کار جو ہم مست ہیں تو کیوں ساقی
سفید ریش کو زاہد سیاہ کرتے ہیں

فراق میں مرے اشعار ایسے ہیں پُر درد
کہ سامعین عوض واہ، آہ کرتے ہیں

ہم اب ہیں عاشقِ خط پیش ازیں تھے عاشقِ رخ
جو گل نہیں ہے تو سیرِ گیاہ کرتے ہیں

دلا نہ چین ہو دن رات اگر ہے دعویِ عشق
کہ محکمے میں طلب دو گواہ کرتے ہیں

بھلا! تکبر و غیبت سے زاہدو! حاصل
یہ رند کیا ہی مزے کے گناہ کرتے ہیں

ترے جمال کو دیکھیں زمیں پر آکر
فلک کی سیر عبث مہر و ماہ کرتے ہیں

بنا ہوں کیا گلِ دیوارِ قہقہہ سے میں
جو مجھ کو دیکھ کے بت قاہ قاہ کرتے ہیں

وہ بدگمان سمجھتا ہے چاند کا مشتاق
جو شب کو ہم سوئے گردوں نگاہ کرتے ہیں

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخہ مطبع مہدی طبع ۱۲۵۸ھ:
"بھلا تکبر و غیبت سے، زاہدو حاصل"

مزاج میں یہ حیا ہے کہ پھیر لیتے ہیں منہ
جو وہ نظارۂ مردم گیاہ کرتے ہیں

پھڑک رہے ہیں ہزاروں ہی مرغِ دل ہر سو
وہ کب نشانۂ تیرِ نگاہ کرتے ہیں

نماز میں بھی ہے دھیان اس کے سبزۂ خط کا
گیاہِ سبز کو ہم سجدہ گہ کرتے ہیں

جو ناامید ہیں ، اہلِ ورع ہیں اے ناسخ
امیدوارِ شفاعت ، گناہ کرتے ہیں

۱۷۴

جان ہم تجھ پہ دیا کرتے ہیں
نام تیرا ہی لیا کرتے ہیں

چاک کرنے کے لیے اے ناصح
ہم گریبان سیا کرتے ہیں

ساغرِ چشم سے ہم بادہ پرست
مئے دیدار پیا کرتے ہیں

زندگی زندہ دلی کا ہے نام[1]
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

سنگِ اسود بھی ہے بھاری پتھر
لوگ جو چوم لیا کرتے ہیں

کل نہ دے گا کوئی مٹی بھی انھیں
آج زر جو کہ دیا کرتے ہیں

۱۔ مصطفائی طبع دوم : ”زندگی زندہ دلی کا ہے کام“۔

تیرا کیا ذکر ہے داغوں سے
مہر و مہ کسبِ ضیا کرتے ہیں

خط سے یہ مدّعا ہیں محبوبِ قلوب
سبزے کو مہر گیا کرتے ہیں

ملتے ہیں تلووں سے گلگشت میں گل
زر کو وہ خاک کیا کرتے ہیں

اُن سے ہیں مخفیٔ عصیاں بہتر
جو عبادت میں ریا کرتے ہیں

دفن محبوب جہاں ہیں ناسخ
قبریں ہم چوم لیا کرتے ہیں

۱۷۵

جب وہ مسجد میں ادا کرتے ہیں
سب نماز اپنی قضا کرتے ہیں

جن کی رفتار کے پامال ہیں ہم
وہی آنکھوں میں پھرا کرتے ہیں

تیرے گھر میں جو[1] نہیں جاتے قدم
کیا مرے تلوے جلا کرتے ہیں

دھیان آتا ہے کفن کا مجھ کو
کپڑے جب قطع کیا کرتے ہیں

نیک و بد کیا ہوں ہمیشہ باہم
پھول کانٹوں سے جدا کرتے ہیں

---

[1] مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
''تیرے گھر میں نہیں جاتے جو قدم''

ہو گئے کیا ترے تلوے گلگوں
سنگِ پا کارِ حنا کرتے ہیں

نہیں ہوتے ہیں فراموش صنم
خاک ہم یادِ خدا کرتے ہیں

گو نہیں پوچھتے ہرگز وہ مزاج
ہم تو کہتے ہیں دعا کرتے ہیں

موسمِ گل میں بشر ہیں معذور
گل تلک چاک قبا کرتے ہیں

شاد ہیں باغِ فنا میں وہ[1] گل
اپنی ہستی پہ ہنسا کرتے ہیں

چمنِ دہر میں محبوبوں سے
کیا ہی عشاق وفا کرتے ہیں

ہوں[2] کدھر، آنکھیں نگاہیں ہیں ادھر
کب ترے تیر خطا کرتے ہیں

گر خزاں آتی ہے پھولوں کے ساتھ
پر عنادل کے اڑا کرتے ہیں

آج وہ تیغِ نگہ سے ناسخ
کشورِ دل کو کٹا کرتے ہیں

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مہدی :
"شاد ہیں باغِ فنا میں کب گل"

۲- یہ شعر مصطفائی اول و دوم اور نسخۂ مطبع مہدی طبع ۱۲۵۸ھ میں مقدم ہے ۔

۱۷۶

رفعت کبھی کسی کی گوارا یہاں نہیں
جس سرزمیں کے ہم ہیں وہاں آسماں نہیں

دو روز ایک وضع پہ رنگِ جہاں نہیں
وہ کون سا چمن ہے کہ جس کو خزاں نہیں

عبرت[1] کی جا ہے لاکھوں ہی پیر و جواں نہیں
پیری میں بھی خیال اجل کا یہاں نہیں

دشمن اگر وہ دوست ہوا ہے تو کیا عجب
یاں اعتمادِ دوستیٔ جسم و جاں نہیں

ہر[2] گل ہے اس چمن سے گریزاں برنگِ بو
سروِ چمن ہے کون جو سروِ رواں نہیں

صبحِ شبِ وصال ہے دم توڑتا ہوں میں
نالاں ہیں میرے غم میں موذن، اذاں نہیں

رفتارِ ناز میں یہ لچک جاتی ہے کہ بس
گویا تری کمر میں خم استخواں نہیں

آنکھوں سے فائدہ جو نہیں تیری گردِ راہ
حاصل جبیں سے کیا جو ترا آستاں نہیں

بولا جو بوئے گل سے ہوا یار بے دماغ
کہتا ہے کون آتشِ گل کا دھواں نہیں

خود رو ہیں کس طرح گلِ رخسار سرو قد
ہے کون باغ جس کے لیے باغباں نہیں

۱- یہ شعر مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع محمدی طبع ۱۲۵۸ھ میں موخر ہے۔

۲- یہ شعر نسخۂ مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع محمدی طبع ۱۲۵۸ھ میں مقدم ہیں۔

حاصل تجھے بصارتِ یعقوب[۳] ہو اگر
یوسف[۳] بغیر کوئی یہاں کارواں نہیں

منعم کے شکر میں بھی ہلائیں کبھی کبھی
تنہا برائے لذتِ دنیا زباں نہیں

تعریفِ تیغِ ابروئے قاتل ہے دم کے ساتھ
گویا دہانِ زخم ہے میرے دہاں نہیں

پژمردہ ایک ہے تو شگفتہ ہے دوسرا
باغِ جہاں میں فصلِ بہار و خزاں نہیں

منہ لگانے رکھ مرے منہ سے خمِ شراب
دریائے مے کی مچھلی ہے میری زباں نہیں

خوں ریزیاں جہان میں رہتی[۱] تھیں بہرِ رزق
کچھ آسیا کے سامنے قدرِ فساں نہیں

رنگِ بہار زرد ہوا تیرے سامنے
باغِ جہاں میں غیر گلِ زعفراں نہیں

زردار جو ہیں کیوں نہ ہوں خنداں برنگِ گل
باغِ جہاں میں زر بھی کم از زعفراں نہیں

جن[۲] کے سروں پہ آپ مگس راں رہے ہما
ان کا لحد میں آج کوئی استخواں نہیں

دھوکا نہ کھا ظروفِ وضو کو تو دیکھ کر
مسجد میں مے فروش کی لاسغ دکاں نہیں

۱- مصطفائی اول و دوم - نسخہ مطبع ہدی : "رہتی ہیں بہر رزق" -
۲- مصطفائی اول و دوم - نسخہ مطبع ہدی : "جمی کے سروں پر آپ" -

۱۷۷

سر سبز سبزہ ہو جو ترا پائمال ہو
ٹھہرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

موئے کمر ہے یوں بدنِ یار میں عیاں
درِ نجف کے جرم میں جس طرح بال ہو

گل کی زبان گنگ ہے تو لنگ پائے سرو
کیا عندلیب و کبک میں یہ بول چال ہو

ادنیٰ بھی پہنچے رتبۂ اعلیٰ کو ایک دن
سیدھی جو مثلِ بیذقِ شطرنج چال ہو

رندو! ضرور رقص ہو بزمِ شراب میں
ہاتھ آئے گر نہ بھانڈ تو صوفی کا حال ہو

موذی کو بعدِ مرگ بھی آرام ہے محال
کس طرح زیرِ تیغ نہ گینڈے کی ڈھال ہو

دو دو نہ میری آنکھوں میں کیونکر ہوں پتلیاں
آٹھوں پہر جو تیرا تصور میں خال ہو

کیا نیند آئے ہو جو یہی رات بھر خیال
گل تکیے کے عوض کوئی مخمل سا گال ہو

گر محتسب کو خون ہمارا کیا حلال
یا رب بھلا شراب تو ہم پر حلال ہو

تا حشر ہے فراق سوا گر فراق میں
ناسخ کہیں وصال میں تیرا[1] وصال ہو

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع مجیدی طبع ۱۲۵۸ھ:
"ناسخ کہیں وصال میں میرا وصال ہو"۔

صبح نہ سوتے ہی ہرگز نہیں چینا مجھ کو
وصلِ جاناں میں عبث ہے غمِ فردا مجھ کو

اے پری تو نے جو پہنی ہے سنہری انگیا
آج آئی ہے نظر سونے کی چڑیا مجھ کو

موتیوں کا نہیں گُچھّا یہ ترے بالوں[1] میں
آیا ہالے میں نظر عقدِ ثریّا مجھ کو

طفلِ اشک آنکھوں میں یہ دھوم مچاتے ہیں کہ بس
جب[2] سے وہ طفل گیا چھوڑ کے تنہا مجھ کو

کبھی پتھر بھی لگانے نہیں آتے اطفال
ہے کسی طفل کی فرقت میں جو سودا مجھ کو

منہ سوئے چرخِ دنی رکھتے ہیں جو گردش میں
چرخ ہوجا کا دکھاتے ہیں تماشا مجھ کو

ہاتھ جاناں ہیں یہ پُرنور کہ جب میں نے چھوئے
ہاتھ آیا وہیں موسیٰ[3] یدِ بیضا مجھ کو

رنج کیا دیکھ کے اس بُت کو نظر آتے ہیں
کاش دیتا نہ خدا دیدۂ بینا مجھ کو

آتش و سنگ کی خلقت کی طرح روزِ نخست
ساتھ اُس بت کے خدا نے کیا پیدا مجھ کو

اس کی انگیا کی کٹوری کو ہوا دیکھ کے مست
ساقیا اب نہ دکھا ساغرِ صہبا مجھ کو

قفسِ دہر سے کر جاؤں ابھی میں پرواز
ہاتھ آ جائیں اگر شہپرِ عنقا مجھ کو

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع محمدی : "ترے ہالے میں" ۔
۲۔ مصطفائی اول و دوم نسخۂ مطبع ہادی : "جیسے وہ طفل گیا" ۔

صبحِ محشر سے سوا صبحِ شبِ وصل ہے[1] شیخ
آج ہے تجھ سے زیادہ غمِ فردا مجھ کو

زاہدا! کعبے کو مے خانے سے جاتا ہے محال
ہے ہر اک شیشۂ مے آبلۂ پا مجھ کو

اُس مسیحا سے جو ہے رشتۂ الفت راسخ
ناتوانی نے کیا سوزنِ عیسیٰ[3] مجھ کو

۱۷۹

بسترِ خواب پہ تو یاد جو آیا مجھ کو
ملک الموت ہوئی صورتِ زیبا مجھ کو

بس نہ ترسا بہت اے کافرِ ترسا مجھ کو
لبِ جاں بخش دکھا بہرِ مسیحا مجھ کو

وہ صنم تو نظر آتا نہیں اصلا مجھ کو
دیے اللہ نے کیوں دیدۂ بینا مجھ کو

ہو گئی اس کو[2] نظر جب کہ تلے سے اوپر
دونوں عالم نظر آئے تہ و بالا مجھ کو

بن گیا گز کی طرح سوکھ کے میں سر تا پا
جب سے وحشت نے کیا بادیہ پیما مجھ کو

کھیل[3] سمجھا ہے مگر پیرِ فلک جو شب و روز
شیشہ بازی کا دکھاتا ہے تماشا مجھ کو

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : ''ہے شیخ'' ۔
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : ''ہو گئی اس کی نظر'' ۔
۳۔ مصطفائی طبع اول ودوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : ''طفل سمجھا ہے'' ۔

سیر کر کرکے چلا جاؤں گا مانندِ نسیم
چمنِ دہر میں درکار نہیں جا مجھ کو

تجھ کو خورشید سمجھ کر میں ہوا تھا عاشق
بس تلوّن نہ دکھا صورتِ حربا مجھ کو

خوں سے مژگاں کو کیا پنجۂ مرجاں میں نے
نظر آیا تری فرقت میں جو دریا مجھ کو

اس پری‌رو کی[1] دور لگی نہیں جاتی مجھ سے
باغِ عالم سے ملا بس گلِ رعنا مجھ کو

یاد ہے سایۂ دیوار کسی کا ناسخ
دہر کا سایہ ہوا سایۂ طوبےٰ مجھ کو

۱۸۰

ہجر میں آنکھیں یہ لائیں جوش پر خونِ ناب کو
کر دیا بالکل شفق گوں چادرِ مہتاب کو

ہے محلِ عیش اے دل گردشِ لیل و نہار
دیکھ پروانے کو[2] دن کو، اور شب سرخاب کو

کون ہیں جو بہرِ زر انسان کو کرتے ہیں قتل
ہم نہ بہرِ کیمیا کشتہ کریں سیماب کو

موج زن ہو عہدِ موسیٰ کی طرح دریائے خوں
گر مری آنکھیں نہ ضبط اک دم کریں خونِ ناب کو

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع مجیدی : ’’اس پری رو کو‘‘ -
۲- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع مجیدی : ’’دیکھ پروانے کے دن کو -‘‘

ہے یہ وحشت مجھ سے شب ہائے جدائی میں اسے
شعر میں بھی میں نے دشواری سے باندھا خواب کو

وصل میں بھی جستجوئے یار یاں غفلت سے ہے
عین دریا میں ہے گردش جس طرح گرداب کو

ہو گیا عشقِ لبِ دلدار میں مجھ کو جنوں
مفسدِ خوں کر دیا ہے بخت نے عناب کو

جانے مسجد مجھ کو سنگِ آستانِ یار ہے
سجدے کرتا ہوں اسی دروازے کی محراب کو

عقل اپنی عشقِ غارت گر کو کیا ہو سدِ راہ
روک سکتا ہے بھلا درباں کوئی سیلاب کو

اس قدر ہے اہلِ دنیا میں دیانت[1] کا رواج
بس ہو تو مثلِ صدف باندھیں گرہ میں آب کو

گر ترقی چاہتا ہے، کر کسی کی پرورش
خاک سے فرقِ شجر پر جا ملے ہے آب کو

زاہدانِ خشک شب بیدار ہیں تو کیا کمال
بیشتر کر دیتی ہے زائل یبوستِ خواب کو

ہیں جو صاحب درد ان کو زہر ہے سامانِ عیش
موت کا سامان زخمی گنتے ہیں مہتاب کو

مچھلیاں دروازۂ جاناں کی کیا راحت سے ہیں
بے کلی ہوتی ہے ورنہ ماہیٔ بے آب کو

قدر جیتے جی نہیں ہے کچھ بھی اے ناسخ مجھے
یاد مدفن میں کروں گا صحبتِ احباب کو

۱- نسخۂ مطبع مہدی: "اس قدر ہے اہل دنیا میں دنایت کا رواج"۔ دنائت بمعنی کمینہ پن، حقیر ہونا۔ (نور اللغات، جلد دوم، ص ۷۶۵)۔

۱۸۱

مرگِ عیسیٰ ہے ترے چشم کے بیماروں کو
گورِ آزادی ہے زلفوں کے گرفتاروں کو

نازِ رفتار سے ہاتے ہیں جسدِ روحِ رواں
گردِ رہ خاکِ شفا ہے ترے بیماروں کو

کب سبکدوش رہے قیدیٔ زندانِ وطن
بوئے گل پھاندتی ہے باغ کی دیواروں کو

وحشیٔ نرگسِ جادو ہوں جو پائیں آہو
کر لیں مژگاں مرے تلووں کے ابھی خاروں کو

ہوں وہ سرگشتہ کہ تاثیر مرے قدموں کی
آسیا دم میں بنا دیتی ہے کہساروں کو

کافرِ عشق ہوں، حاجت نہیں زنّار کی بھی
تارِ[1] تسبیح مبارک رہے دیں داروں کو

ہم بغل یار سے وہ، موت سے میں[2] ہم آغوش
کیا خبر میری شبِ وصل کے بیداروں کو

جوش خوں میری رگِ جاں میں بہت ہے قاتل
تشنگی آج ہے شاید ترے سوفاروں کو

اے صنم عہد میں تیرے یہ ہوا کفر عزیز
کہ رگِ جاں کا ملا مرتبہ زنّاروں کو

کیا بچیں گردشِ افلاک سے جو ہیں خونخوار
کام کیونکر نہ پڑے سان سے تلواروں کو

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع یحییٰ طبع ۱۲۵۸ھ:
"یار تسبیح مبارک رہے"۔

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع یحییٰ:
"ہم بغل یار سے وہ، موت سے ہیں ہم آغوش"

دھیان آیا جو مجھے زمزمہ پردازی کا
رہ گئے مرغِ چمن کھول کے منقاروں کو

ہجر میں گرم ہے اس داغ سے پہلو میرا
جس سے لگتی ہیں دوزخ کے بھی انگاروں کو

جو ضعیفوں کو ستائے گا، مزا پائے گا
آپ دکھ پاتے ہیں جو روندتے ہیں خاروں کو

پاک کر آپ کو ناسخ عرقِ خجلت سے
انفعال اپنا شفاعت ہے گنہگاروں کو

۱۸۲

سرکشی اور ہو اب کس کی گوارا مجھ کو
راست خوش آئی نہ جب گردنِ مینا مجھ کو

ہاتھ[۱] پر رکھ کے دیا مجھ کو شرابِ پر نور
آج ساقی نے دکھایا یدِ بیضا مجھ کو

عشقِ ابرو کے جنوں میں جو چلا شہر سے میں
دمِ شمشیر ہوئی جادۂ صحرا مجھ کو

نکہت[۲] گل کی طرح باغِ جہاں میں ہے محیط
تجھ سے خالی نظر آئی نہ کوئی جا مجھ کو

۱- یہ شعر مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجدی طبع ۱۲۵۸ھ میں موخر ہے۔
۲- یہ شعر مصطفائی اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجدی طبع ۱۲۵۸ھ میں مقدم ہے۔

نظر آیا نہیں تھا[۱] یہ ہے لائقِ شکر
ہے شکایت دہنِ بُت کی یہ بے جا مجھ کو

نسخے[۲] میں دالہ اغیر طبیبو لکھ دو
ہو گیا خالِ تیِ زلف کا سودا مجھ کو

گل سے چھپتی نہیں بو، راز چھپے گا کیونکر
کر نہ دے چاکِ گریباں کہیں رسوا مجھ کو

روٹھ کر اپنے صنم سے جو چلا میں افسوس
نہ پکارا کوئی ناقوسِ کلیسا مجھ کو

آج مہمان ہوں اک مہر لقا کے گھر میں
عشق میں بارے ملا اوجِ مسیحا مجھ کو

وہ تو غفلت سے یہ کہتا ہے کہ کل آؤں گا
اور اک دم نہیں جینے کا بھروسا مجھ کو

کھینچے جلادِ اجل خط مری گردن پہ کہیں
یاد آیا ہے اب اُس طفل کا گنڈا مجھ کو

روئے جاناں کا نہیں رنگ سنہرا اے دل
نظر آتا ہے یہ قرآنِ مُطلّا مجھ کو

بسترِ غم پہ یہ ہے ضعف کہ رہتا ہے خیال
پیس ڈالے نہ کہیں صورتِ دیبا مجھ کو

تو بھی اشکوں کی روانی کا نہ ہو مجھ سے بیان
بحرِ تقریر ملیں گر لبِ دریا مجھ کو

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی:
"نظر آیا نہیں اللہ یہ ہے لائقِ شکر"
۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی:
"نسخے میں ذالہ زغیر۔۔ (کذا)"

دستِ پیغامبرِ یار میں مکتوب نہیں
کہ موسیٰ نے دکھایا یدِ بیضا مجھ کو
رنجِ ہجرانِ صنم دل کے برابر ہے[1] عزیز
ہے سودائے شبِ دیجورِ سویدا مجھ کو
وہ خریدار ہوں بازارِ جہاں میں ناسخ
غیرِ سودا نہیں ملتا کوئی سودا مجھ کو

۱۸۳

باغ میں دیکھا جو سروِ قامتِ صیاد کو
فاختہ سولی سمجھتی ہے ہر اک شمشاد کو
یاد تھا کیا جوہرِ عاشق کُشی حدّاد کو
آبِ شیریں میں بجھایا تیشۂ فرہاد کو
ہے جو دل آہوں سے خالی، جان لو ویرانہ ہے
کام رہتا ہے دھوئیں سے خانۂ آباد کو
کان دیتا گل کو بھی، بلبل کو گر نالہ دیا
تھا یہ لازم نخل بندِ گلشنِ ایجاد کو
کان کے پردے برنگِ گل ابھی ہوں چاک چاک
بلبلو! سنتا نہیں کوئی مری فریاد کو
فصلِ گل آئی ہے، پھر اپنے جنوں کا جوش ہے
بلبلیں آتی ہیں گلشن سے مبارک باد کو
قامتِ جاناں جنوں خیز ایسی ہے، دیکھے اگر
ہو وہیں درکار طوقِ فاختہ شمشاد کو

۱- مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع بھدی: "ہیں عزیز"

لاغر ایسا ہوں کہ مجھ میں کچھ نہیں جز مشتِ پر
بالشِ پر چاہیے شاید سرِ صیاد کو

آفتیں[1] دکھلائیں بیتابی نے کیا کیا عشق میں
کیوں نہ میں حسرت سے دیکھوں کورِ مادر زاد کو

شادی و غم کو نہیں ہے اپنے ویرانے میں بار
یہ تلوّن ہو مبارک خانۂ آباد کو

وصل کی شب جب رکھا اس نے مرے گھر میں قدم
صبح خندہ[2] رو ہوئی حاضر مبارک باد کو

کس[3] سہی قد کو چمن میں آج سلجھاتے ہیں ہم
شہپرِ قمری سے ارّہ شانۂ شمشاد کو

جا کے زلفوں میں فدائے قامتِ جاناں ہوا
کیا رسائی شانۂ بنتے[4] سے ہوئی شمشاد کو

غیر کے فرزند کو قابو میں لاؤں کس طرح
کر نہیں سکتا مسخّر اپنے میں ہمزاد کو

کیوں نہ یوں اپنا سراپا صرف شانوں میں کرے
مثلِ قد ہے عشقِ زلفِ یار بھی شمشاد کو

۱- مصطفائی طبع دوم - نسخۂ مطبع ہدی طبع ۱۲۵۸ھ : "آفتیں دکھلائیں بیتابی نے" -

۲- مصطفائی طبع دوم - نسخۂ مطبع ہدی طبع ۱۲۵۸ھ : "صبح خنداں رو ہوئی حاضر" -

۳- مصطفائی طبع دوم :
"کس سہی قد کو چمن میں آج سلجھاتے ہیں بال
شہپر قمری ہے ارہ شانۂ شمشاد کو"
مصطفائی طبع اول اور نسخۂ مطبع ہدی میں : "آج سلجھانے ہے بال" -

۴- "بنتے" : [illegible]

مشقِ تصویر اس کو ہے مشقِ تصوّر ہے مجھے
اپنی صنعت میں دکھا سکتا نہیں بہزاد کو

دیدۂ ظاہر سے ہے اے غافلو پنہاں تو کیا
دیدۂ عبرت سے دیکھو گلشنِ شداد کو

جالی کر کرتی اور الگیا مرغِ دل کو ہے بہت
حاجتِ دامِ قفس[1] کب ہے مرے صیاد کو

میں بھی تالو سے لگا لیتا ہوں بس اپنی زباں
گر کوئی سنتا نہیں ناسخ مری فریاد کو

۱۸۴

مزا وصال کا کیا گر فراقِ یار نہ ہو
نہیں ہے نشے کی کچھ قدر اگر خمار نہ ہو

نہ رونے تا کوئی عاشق ، یہ حکم ہے اس کا
کہ شمع بھی مری محفل میں اشک بار نہ ہو

جو ہچکی آئی تو میں خوش ہوا کہ موت آئی
کسی کو یار کا اتنا[2] بھی انتظار نہ ہو

ذقن ہے سبب تو عنّاب ہے لبِ شیریں
نہیں ہے سرو وہ خوش قد جو میوہ دار نہ ہو

وہ ہوں میں موردِ نفرت کہ در کنار ہے یار
بےؔ فشار کبھی گور ہم کنار نہ ہو

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"حاجتِ دام و قفس کب ہے مرے صیاد کو"
۲۔ مصطفائی طبع اول : "کسی کو یار کا بھی اتنا انتظار نہ ہو" ۔

نہ آئے کنجِ لحد میں بھی مجھ کو خوابِ عدم
اگر سرھانے کوئی خشتِ کوئے یار نہ ہو

برنگِ حسنِ بتاں ہے دلِ شگفتہ مرا
جو اس چمن میں[1] خزاں ہو تو پھر بہار نہ ہو

گئی ہے کیسی زمانے سے رسمِ سر گرمی
عجب نہیں ہے جو پتھر میں بھی شرار نہ ہو

نہ ہنسنے سے کبھی ہم راز پوش واقف ہوں
برنگِ غنچہ جگر جب تلک فگار نہ ہو

تری مژہ کی جو تشبیہ اس سے ترک کریں
کسی کے تیر سے کوئی کبھی فگار نہ ہو

دمِ اخیر تو کر لیں[2] نظارہ جی بھر کے
الٰہی ! خنجرِ سفّاک آب دار نہ ہو

ہوس عروج کی لے جائیں گر یہ[3] دنیا سے
کبھی بلند ہوا سے کوئی غبار نہ ہو

کمالِ صورتِ بے درد سے تنفّر ہے
نہ دیکھیں ہم کبھی اس گل کو جس میں خار نہ ہو

ہزاروں گور کی راتیں ہیں کاٹنی ناسخ
ابھی تو[4] روزِ سیہ میں تو بے قرار نہ ہو

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی طبع ۱۲۵۸ھ :
"جو اس چمن کو خزاں ہو تو پھر بہار نہ ہو"

۲- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی طبع ۱۲۵۸ھ :
"دمِ اخیر تو کر لوں" ۔

۳- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی طبع ۱۲۵۸ھ :
"ہوس عروج کی لے جائیں گر نہ دنیا سے"

۴- مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع ہدی : "ابھی سے روز سیہ میں"

۱۸۵

اہلِ حرفہ میں جو بت آن کا خریدار نہ ہو
جوشِ سودا کہیں اے دل سرِ بازار نہ ہو

بس دلا اب کسی گیسو کا طلب گار نہ ہو
قیدِ ہستی میں تو ہے اور گرفتار نہ ہو

ہو کے داخل جو نکلتا نہیں پھر کوئی بشر
زاہدا! خلد کہیں کوچۂ دلدار نہ ہو

شورِ محشر ہو اگر نالۂ زنجیر کی جا
پائے خوابیدہ ہمارا کبھی بیدار نہ ہو

چشم و ابرو کا ہوں عاشق نہ پڑھوں[۱] جا کے نماز
پاس مسجد کے اگر خانۂ خمار نہ ہو

تیری دیوار کا روزن جو نہیں ہوتا بند
کسی مہجور کا یہ دیدۂ بیدار نہ ہو

خود فروشی جو ہو منظور تجھے او کافر
کوئی یوسف کا زمانے میں خریدار نہ ہو

بغلِ گور میں کانٹا سا کھٹکتا ہوں میں
اس قدر بھی غمِ فرقت سے کوئی زار نہ ہو

گل عذاروں کو جو مدفون نہ کریں قبروں میں
سطحۂ خاک سے پیدا کبھی گل زار نہ ہو

نکلے نالوں کی ہوس دل سے ہمارے کس شکل
تیرے سوفاروں میں گر صورتِ منقار نہ ہو

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع مجدی:
"چشم و ابرو کا ہوں عاشق نہ کروں جا کے نماز"

ہے جو وصفِ لبِ شیریں میں مرے کلک کا حال
نیشکر بھی کبھی اس طرح شکربار نہ ہو
چھوڑ دے رسمِ عیادت بھی جو اس گل کا مزاج[۱]
غیرِ نرگس کوئی اس باغ میں بیمار نہ ہو
جس پری کی نظر آتی ہے مجھے زلفِ دراز
شبہ ہوتا ہے ترا سایۂ دیوار نہ ہو
ناتواں ہو کے جہاں میں رہوں ایسا ناسخ
کہ مرے پاؤں سے چیونٹی کو بھی آزار نہ ہو

۱۸۶

نہ جنوں میں بھی رکھا بخت نے عریاں مجھ کو
طوق نے جیب دیا، دشت نے داماں مجھ کو
دیدۂ شیر سے نرگس ہے زیادہ پُر ہولہ
ہجر میں دشتِ بلا ہے چمنستاں مجھ کو
گبر نفرت کرے، آگہ اگر حال سے ہو
شرم آتی ہے جو کہتے ہیں مسلماں مجھ کو
خلق خورشیدِ قیامت سے ڈرے گی لیکن
یاد[۲] آئے گا ترا چہرۂ تاباں مجھ کو
بعد مرنے کے جہاں روح پھرے گی بھٹکی
اے جنوں تو نے دکھایا یہ[۳] بیاباں مجھ کو

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع بھدی:
"چھوڑ دے رسم عیادت بھی جو اُس گل کا خیال"
۲- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع بھدی:
"آئے گا یاد ترا چہرۂ تاباں مجھ کو"
۳- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع بھدی: "وہ بیاباں مجھ کو" -

جانے اس کاکل پیچاں کی محبت کے عوض
کاٹتا کاش کوئی افعیٔ پیچاں مجھ کو
اس کا دیدار جو ہوگا تو قیامت ہوگی
کر دیا یار کی تصویر[1] نے حیراں مجھ کو
گور میں آنکھیں نکیرین کی روشن جو ہوئیں
آ گئے یاد نجومِ شبِ ہجراں مجھ کو
دولتِ وصل کی خواہش میں ہوا تھا عاشق
ہاتھ آیا نہ بجز گنجِ شہیداں مجھ کو
صاف اُن آنکھوں کو سمجھا تھا میں آہو لیکن
پنجۂ شیر ہوئے پنجۂ مژگاں مجھ کو
باغ میں آگ لگی آنی نظر تیرے بغیر
سرو دکھلائی دئے سروِ چراغاں مجھ کو
واعظا! ہے یہی ناسخ کی دعا بعدِ نماز
جائے فردوس ملے کوچۂ جاناں مجھ کو

۱۸۷

ہجر میں مر مر کے جب کاٹا شبِ دیجور کو
سمجھے ہم کافورِ میت صبح کے کافور کو
لائیں گر موسیٰ یدِ بیضا میں شمعِ طور کو
کر سکیں روشن نہ فرقت کی شبِ دیجور کو
بولے موسیٰ دیکھ کر اُس عارضِ پُر نور کو
کر دیا روشن اسی شعلے نے شمعِ طور کو

۱- مصطفائی طبع اول - نسخۂ مطبع مجیدی: "کر دیا یار کی تصویروں نے"۔

بزم میں ہو کس کو تیرے رقص کے آگے فروغ
جنبشِ دامن بجھا دیتی ہے شمعِ طور کو

رنگ اسے کہتے ہیں آویزہ کیا یاقوت کا
عکسِ روئے یار نے آویزۂ بلّور کو

بھاگ جاؤں گا جہنم کو، میں جنت چھوڑ کر
آتے ہوں گے ناز آدم زاد کے[1] گر حور کو

دیتی ہیں زلفیں تری رخ سے زیادہ مجھ کو رنج
دن سے افزوں رات بھاری ہوتی ہے رنجور کو

خواہشِ دیدار میں تارِ نگہ ہے جسمِ زار
طے میں اک لمحے میں کر جاتا ہوں راہِ دور کو

قصر اے منعم بناتا ہے تو اوروں کے لیے
جانتے ہیں ہم برابر تجھ کو اور مزدور کو

زاہدا ہے کس قدر مشکل حسینوں کا وصال
جیتے جی پاتے ہیں حق کو بعد مردن حور کو

تاک کے ہیں پاؤں تیرے راہ میں پر آبلہ
دیکھ اے بد مست چل کر خوشۂ انگور کو

آفتابِ صبح کا عالم دلِ زخمی میں ہے
داغِ غم چمکا، جو رکھا مرہمِ کافور کو

صاعقہ آس پر تو اس پر آتشِ رنگِ حنا
اس قدر نسبت ہے تیرے سنگِ پا سے حور[2] کو

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی:
"آتے ہوں گے ناز آدم زاد سے گر حور کو"

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی:
"جس قدر نسبت ہے تیرے سنگِ پا سے طور کو"

ہو گیا ہے دل مرا ظلمِ شبِ فرقت سے داغ
دوستو مرہم میں ڈالو صبح کے کافور کو

کاسۂ چینی پہ اے منعم نہ کر اتنا غرور
ہم نے دیکھا ٹھوکریں کھاتے سرِ فغفور کو

فکر ہے بینائیِ عاشق کی حسنِ دوست کو
بہرِ موسیٰ برق نے سرمہ بنایا طور کو

رنج میں تخفیف کرتی ہے مری طبعِ رواں
ہیں جو دانشمند جاری رکھتے ہیں ناسور کو

ہوں میں وہ زخمی تری تیغِ نگاہِ مست کا
مے ابھی ٹپکے جو توڑوں زخم کے انگور کو

بعدِ مردن بھی ہے تیرا خوف مجھ کو اس قدر
آنکھ اٹھا کر میں نے جنت میں نہ دیکھا حور کو

ہے وہ کافر جو نہیں مرتا حسینوں پر دلا
مرتے دم میں ہم مسلماں دیکھتے ہیں حور کو

اپنے عاشق کے بڑے دلسوز ہوتے ہیں حسیں
دور موسیٰ سے رہا شعلہ، جلایا طور کو

اس کو تلووں تک رسائی، تا بہ پیشانی اسے
اے صنم! کیا ہی حنا پر فوق ہے سیندور کو

جان دی اس پر ترے قدِ سہی کے عشق میں
حق تو یہ ہے دار سے کیا کام تھا منصور کو

بت پرستی میں ہے ناسخ حق پرستی کا خیال
دیکھتے ہیں ہر صنم میں ہم خدا کے نور کو

۲۸۸

نہیں آہن رُبا کھینچوں جو میں ہر ایک آہن کو
تری تلوار سے الفت ہے قاتل میری گردن کو

ملی ہے حسن سے وحشت، کروں کیا طوقِ آہن کو
وہ اپنی کاکلِ پیچاں سے باندھے میری گردن کو

جنوں سب کو ہے تجھ پر ہوگی اب زنجیر کی خواہش
بجائے سبحۂ و زنّار ہر شیخ و برہمن کو

جو منّت کش ہیں بہرِ غیر منعم اُن سے دبتے ہیں
جھکائے کیوں نہ پیشِ جام شیشہ اپنی گردن کو

خرابی ایک کی تو دوسرے کی یاں ہے آبادی
بناتا ہے فلک تربت گرا کر خانۂ تن کو

ہوئے اس کے کفِ پا سیرِ صحرا میں جو نور افشاں
وہیں جادہ کنارہ ہو گیا صحرا کے دامن کو

نظر آتا ہے یہ اُس کے شعاعِ حسن کا عالم
کہ سب کہتے ہیں پردہ کرکری[1] کا اس کی چلمن کو

نہ کیوں اے شہسوار اپنا رکھوں سر زیرِ سم ہردم
کہ میں سمجھا ہوں محرابِ عبادت نعلِ توسن کو

ہوا گلگشت میں بے یار ایسا جوش رونے کا
گرایا ہم نے سیلِ اشک سے دیوارِ گلشن کو

۱۔ ''کرکری'': ایک قسم کا ریشمی کپڑا (فرہنگ آصفیہ، جلد سوم، ص ۵۹۵)۔

چھوا ہے شوق اس گل کو بہت جام جانے کا
شرف گل ہائے گلشن پر ہوا خاشاکِ گلخن کو
کسی پر مجھ سے دنیا میں ستم دیکھا نہیں جاتا
بجائے شمع کاٹیں اہلِ محفل میری گردن کو
جو ہوتا وصل قسمت میں نہ پھرتا یوں جدا[۲] مجھ سے
کہ طالع سب کے ہیں معلوم اس طفلِ برہمن کو
وطن مجھ بے قرارِ عشق سے چھوٹا تو بس چھوٹا
نکل کر جا نہیں سکتا ہے پھر سیماب معدن کو
فلک کی سردمہری سے ہوا ہے انقلاب ایسا
بتاتا[۳] ہے زمستاں رشکِ گلشن جیسے گلخن کو
سرِ شوریدۂ ناسخ پہ احساں آخری ہوگا
بنائیں گے جو سنگِ کودکاں سے اس کے مدفن کو

۱۸۹

لگا دے شعلۂ عارض سے گر وہ آگ گلشن کو
کبابِ[۴] سیخ سمجھیں بلبلیں شاخِ نشیمن کو

۱۔ یہ شعر نسخۂ نول کشور طبع دوم میں موجود نہیں ہے ۔ البتہ نسخۂ مطبع مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع محمدی طبع ۱۲۵۸ھ میں موجود ہے ۔
۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع محمدی ۔ بہارستان سخن طبع ۱۲۶۳ھ: ”نہ پھرتا یوں خدا مجھ سے“ ۔
۳۔ مصطفائی طبع اول ۔ نسخۂ مطبع محمدی : ”بتاتا“ ۔
۴۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع محمدی :
”کباب و سیخ سمجھیں ، بلبل و شاخ نشیمن کو“

پس از مردن تو مشتِ خاک چھوتی[1] تیرے دامن کو
قدم رکھتا ہے کیا ظالم بچا کر میرے مدفن کو

وہ اکسیر آتشِ غم ہے کہ اپنی آہِ سوزاں نے
طلائی ایک دم میں کر دیا زنجیرِ آہن کو

چڑھائی نافۂ مشکیں سمجھ کر کشتۂ کاکل
غزالانِ بیاباں نے جو دیکھا میرے مدفن کو

چبا کر پان ظالم نے کیے گلگوں لب و دنداں
بنایا معدنِ یاقوت کیا ہیرے کی معدن کو

در و دیوارِ جاناں سے لگی رہتی ہے آنکھ اپنی
بنایا چشمِ بینا ہم نے اب ہر چشمِ روزن کو

رگوں کا جال ہے اب لاغری سے زیرِ پیراہن
پہنتا ہے کوئی زیرِ قبا جس طرح جوشن کو

جہاں[2] میں جتنے عمدہ ہیں سیاہی اُن پہ غالب ہے
طلا اور نقرہ پر ہے فوق جیسے تیغِ آہن کو

حسینوں کو تلاشِ رزق کب ہوتی ہے غربت میں
لیے پھرتے ہیں مثلِ ماہ گویا ساتھ خرمن کو

وفورِ بادہ خواری تک یہاں بنیادِ ہستی ہے
سرنگت ہوتی ہے سیلاب سے کاشانۂ تن کو

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع محمدی طبع ۱۲۵۸ھ ۔ بہارستان سخن طبع ۱۲۶۳ھ : ''چھو لے تیرے دامن کو'' ۔

۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع محمدی ۔ بہارستان سخن (انتخاب) طبع ۱۲۶۳ھ : ''جہاں میں جتنے عمدہ ہیں سیاہی ان پہ غالب ہیں'' ۔

لٹک آئی جو بازو پر کوئی لٹ زلفِ پیچاں کی
گیا[1] سونا سوگند اس نے ترے سونے کے جوشن کو

نہ کیوں بندہ رقیبوں کو جلانے اے بتو ہر دم
جہنم میں خدا بھی ڈالتا ہے اپنے دشمن کو

کسی صورت سے ناجنسوں میں الفت ہو، نہیں ممکن
عداوت ہے بہم تیغ و سپر کے آب و روغن کو

گریبانِ سحر میں جیسے ہے رنگِ شفق لازم
نہ چھوڑے گا لہو میرا کبھی قاتل کے دامن کو

مصائب نظم کرتا ہوں شبِ تاریکِ ہجراں کے
بنایا شمعِ بزمِ فکر میں نے طبعِ روشن کو

۱۹۰

رسائی ہے متاعِ حسن تک[2] کب دوست دشمن کو
نہیں ہوتی کبھی بجلی کی دہشت مہ کے خرمن کو

تصدق کے لیے دیکھا جو اپنے روئے روشن کو
چراغِ آفتاب اس نے بنایا ظرفِ روغن کو

وہ مسّی مل کے ہونٹوں پر اگر جاتا ہے گلشن کو
بنا دیتا ہے دودِ آہِ سوزاں شاخِ سوسن کو

یہاں[3] کیا ہے جو پھیلانے ہے تو اے برق دامن کو
اگر چاہے اٹھا لے جائے چیونٹی میرے خرمن کو

۱- مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجدی: "کیا سونا سگند اس نے"۔
۲- مصطفائی اول و دوم:
"رسائی ہے متاعِ حسن تک کب دستِ دشمن کو"
۳- یہ شعر مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجدی میں مقدم ہے۔

عجب کیا ہے جو انساں صورتِ دیوار حیراں ہو[1]
تجلی اس کے رخ کی بند کردے چشمِ روزن کو
اگر طولِ امل ہو قطع ہے ترکِ لباس آساں
کہ رشتے کی بدولت ربط ہے کپڑوں سے سوزن کو
کرے ہے تیرے مسی آلودہ ہونٹوں کی ثنا خوانی
خدا نے اس لیے اتنی زبانیں دی ہیں سوسن کو
اگر مضمون باندھوں چار دن دندانِ جاناں کا[2]
زمینِ شعر سے کردوں خجل ہیرے کی معدن کو
اگر اس کی جگہ پر ہوتی آنکھ اپنی تو کیا ہوتا
یہ حسرت دیکھتے ہیں ہم درِ جاناں کے روزن کو
ظہورِ[3] حسن گر چاہے، نہ عاشق کو رلایا کر
چھپا دیتا ہے باراں دیکھ مہر و ماہِ روشن کو
موافق حوصلے کے سمجھے ہیں سب رتبۂ جاناں
کہ ذرے جانتے ہیں مشرقِ خورشید روزن کو
برنگِ زخم بیدردی سے تو خنداں ہے اے قاتل
ہمارے زخم نے پُر خوں کیا ہے چشمِ سوزن کو
بنادے شیشۂ مے، اس کو بھی آتے ہی متوالا
جو پھینکے میکدے میں محتسب سنگِ فلاخن کو
نہیں تابِ سخن آگے مسی آلودہ ہونٹوں کے
زبانیں ہی زبانیں گرچہ دیں خالق نے سوسن کو

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : ''صورتِ دیوار حیراں ہیں''
۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : ''دندانِ جاناں کے'' ۔
۳۔ یہ شعر نسخۂ مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجدی ۱۲۵۸ھ میں مقدم ہے ۔

چھڑی دیکھی جو اس رشکِ چمن کے دستِ نازک میں
بھلایا بلبلانِ باغ نے شاخِ نشیمن کو
سمانے کو نہ ہم اس کی نظر میں ایک دن، لیکن
غبار اپنا پس از مردن ہے سرمہ چشمِ دشمن کو
خمار اک دن نہ ٹوٹا جز سبو اے چرخِ مینائی
بجائے جام یاں گردش رہی سنگِ فلاخن کو
گریباں چاک ہیں اب تک سنا تھا میرا اک نالہ
ہنسی میں گل اڑا دیتے ہیں بلبل تیرے شیون کو
بھلا غیر از غزل خوانی ہو مجھ کو کام کیا ناسخ
بجز نالہ نہیں آتا ہے کچھ مرغِ نوازن کو

۱۹۱

بے ثباتی ہے نہایت حسنِ بے ناموس کو
پائداری ہوتی ہے کم شمعِ بے فانوس کو
ہے گریز اس زلف کو میرے تنِ پرداغ سے
بھاگتے ہیں سانپ جیسے دیکھ کر طاؤس کو
جب سے میں نالاں لگا رہنے بتوں کے عشق میں
توڑ ڈالا کافروں نے دیر میں ناقوس کو
اشک بہتے ہی دلِ پرداغ چلّانے لگا
نالے یاد آئیں نہ کیوں برسات میں طاؤس کو
اس لیے جھوٹا بھی وعدہ وصل کا کرتا نہیں
تا نہ تسکیں ہو کبھی میرے دلِ مایوس کو
عشقِ کامل اس کو کہتے ہیں کہ قاتل سر مرا
تن سے ہوتے ہی جدا دوڑا ترے پابوس کو

فرقتِ زندانِ تن ہے روح کو جس طرح شلق
یوں رہائی ہے وبال اُس زلف کے محبوس کو

کیوں جدا اُس مصحفِ رخ سے دلِ پُر داغ ہے
رکھتے ہیں اکثر مصاحف میں پرِ طاؤس کو

دل اگر فارغ نہیں ، ناساز ہے سازِ نشاط
عید کے دن رنج ہوتا ہے فزوں محبوس کو

وہ نہیں میرا جنوں فاسخ جو ہو درماں پذیر
نبض اگر دیکھے مری ، سودا ہو جالینوس کو

۱۹۲

رسا اوجِ حقیقت پر کروں اب عشق بازی کو
بجائے نردباں سمجھا ہوں میں عشقِ مجازی کو

بہت جانے لگا ہے اب جو[1] بازی گاہِ طفلاں میں
دلا تو جانتا ہے کھیل شاید عشق بازی کو

ہوئی اقلیمِ خوباں میں یہ قدرِ جنسِ خود بینی
سکندر ڈھونڈتا ہے اب دکانِ آئنہ سازی کو

بیاں کیا ہو سکے عمرِ رواں کی مجھ سے چالاکی
کہ اس توسن سے لگا ہے نہ ترکی کو نہ تازی کو

اکیلا دل مرا فوجِ تمنا کے مقابل ہے
الٰہی کیجیو تو فتح باب اس مردِ غازی کو

ہمیشہ ہاتھ میں رکھتا ہے زلفِ یار کو شانہ
ذرا دیکھو تو اس کے دستِ کوتہ کی درازی کو

۱۔ مصطفائی طبع اول : "بہت جانے لگا ہے اب وہ" ۔

کہاں تھا اے بتو ہم کو دماغِ ناز برداری
خدا کرتا ہے شرمندہ ہماری بے نیازی کو

ثمر پختہ جو ہے اے خام طبعو باغِ عالم میں
نہ کیونکر خاکساری سے وہ بدلے سرفرازی کو

وضو ہے ہاتھ دھونا جان سے ، سجدہ ہے سر کٹنا
طریقِ عشق میں ہے قتل گہ مسجد نمازی کو

اتر جاؤں ابھی دریائے غم سے وہ اگر چاہے
میں کشتی جانتا ہوں یار کی تیغِ جہازی کو

بحسرت دیکھتا ہے ماہِ کنعاں مجھ کو اے ناسخ
دیا دل جب سے میں نے ایک محبوب حجازی کو

۱۹۳

میں جو روؤں ، خرمنِ ماہِ درخشاں سبز ہو
چاندنی کا کھیت مثلِ کشتِ دہقاں سبز ہو

لختِ دل غنچوں سے پیدا ہوں برنگِ برگِ گل
گر ہمارے ابرِ مژگاں سے گلستاں سبز ہو

خلق کو حیرت ہو ، کیونکر سرو یہ چلنے لگا
گر تری پوشاک اے سروِ خراماں سبز ہو

سبزی[۱] رخسارِ جاناں عکس افگن ہو اگر
آئینہ مثلِ زمرّد پیشِ جاناں سبز ہو

"قُم باذنی" ہر دلِ مردہ کو ہے آوازِ نے
آبِ حیواں سے خداوندا ! نیستاں سبز ہو

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخہ مطبع ہندی : "سبزۂ رخسار جاناں"۔

کیا عجب گر زہرمارِ زلف کی تاثیر سے
تارِ سنبل کی طرح میری رگِ جاں سبز ہو

آ گیا ہے یاد رونے میں کسی کا حسنِ سبز
اشک آنکھوں سے اگر پوچھوں تو داماں سبز ہو

مرہمِ زنگار رکھ میرے دلِ پُر داغ پر
ہے طلسمِ تازہ گر سروِ چراغاں سبز ہو

دیکھتا ہوں میں کسی کے سبزۂ خط کی بہار
کیا عجب مانندِ خط گر میری مژگاں سبز ہو

تیرے گل[1] کے سامنے ہو جائے گل کا زرد منہ
آگے زلفوں کے نہ ہرگز سنبلستاں سبز ہو

عکسِ گل سے ہے شراب لعل گوں ہر نہر میں
کیوں نہ مینا کی طرح سروِ گلستاں سبز ہو

روتے پھرتے ہیں جہاں میں اس لیے ہم مثلِ ابر
شاید اشکوں سے کہیں گورِ غریباں سبز ہو

چشمِ تر پر گر خیالِ دستِ رنگیں میں رکھوں
صورتِ شاخِ حنا پھر شاخِ مرجاں سبز ہو

فیض ظالم سے نہیں پایا کسی نے غیرِ ظلم
آبِ خنجر سے بھلا کیا کشتِ دہقاں سبز ہو

سبزۂ خط کے مضامیں اس میں باندھے ہیں تمام
ہے بجا ناسخ اگر قرطاسِ دیواں سبز ہو

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی: "تیرے منہ کے سامنے"۔

۱۹۴

تیز ہردم کرتی ہے تیغِ نگاہِ یار کو
چشم کی گردش ہوئی ہے سان اس تلوار کو

شانہ ترغیبِ ستم دیتا ہے زلفِ یار کو
دشمنِ جانِ جہاں کرتے ہیں دندانِ مار کو

یوں نزاکت سے گراں ہے سرمہ چشمِ یار کو
جس طرح ہو رات بھاری سرِ دمِ بیمار کو

خاکسارانِ جہاں کا ہے ادب ایسا مجھے
پاؤں رکھتا ہوں بچا کر سایۂ دیوار کو

دل میں ایمن ہو نہ خونخوارو! جو دشمن ہے ضعیف
مورچا دیکھو تو کھا جاتا ہے کیا تلوار کو

پڑ گئی زنجیر میری بیڑیوں کے پاؤں میں
کھینچے مقناطیس سنگِ آستانِ یار کو

درد ہو اہلِ نظر کا کیا اُنھیں جو ہیں حسیں
پوچھتا ہے کوئی گل کب[1] نرگسِ بیمار کو

مغبچہ[2] بھرنے لگا بط میں جو آبِ آتشیں
مے کدے میں ہم نے دیکھا مرغِ آتش خوار کو

بال زلفوں کے دیے کھول اس نے جو ٹوٹے ہوئے
سانپ کی بانبی میں سمجھا رخنۂ دیوار کو

پھر خزاں میں نوچتے ہیں داغِ سودا کے کھرنڈ
تیز رکھیں شاخِ گل سے بلبلیں منقار کو

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ـ نسخۂ مطبع مجیدی : ''کوئی کب گل'' ـ
۲- مصطفائی طبع اول و دوم : ''مغبچہ بھرنے لگا'' ـ

رتبۂ اعلیٰ میں ظالم ترکِ تمکیں کر دیتے ہیں ظلم
پاؤں سے کاہش نہیں خارِ سرِ دیوار کو
ہے یہ ناسازِ طبیعت ہجر میں سازِ نشاط
نبض بے جاں جانتا ہوں ساز کے ہر تار کو
مجھ سے حالِ چشمِ تر تحریر ہو سکتا نہیں
جانے خط لے جا صبا اک ابرِ دریا بار کو
برہمن ہو کر مسلماں کرتے ہیں دنیا کو صید
دام[1] پٹواتے ہیں گویا توڑ کر زنّار کو
بند ہو جاتی ہیں سیاروں کی آنکھیں خوف سے
کھینچتا ہوں جب میں دل سے آہِ آتش بار کو
جب کہ بیت اللہ میں ناسخ بتوں کا ہو مقام
بار کیونکر ہو نہ بزمِ یار میں اغیار کو

۱۹۵

حق نے پہلے یار سے پیدا کیا اغیار کو
جس طرح نشو و نما ہے گل سے اول خار کو
ہو یقیں دیکھے جو دونوں ابروے خمدار کو
دوسری بھی کھنچتی ہے کھینچے جو اک تلوار کو
دی ہے خالق نے ازل سے آبرو تلوار کو
کیوں نہ آنکھوں پر جگہ ہو ابروے خمدار کو
ہے بجا مشکل جو گھر میں بیٹھنا ہے یار کو
جو کہ یوسف ہے نہ جانے کس طرح بازار کو

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی: "بدام بنواتے ہیں۔"

رحم آ جائے اگر موران ِکوئے یار کو
کھینچ لے جائیں لحد سے میرے جسم ِ زار کو

کون ہے گلگشت کا عازم کہ استقبال کو
گل پیادہ ہو کے گلشن سے چلے بازار کو

آبلے جب تک نہ ہوں جاتا نہیں صحرا کو میں
تا نہ میرے سخت تلووں سے ہو ایذا خار کو

چربی و نرمی بچا لیتی ہے خونخواروں کو بھی
زلگ کھا جائے، نہ چکنائیں اگر تلوار کو

قتل کرتا ہے مجھے تیرا بہ انداز ِ نماز
سجدہ گہ ہے سنگ تیغ ِ ابروے خمدار کو

ہے اگر درباں ! سلامت یار کا تیر ِ نگاہ
غم نہیں تو بند کردے روزن ِ دیوار کو

کیا دلا شکوہ بتوں کا، قصۂ موسیٰ ہے یاد
رنج دیتا ہے خدا بھی طالب ِ دیدار کو

سورۂ یٰسین کے بدلے حشر کی صورت پڑھوں[۱]
مرتے دم میں یاد کرتا ہوں خرام ِ یار کو

ہیں جو خوں ریزوں کے پیرو شاد رہتے ہیں مدام
رات دن ہنستے ہی دیکھا ہے لب ِ سوفار کو

سامنے خالق کے اے ناسخ ! کراماً کاتبین
روز لے جاتے ہیں لکھ لکھ کر مرے اشعار کو

۱- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع مجدی :
''سورۂ یسین کے بدلے حشر کی صورت پڑھو''

۱۹۶

چاہیے نقد دلِ عشاق زلفِ یار کو
ہے بجا گر ہو خزانے سے محبت مار کو

عطر ملنا یوں ہے اے مشاطہ زلفِ یار کو
مشکِ نافہ جیسے لے جائے کوئی تاتار کو

خط نے کیا سیدھا بنایا کاکلِ خمدار کو
کر دیا بیکار مورِ ناتواں نے مار کو

کر دیا قاتل رقیبِ سخت دل نے یار کو
جس طرح ہوتی ہے تیزی سنگ سے تلوار کو

ہے بروں کو عیش اور اچھوں کو ہے دنیا میں رنج
توڑتا ہے گل کو گلچیں، چھوڑتا ہے خار کو

میں ہوں نرگس، تو ہے گل باغِ جہاں میں اے صنم
ٹکٹکی باندھے نہ کیوں دیکھوں تیرے رخسار کو

قتلِ دشمن کے لیے بھی چاہیے نرمی ضرور
ٹوٹ جاتے بیشتر دیکھا کڑی تلوار کو

پاؤں ہیں راہِ طلب میں سر سے بھی مجھ کو عزیز
آبلوں پر کیوں نہ باندھوں پھاڑ کر دستار کو

خود بخود افتادگانِ خاک کا ہوتا ہے اوج
نردباں درکار ہے کیا سایۂ دیوار کو

اک تمنائے جواں مردی ہے ناسخ ترکِ حرص
عمر بھر میں ہے دمِ آب اکتفا تلوار کو

تشنگی میں گر مرا حلق اے سکندر خشک ہو
آئنے سے چشمۂ حیواں فزوں تر خشک ہو

تر جو دیکھے تیرے ہونٹوں کو شرابِ لعل سے
کیوں نہ پھر لعلِ بدخشاں مثلِ اخگر خشک ہو

دل شکستہ گلشنِ عالم میں ہوں اے رشکِ گل
صورتِ شاخِ شکستہ کیوں نہ پیکر خشک ہو

بادۂ گلگوں ہو بے ساقی الٰہی مجھ کو آگ
چشمۂ خورشید ساں لبریز ساغر خشک ہو

تب تو جانے گا تو مجھ کو بے گنہ مارا گیا
گر قیامت تک نہ خونِ چشمِ جوہر خشک ہو

بختِ بد نے آبِ دریا کو کیا ریگِ رواں
میری قسمت سے مبادا حوضِ کوثر خشک ہو

ہے گرہ میں قابلِ نقصان متاعِ ممسکاں
تنگ چشمی سے نہ کیونکر آبِ گوہر خشک ہو

کون پانی حلق میں اس کے چوائے وقتِ نزع
جس کے ہوتے ہی تولّد شیرِ مادر خشک ہو

جو کہ ظالم ہیں وہ ہرگز تر زباں ہوتے نہیں
کیوں نہ خونریزی سے آبِ تیغ و خنجر خشک ہو

گریہ ہے منظور ہم رندوں کی آنکھیں تر نہ ہوں
فصلِ گل میں ایک دم ساقی نہ ساغر خشک ہو

گر کرے زاہد وضو، تاثیرِ زہدِ خشک سے
موجِ دریا خارِ ماہی کے برابر خشک ہو

گر پسیجے میرے نالوں سے تو پھر اے سنگ دل
ہے یقیں مانندِ یخ ہرگز نہ پتھر خشک ہو
دھوئے دریا میں اگر تو اپنی زلفِ عنبریں
مثلِ موجِ ریگ غم سے موجِ عنبر خشک ہو
شعلہ زن ہے آتشِ رنگِ گلِ رخسارِ یار
کیوں نہ شاخِ سنبلِ زلفِ معنبر خشک ہو
دیکھ کر آغازِ خط اُس گل کی آنکھیں تر ہوئیں
کیوں بنایا آئینہ، دستِ سکندر خشک ہو
تو جو اے سروِ رواں گھر کو چلے گلزار سے
سوزِ غم سے ہر شجر مثلِ مشجّر خشک ہو
تر پسینے سے ترا دیکھے جو روئے آتشیں
کیوں نہ شعلے کی طرح دم میں گلِ تر خشک ہو
بھیجوں اُس صیاد کو نامہ[1] تو مارے خوف سے
مثلِ مرجاں جسم میں خونِ کبوتر خشک ہو
چار باغ[2] جسم میں ہے آبِ جوئے اشک آہ
نخلِ ماتم سبز ہو، دل کا صنوبر خشک ہو
چشمِ تر کو گرمیٔ داغِ جنوں سے کیا ضرر
تابشِ خورشید سے گرداب کیونکر خشک ہو
میری آنکھیں روتی ہیں ناسخ اسی افسوس میں
آہ ہم تر ہوں، لبِ آلِ پیمبر خشک ہو

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : ''تو مارے خوف کے۔''
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
''چار باغ جسم میں اے آب جوئے اشک و آہ''

مہر تاباں جانتا ہے ہر بشر آئینے کو
دیکھتا ہے تو اگر وقتِ سحر آئینے کو

یوں خجل کرتا ہے وہ رشکِ قمر آئینے کو
زشت رو ہو جیسے نادم دیکھ کر آئینے کو

عاشقوں کا دھیان جو ہے جانتا ہے وہ صنم
شانے کو تو سینہ چاک، اور چشم تر آئینے کو

یوں مرے آئینۂ دل کو نہ تو دے دے پٹک
دوست رکھتے ہیں حسیں اے فتنہ گر آئینے کو

عکس افگن اب کبھی بھولے سے بھی ہوتا نہیں
وہ صنم حیران اپنا دیکھ کر آئینے کو

دل میں رکھتے ہیں کدورت جو کہ ہیں ظاہر میں صاف
زنگ میں آلودہ پایا بیشتر آئینے کو

پہنے رہتے ہیں زرہ جوہر کی اپنے جسم میں
ہے ترے تیرِ نگہ کا خوف ہر آئینے کو

گر صفائے دل تجھے منظور ہے کر حبسِ دم
دم سے ہوتا ہے ارے غافل ضرر آئینے کو

پڑ گیا گر عکس اُس کے شعلۂ رخسار کا
جائے جوہر ہاتھ آئیں گے شرر آئینے کو

دیکھتا ہوں میں فقط آئینۂ رخسارِ یار
ڈھونڈھتا ہے اک جہاں ماہِ صفر آئینے کو

وہ پری مجنوں ہوا ہے اپنی[1] صورت دیکھ کر
سنگِ طفلاں سے بنایا ہے مگر آئینے کو

پڑ گیا ہے اُس کو اب دیدارِ جاناں کا مزا
خانۂ زنداں نہ کیوں ہو جائے گھر آئینے کو

توڑ کر زنجیرِ جوہر لی حلب سے راہِ ہند
جبکہ تیرے حسن کی پہنچی خبر آئینے کو

چشمِ جوہر سے تری فرقت میں رویا اس قدر
ہو گیا اندھا، نہیں آتا نظر آئینے کو

ہو گیا مجھ کو یقیں اک بال اس میں پڑ گیا
اُس نے دکھلائی جو ہے[2] اپنی کمر آئینے کو

زار ہوں ایسا کہ عکس آتا نہیں ہرگز نظر
دیکھتا ہوں خوب ناسخ میں اگر آئینے کو

۱۹۹

نہ لائے عالمِ بالا سے کیوں طوبیٰ کے مضموں کو
خیالِ قامتِ موزوں ہے میری طبعِ موزوں کو

رہائی کی نہیں تدبیر کوئی زُلفِ جاناں سے
یہ وہ مارِ سیہ ہے جو بھلا دیتا ہے افسوں کو

بہت خالِ عذارِ آتشیں سے جو مشابہ ہے
بہ رغبت اس لیے پیتے ہیں سب لالے کی افیوں کو

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مہدی :
"وہ پری مجنوں ہوا ہے شکل اپنی دیکھ کر"

۲- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مہدی :
"اس نے دکھلائی جوں ہی اپنی کمر آئینے کو"

عجب کیا گر ہلالِ ابرو اک دن ماہِ کامل ہو
ترقی دم بدم کیسی ہے حسنِ روز افزوں کو

نہ کچھ یہ راہ رو حیرت میں رہ جاتے ہیں چلنے سے
تری رفتار آئینہ بنا دیتی ہے جیحوں کو

بسانِ سنگ تن میں ضبطِ آہِ شعلہ افشاں سے
بنا دے گا شرر سوزِ دروں ہر قطرۂ خوں کو

جو شب بیدار ہیں وہ غافلوں پر رہتے ہیں غالب
بہت سی فوج پر جاتی ہے تھوڑی فوج شبخوں کو

جو ہیں بے عقل دنیا میں وہی کچھ عیش کرتے ہیں
ملا ہے دورِ گردوں سے خمِ خالی فلاطوں کو

یہ ناداں کہتے ہیں لایا ہے گردش میں ہمیں گردوں
کہ گردش اس نے دی ہے جس نے گردش دی ہے گردوں کو

پیے سے اس کے ہو جو نشہ وہ ہو اس کے دیکھے سے
نہ جامِ بادہ پہنچے گا تمھاری چشمِ میگوں کو

گلستانِ شہادت گاہ میں یہ طرفہ گل پھولا
بنایا شاخِ گل قاتل نے اپنے دستِ پرخوں کو

عمل گر ہے تو کیفیت ہے، ورنہ علم خالی کیا
نہ پایا قطرۂ مے، مل گیا گر[1] خم فلاطوں کو

مجھے سمجھو کہ عاشق ہے اسے سمجھو ہے دیوانہ
ملاؤ گر مری تصویر سے تصویرِ مجنوں کو

کیا بے ہوش تو نے جام مے دکھلا کے اے ساقی
کہ اکثر دیکھتا تھا میں کسی کی چشمِ میگوں کو

۱۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجیدی:
"نہ پایا قطرۂ مے، مل گیا گو خم فلاطوں کو"

اثر تھا نالۂ شب گیر میں جن روزوں اے ناسخ
لیا کرتے تھے اکثر ہاتھ میں اس زلفِ شبگوں کو

۲۰۰

غضب ہے سرو باندھا اس پری کے قدِ گلگوں کو
یہ کس شاعر نے ناموزوں کیا مصراعِ موزوں کو

ذرا دیکھے کوئی ابرو تو سمجھے قدر شاعر کی
لکھا ہر مصحفِ رخ پر خدا نے بیتِ موزوں کو

نہ کوئی مال دنیا کا اٹھا لے جائے گا سر پر
زمانے میں نصیب ایسے ملے بس ایک قاروں کو

یقیں ہو اک جہاں کو مشک اس کاغذ میں رکھا ہے
کروں تحریر میں جس پر تری زلفوں کے مضموں کو

کسی کے گوشۂ دل پر تصرّف سخت مشکل ہے
یہ ممکن ہے مسخّر کوئی کر لے ربعِ مسکوں کو

ہوا دل مشرقِ خورشیدِ معنی اس خمِ مے سے
کیا ہے ہم نے حاصل بارے اشراقِ فلاطوں کو

بجائے شیشہ ، واژوں ساغرِ لبریز ہوتا ہے
ہمیشہ کیا ہی الٹی سوجھتی ہے بختِ واژوں کو

جو آہو گیر ہیں وہ شرم سے آنکھیں چراتے ہیں
کیا ہے میں نے جو موزوں تری آنکھوں کے مضموں کو

ہوئے ہیں شاعروں کے پست کیوں طالع میں حیراں ہوں
کہ ہے باغِ جہاں میں سربلندی سروِ موزوں کو

معلّق[1] ساتھ ہے ہمراہ جل جانے کی دہشت سے
کیا یہ گرم میری گرم رفتاری نے ہاموں کو
جو شیریں بیستوں پر جائے گی تو جوش میں آ کر
کرے گا گرد خونِ کوہکن خسرو کے گلگوں کو
یقیں ہوتا ہے عالم کو گلوئے شیشہ مے کا
لگاتا ہے گلوئے نے سے جب وہ لعل میگوں کو
ہوا ہے تو کبھی اے ماہ رو پرتو فگن شاید
کہ عکسِ آفتاب ان روزوں داغِ دل ہے جیحوں کو
کیا سوراخ دار اے جان تیری نوکِ مژگاں نے
برنگِ دانۂ مرجاں سرے ہر قطرۂ خوں کو
کیا[2] جو عہد موسیٰ سے بجا لایا میں اے ناسخ
بہت گوسالے چلّائے، نہ چھوڑا میں نے ہاروں کو

۲۰۱

لگایا آپ پتھر اُس نے مجھ شوریدہ مجنوں کو
رکھوں کیونکر نہ سر پر داغِ سودائے ہمایوں کو
کہا کچھ کان میں اور چھو لیا گیسوئے شبگوں کو
کہاں تاثیر ایسی مار گیری میں ہے افسوں کو
خیال اُس صید افگن کا ہے یوں ہر صید ہاموں کو
تمنا آمدِ لیلیٰ کی تھی جس طرح مجنوں کو

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع مجدی: "معلق سایہ ہے"۔
۲- یہ شعر (مقطع) نول کشور طبع دوم میں موجود نہیں ہے۔ مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجدی میں موجود ہے۔

اُڑا یہ رنگ میرا دیکھ کر اُس روئے گلگوں کو
جو دیکھے وہ کہے شبنم سرے ہر قطرۂ خوں کو
خدا نے کیا دیا ہے رنگ اُس کے روئے گلگوں کو
کہ ہے اُس کے پسینے سے خجالت قطرۂ خوں کو
کیا ہے حیرت افزا اُس[1] نے جامِ چشمِ میگوں کو
کہ ہے دشوار ریزش شیشۂ لبریزِ واژوں کو
کیا ہے کیا ہی وحشت زا سری وحشت نے ہاموں کو
کہ سایہ بھاگتا ہے چھوڑ کر اب بیدِ مجنوں کو
گریزاں سانپ ہوں جس سے اثر کیا اس پہ افسوں کو
بجا ہے گر کہوں ثعبانِ موسیٰ زلفِ شبگوں کو
مسخّر کر گیا[2] لاکھوں پری زادانِ مضموں کو
غضب افسوں گری آتی ہے میری طبعِ موزوں کو
غزالانِ حرم کا کیوں نہ شک ہو تیرے مفتوں کو
جو دیکھے طاقِ ابرو میں تری چشمانِ میگوں کو
ہوس ہے آمدِ لیلیٰ میں تزئیں کی جو مجنوں کو
تو کوسوں ریگ نے پُر زر کیا دامانِ ہاموں کو
ہے اُس میں چہرۂ روشن تو بے نور آفتاب اس میں
سرِ روزِ سیہ عہ کیا ہے نسبت زلفِ شبگوں کو
خراباتِ جہاں میں ترکِ عشرت کرتے ہیں دانا
پسند آیا اسی خاطر خمِ خالی فلاطوں کو

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی طبع ۱۲۵۸ھ : "کیا ہے حیرت افزا کس نے"۔
۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : "مسخر کر لیا لاکھوں"۔

اگر ایسی ہے ان اہلِ دول کی پستیٔ ہمت
یقیں ہے رفتہ رفتہ لیں گے سر پر گنجِ قاروں کو
یہ اوجِ نشّۂ مے ہے کہ بدمستی میں گر چاہوں
پٹک ماروں زمیں پر میں ابھی مینائے گردوں کو
نہ سمجھا چیز کچھ تیمور[1] اس کو لنگ ہونے پر
مری وحشت کے آگے کیا ہے وسعت ربعِ مسکوں کو
پسینہ اپنے ماتھے کا نہیں جھاڑا ہے انگلی سے
یہ اس بے قدر نے توڑا ہے سلکِ دُرِ مکنوں کو
سیاہی بن گئی شنگرف کیا تاثیر ہے قاتل
لکھا میں نے جو تیرے عارضِ گلگوں کے مضموں کو
کوئی بے درد گل ایسا نہ ہوگا باغِ عالم میں
سمجھتا ہے گلِ لالہ وہ میری چشمِ پُرخوں کو
زمینِ شعر کو چوتھا فلک میں نے بنایا ہے
لکھا ہے آفتابِ روئے جاناں کے جو مضموں کو
ابھی بحرِ ہزج کو ہر کوئی بحرِ رمل سمجھے
کروں موزوں میں اپنی خاکساری کے جو مضموں کو
جو اس خورشید رو کے عشق میں ہاتھ آئے اے ناسخ
تو ذروں کی طرح دم میں اڑا دوں گنجِ قاروں کو

۲۰۲

درازی یاد دلواتی ہے اس زلفِ پریشاں کو
عزیز اس واسطے رکھتا ہوں میں شب ہائے ہجراں کو

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع ہندی میں 'تیمور' کو 'طیمور' لکھا گیا ہے۔

کہا میں عالمِ وحشت میں جب سیرِ بیاباں کو
لتاڑا شیرِ قالیں کی طرح شیرِ نیستاں کو
نہ دیکھا ساتھ گلشن میں جو اس سروِ خراماں کو
کیا سروِ چراغاں آہ نے سروِ گلستاں کو
کسی دن آ کے دیکھے شانۂ عاج اس کی زلفوں میں
کبھی دیکھا نہ ہو جس نے یدِ بیضا میں ثعباں کو
یقیں ہے شوقِ کامل سے اگر ریگِ رواں بن کر
رواں ہو خاک میری بعدِ مردن کوئے جاناں کو
جو دعوائے خدائی ہے، نکال اغیار کو گھر سے
خدا نے اے صنم باہر کیا جنّت سے شیطاں کو
جنوں نے جب کہ دی روزِ ازل ترغیبِ عریانی
گریباں صبح کو بخشا، دیا دامن بیاباں کو
سنا تھا سانپ آتے ہیں نظر برسات میں اکثر
میں رویا ابر ساں برسوں، نہ دیکھا زلفِ پیچاں کو
ہم اے جراح برسوں روئے ہیں، دو دن تو ہنسنے دے
نہ سی بہرِ خدا ظالم دہانِ زخمِ خنداں کو
ہزاروں صدمۂ جاں کاہ ہیں پر میں نہیں مرتا
کہوں اب آبِ حیواں ظلمتِ شب ہائے ہجراں کو
اثر بارے دکھایا بعدِ مدت میرے رونے نے
گرایا سر پہ سیلِ اشک نے دیوارِ زنداں کو
مقابل اس پری کے ہوتے ہی پرواز ایسی کی
کہ میرے ہوش نے پیچھے رکھا تختِ سلیماں کو
حنا خالق نے کی پیدا جو تیرے پاؤں کی خاطر
بنایا میرے تلووں کے لیے خارِ مغیلاں کو

دکھا کر وہ سہی قامت حنائی ہاتھ رکھتا ہے
کیا شمشاد سے پیدا خدا نے شاخِ مرجاں کو
نہ کیونکر چشمِ مستِ یار خوش ہو میرے رونے سے
کہ ناسخ دوست رکھتا ہے ہر اک مے خوار باراں کو

۲۰۳

قطع کرتا ناتوانی میں عصا سے راہ کو
گر اٹھا سکتا برنگِ کہربا میں کاہ کو
پست کیا ہستی میں ہوں رکھتے ہیں جو ہمتِ بلند
جانتا تھا نردبانِ عرش ، یوسف چاہ کو
کیا کسی ناچیز کو ناچیز ہم سمجھیں بھلا
آنکھ پر رکھتے ہیں اکثر وقتِ حاجت کاہ کو
جو دنی ہیں وہ بھی کرتے ہیں حسینوں سے سلوک
اس دیانت[1] پر فلک دیتا ہے خرمن ماہ کو
کچھ تو ان روزوں رسائی تا اثر پیدا ہوئی
واہ وہ کرنے لگا ہے سن کے میری آہ کو
کیا حسد سے چاک ہوتے ہیں جگر مانندِ صبح
دیکھ کر تاباں کسی کے آفتابِ جاہ کو
ٹھوکریں کھانے کو جائے طور پر اب کیوں کلیم
دیکھ پایا ہے صنم تیری تجلّی گاہ کو
ہستیٔ ہمت سے بجھتا ہے کوئی مالِ بخیل
زور سے اہلِ جہاں لیتے ہیں آبِ چاہ کو

۱ـ مصطفائی اول و دوم ـ نسخۂ مطبع مہدی :
"اس دنائت پر فلک دیتا ہے خرمن ماہ کو"

شاخِ گل مثلِ سمندِ جو برنگِ گل وہ طفلِ نے سوار
نکہتِ گل کھینچے ہیں ہم گرد بازی گاہ کو

مے بھی ہے حوریں بھی ہیں، غلماں بھی ہیں فردوس میں
ترک کرتا ہوں میں زاہد عیشِ خاطر خواہ کو

نقشِ پا سے محتسب پائے نہ رندوں کا سراغ
سر سے طے کرنا ہے لازم مے کدے کی راہ کو

خیمہ چھوانے میں ہیں مصروف جو یہ اغنیا
جانتے ہیں تنگ شاید چرخ کی خرگاہ کو

ہیں زمانے میں جو مکار اُن سے ہے مجھ کو گریز
جانتا ہوں شیر اس صحرا میں ہر روباہ کو

ہے خراباتِ جہاں میں عام فیضِ مے فروش
مستیٔ مے سے ہوتی ہے یکساں گدا و شاہ کو

ہے برابر سالکوں کو اسفل و اعلیٰ سے راہ
رہ رو کرتے ہیں طے پست و بلندِ راہ کو

ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتی خدا کے گھر کی راہ
چاہتا ہوں ان دنوں ایسے بتِ گمراہ کو

حلقۂ آغوش سے اُس طفل نے جب کی گریز
تو میں سمجھا بس اُس کے قامتِ کوتاہ کو

گو غرض ناچیز سے نکلے آئے رکھیے عزیز
پیار سے آغوش میں لیتا ہے شعلہ کاہ کو

کیوں ہمارے حال سے رہتا ہے غافل اے صنم!
اپنے بندوں سے نہیں غفلت کبھی[1] اللہ کو

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہندی :
"اپنے بندوں سے کبھی غفلت نہیں اللہ کو"

مثلِ سطر آ جاتی ہے زیرِ قدم زلفِ دراز
کھینچے کلک اے طفل تیرے قامتِ کوتاہ کو
ہوں میں ایسا رحم کے قابل کہ گنبد کی طرح
آہ کرتا ہے فلک بھی سن کے میری آہ کو
آدمی کو مبتلائے حرص کر دیتی ہے عقل
جانتے ہیں مملکت اطفال بازی گاہ کو
عشق جب وارد ہوا ، کی عقل نے دل سے گریز
ایک جا دیکھا ہے کس نے شیر اور روباہ کو
ہے دعا ناسخ بھلا دے یاد سے مجھ کو صنم
یاد کرتا ہوں اگر بھولے سے بھی اللہ کو

۲۰۴

اس شعلہ رو سے عشق ہے چشمِ پُر آب کو
بجلی سے رابطہ ہو نہ[1] کیونکر سحاب کو
کرتے تھے فاش نشے میں بدمست سرِ غیب
اس واسطے حرام کیا ہے شراب کو
ساقی تمام خشک و ترِ کائنات میں
ہم نے کیا پسند شراب و کباب کو
ہر صاحبِ خزانہ کو ہے اوج ہی زوال
ٹپکے نہ کیوں اچھال کے فوارہ آب کو
جز داغِ عشق چارۂ تر دامنی نہیں
کرتی ہے خشک گرمیٔ خورشید آب کو

---

[1] صدفانی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع یوسفی : "بجلی سے رابطہ نہ ہو"۔

ہم صورتوں سے عیب ہے کرنا سوال کا
زلفوں سے مانگی ہے کمر پیچ و تاب کو

درکار ہے پلنگ کے بدلے جنازہ آج
فرقت میں ہم نے مرگ سے بدلا ہے خواب کو

محروم میری آنکھیں ہوں پائے فرس سے بھی
بوس و کنار پائے حنائی رکاب کو

اس شعلہ رو کو ربط ہو مجھ ناتواں سے کیا
پروا نہیں کمان کی تیرِ شہاب کو

ساقی جہانِ دل کی اسی سے ہے روشنی
کیونکر نہ آفتاب کہیں ہم شراب کو

ہے مشتعل جو فرقتِ ساقی میں ہر نفس
منہ سے لگا کے جام جلا دوں شراب کو

طالع شبِ وصال میں ہو کیوں نہ شام سے
شوق اس کی دید کا ہے کمال آفتاب کو

جب سے کیا ہے قتل دُرِ گوشِ یار نے
ہم آبِ تیغ کہتے ہیں موتی کی آب کو

اے عندلیب ہیں ترے گل ہائے باغ کیا
مرجھائے میری آہ گلِ آفتاب کو

نکلیں گے طفلِ اشک نہ باہر کہ ضبط نے
گرداب کر دیا مری چشمِ پُر آب کو

آنکھیں تمام صورتِ کاغذ ہوئیں سفید
مدت سے ہم ترستے ہیں قاصد جواب کو

بحرِ جہاں میں تیری عدالت ہے اس قدر
ہر موجِ میلِ سرمہ ہے چشمِ حباب کو

صدمے اٹھانے والے ہیں روزِ فراق کے

کیا لائیں ہم شمار میں روزِ حساب کو

چھوتا ہے چھاتیاں عبث اُس بحرِ حسن کی

ناسخ ستم ہے ہاتھ لگانا حباب کو

۲۰۵

دی آگ اُس نے پرتوِ رخ سے شراب کو

شرمندہ جامِ مے سے کیا آفتاب کو

بد جانتا ہے جہل سے زاہد شراب کو

دیکھا ہے شپرہ[1] نے کہاں آفتاب کو

بھولوں وصالِ یار میں کیا اضطراب کو

دریا میں ہے قرار کہاں موجِ آب کو

ابرو جدھر کو ہل گئے بجلی سی گر پڑی

رکھتا ہے وہ کماں میں تیرِ شہاب کو

کیا بال کر دیے ہیں غمِ ہجر نے سفید

پالیں شبِ وصال ہم اپنے شباب کو

حاجت نہیں نماز کی ہستی[2] میں زاہدا

کیا مرتبہ دیا ہے خدا نے شراب کو

گلشن[3] میں گر وہ ساقیٔ میکش کرے لگاہ

بوئے شراب آنے جو سونگھیں گلاب کو

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی: ''دیکھا ہے شپرے نے کہاں''۔

۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی: ''مستی میں زاہدا''۔

۳۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی: ''گلشن میں گر وہ'' ۔

اُس چشمِ مست کے ہوں تصور میں بادہ کش
کیونکر کروں گزک نہ ہرن کے کباب کو

جامِ شراب پیتے ہی چمکا ہے حسنِ یار
نور آفتاب سے ہے[۱] ملا ماہتاب کو

ساحل کے واسطے ترے ابرو کے عکس سے
تلوار کی ملی ہے بُرش موجِ آب کو

اس دل کے ہاتھوں چین سے گزرا نہ ایک دن
پیری میں یاد کیا کروں عہدِ شباب کو

محشر کے روز دامنِ تر کام آئے گا
رکھتا ہے آفتاب کی خاطر سحاب کو

مٹتا ہے دم میں صفحۂ عالم سے نام بھی
کھدوا رہے ہو قبر[۲] میں تم کیا خطاب کو

بھرتے ہی جام سے ہوئی صبحِ شبِ وصال
گردوں نے آفتاب بنایا شراب کو

ابھی[۳] شبِ وصال ہوئی صبح شام سے
قسمت نے آفتاب کیا ماہتاب کو

دیکھے نہ یار جلوۂ صبحِ شبِ وصال
کر اے سحاب چشم نہاں آفتاب کو

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہندی :
"نور آفتاب سے یہ ملا ماہتاب کو"

۲- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہندی :
"کھدوا رہے ہو مُہر میں تم کیا خطاب کو"!

۳- مصطفائی طبع دوم ۔ نسخۂ مطبع ہندی : "آئی شبِ وصال" نہ

ناسخ[1] نہیں ہے کام مجھے زید و عمرو سے
بس جانتا ہوں بعدِ نبی بوتراب کو

۲۰۶

گرم تم کتنا کرو اچھے ستمگر ناز کو
کب پہنچتا ہے ہمارے ہوش کی پرواز کو

ہوش اڑتے ہیں جو سنتا ہوں تری آواز کو
کیا ترے پردے سے نسبت پردہ‌ہائے ساز کو

میری چاہت سے کیا آگاہ اس طناز کو
ہے بجا سمجھوں دلیل[2] اپنا اگر غماز کو

نالے کر آتا ہوں ہر شب زیرِ دیوار اس لیے
بھول جائے تا نہ وہ کافر مری آواز کو

ہیں لگائے کان مثلِ روزنِ دیوار ہم
کب سنیں گے اس پری کے پاؤں کی آواز کو

کود کر ہوتے ہیں مردے بھی کاندھے پر سوار
جانتے ہیں ایک ہم انجام اور آغاز کو

امتیاز حق و باطل خود ستاؤں کو کہاں
کیوں نہ فرعون ایک سمجھے سحر اور اعجاز کو

ناتوانوں سے زبردستوں کے بازو ہیں
زور ہوتا ہے کبادے ہی سے تیر

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی :
”ناسخ نہیں ہے کام مجھے عمر و بکر سے“

۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی :
”ہے بجا سمجھوں وکیل اپنا اگر غماز“

جانور سے بھی مرا صیاد کرتا ہے حجاب
اس لیے رکھتا ہے اکثر بند چشمِ باز کو

بال اُس کافر کے بالوں پر نظر آتے نہیں
پر ہوئے طیّار میری روح کے پرواز کو

کرتے ہیں مشہور اُس محبوب کا مجھ کو عدو
میرے دشمن بھی نہاں رکھتے ہیں میرے راز کو

گل تو سب ہوتے ہیں سبزے سے مگر اے بلبلو
اُس گلِ عارض پہ دیکھو سبزے کے آغاز کو

رتبۂ تحقیق پاتا ہے کوئی تقلید سے
کیا خلیل اللہ سے نسبت ہے آتش باز کو

دل اگر ہوتا ہے نالاں میں سمجھتا ہوں غنا
سازِ عشرت جانتا ہوں طالعِ ناساز کو

ہے ترے روئے طلائی پر پسینہ مثلِ نگ
حسن کی صنعت دکھا اک دن مرصع ساز کو

کیا ضرر منکر ہوئے دو چار اگر خفاش طبع
جس نے دیکھا رجعتِ خورشید کے اعجاز کو

میری غزلوں کی چمن بندی جو دیکھے اک نظر
پھر نہ خوش آئے گلستاں بلبلِ شیراز کو

بلبلیں کیا ہیں جو وہ صیاد آئے باغ میں
بھول جائیں[۱] طائرِ رنگِ چمن پرواز کو

پھیر لایا جذبِ دل اُس شعلہ رو کو راہ سے
دیکھیں منکر رجعتِ خورشید کے اعجاز کو

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجیدی: "بھول جائے"۔

عالمِ سودا میں ہے ہم کو غنا شورِ جنوں
جانتے ہیں ساز ہم زنجیر کی آواز کو

جس نے اے ناسخ بساطِ ابر پر رکھا قدم
عرش کہتے ہیں اسی کے فرشِ پا انداز کو

۲۰۷

کیا مری آغوش سے وحشت ہے اس بے پیر کو
اس قدر وحشت نہیں ہوتی کماں سے تیر کو

کر پسینے سے طلائی لقرئی زنجیر کو
کالبد تیرا بنایا[1] گوندھ کر اکسیر کو

غش کیا موسیٰ نے جب دیکھا تری تنویر کو
آ گئی لکنت زباں میں سنتے ہی تقریر کو

کھیلنے میں لگ گئی مٹی جو اس کے جسم پر
کر دیا خاکِ مذلت رشک نے اکسیر کو

ہوں وہ گریاں، اشک کردیں گے مرقع کو خراب
کھینچنا بے چشم او مانی! مری تصویر کو

اس تمنا نے کیا دیوانہ مجھ کو اے پری
ڈال دے میرے گلے میں زلف کی زنجیر کو

ضبط میں کرتا نہیں، آتی ہے غیرت دوستو!
کیا بھلا منہ سے نکالوں آہِ بے تاثیر کو

گر موافق ہوتی ہے تقدیر مجھ سے زاہدا
ترک کرتا ہوں کسی تدبیر سے تدبیر کو

۱- مصطفائی طبع اول: "بناتے"

پھرا بشر کو، فلک کا چلاؤ نہ چلنو غافلو
ایک ہی صورت ملی ہے، خاک اور اکسیر کو

ہو گیا ہے اس قلمرو بے ہنر عالم میں ہنر
کیا عجب گر عیب سمجھیں جوہرِ شمشیر کو

کیوں لگے، ہم خاکساروں پر نہیں پڑتی کبھی
خاک تودہ سے صنم ہے کام ہردم تیر کو

حسن سے پر، عیب سے خالی ہیں آنکھیں یار کی
یہ وہ آہو ہیں، خجل کرتے ہیں آہو گیر کو

کس پری رو کے مسخر کرنے میں حیران ہوں
ہولہ آساں جانتا ہوں دیو کی تسخیر کو

کچھ نظر آیا نہ اس غفلت کدے میں غیرِ حسن
چاہیے یوسف ہمارے خواب کی تعبیر کو

یار کو پہنچاؤں اپنی ناتوانی کی خبر
مو قلم درکار ہے مکتوبہ کی تحریر کو

آتشِ رنگِ حنا سے کیا تعجب ہے اگر
شمع روشن دستِ جاناں میں کرے کلگیر کو

۲۰۸

دیکھ اپنے رونے آتش ناک کی تاثیر کو
تیرے نقشے نے جلایا کاغذِ تصویر کو

بعدِ ایامِ جوانی ہے یہی سے کا بھی حال
حکم ہے جو بعدِ ایامِ رضاعت شیر کو

۱۔ نسخۂ مطبع ہادی : "پھر بشر کو"

کیا بھلا نسبت ہے شمشیرِ نگاہِ یار سے
بیشتر دیکھا ہے گرتے برق کی شمشیر کو

دل لگی ہے رات دن تیرے تصور سے ہمیں
دیکھتے ہیں ہر کالۂ دل میں گڑی تصویر کو

راست بازوں کو نہ کج طبعوں سے کیونکر ہو گریز
رابطہ دم بھر نہیں رہتا کماں سے تیر کو

ہاتھ زلفوں کو لگاؤں ، یہ کہاں میری مجال
چھو نہیں سکتا ترے دروازے کی زنجیر کو

کیا ستم صبحِ شبِ وصل اس موذن نے کیا
ہو گیا بسمل میں سن کر پہلی ہی تکبیر کو

کیا میں اس وحشت سرا میں ناتواں دیوانہ ہوں
چیونٹیاں لے جائیں میرے دامنِ [1] زنجیر کو

میکشو ! خوب آج سوالی لگانی چاہیے
محتسب آیا تو ہے دُرّہ لیے تعزیر کو

رات دن اے وحشیو ہوتا رہا کرتا ہے غل
خانۂ آباد کہیے خانۂ زنجیر کو

نقشِ شیریں سنگ سے مثلِ شرر بھاگے ابھی
بے ستوں میں ہم لگاویں گر تری تصویر کو

جس کو غمگیں دیکھتے ہیں اس کے ہوتے ہیں شریک
نالے ہم کرتے ہیں سن کر نالۂ زنجیر کو

حکمتِ حق ہے طبائع کی کجی اور راستی
گر کماں پیدا نہ ہو ، کس طرح پھینکے تیر کو

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہلالی طبع ۱۲۵۸ھ :۔ "میرے
نالۂ زنجیر کو" ۔

حلقہ ہائے زلفِ جاناں سے ، جو کی ہے ہمسری
شمع روشن چاہیے ، ہر خانۂ زنجیر کو
آتی ہے آواز زنجیرِ درِ دلدار کی
گر ہلاتا ہوں میں اپنے پاؤں کی زنجیر کو
جس قدر دولت ہے صحبت سے ہے اتنا اجتناب
روئے انساں سے ہے وحشت صاحبِ اکسیر کو
ہیں جو عالی منزلت اُن کو نہیں تزئیں سے کام
کس نے دیکھا ہے منقش کعبے کی تعمیر کو
آسماں پر اِن دنوں رہنے لگا تیرا دماغ
چاہیے رنگِ شفق ظالم تری تصویر کو
بندھ گئے مضموں صفائی عارضِ جاناں کے آج
اب سیاہی کیا سفیدی چاہیے تحریر کو
شام سے تا صبح فرقت میں نہیں مجھ کو قرار
میں گواہ اک[1] طفل رکھتا ہوں جوان و پیر کو
کچھ کماںداری میں اے قاتل نہ کی تو نے خطا
لاغر ایسا ہوں ، نہیں ملتا نشانہ تیر کو
ڈھونڈھتا پھرتا ہے مانی بال اب تلوار کا
مو قلم کیا چاہیے قاتل تری تصویر کو
ناوکِ مژگانِ برگشتہ سے کی تھی ہمسری
کیوں نہ سن کر تیر گر سیدھا بنائیں تیر کو
کھینچتے ہیں جذبۂ شوقِ شہادت سے ہم آج
میان میں کیا چین ہو قاتل تری شمشیر کو

1ـ مصطفائی طبع اول و دوم ـ نسخۂ مطبع ہندی :
"میں گواہ اے طفل رکھتا ہوں"

عشق[۲] رہیں بستی جوانوں سے نہ ہوگی پیر کو
مے کی کیفیت کہاں کو جوش آئے شیر کو

جمع کیا کرتے ہو معماروں کو تم اے غافلو
قبر پر جا بیٹھتے ہیں چھوڑ کر تعمیر کو

ہے شبِ فرقت کی تاریکی میں یہی[۲] تو کیا عجب
ہو اگر مشعل کی حاجت نالۂ شبگیر کو

کون اُس وادی میں ہو اہلِ فنا کا سدِ راہ
کیا تعلق ہے کفن سے خارِ دامن گیر کو

تیرے روئے آتشیں کا وصف کرنے کے لیے
شمع کو درکار ہے منہ اور زباں گلگیر کو

جو کرے احسان اُس کو چاہیے افتادگی
پیشِ پائے شمع دیکھا ہے سرِ گلگیر کو

شعلۂ داغِ جنوں سے میں اگر روشن کروں
مثلِ پروانہ جلا دوں شمع سے گلگیر کو

بزمِ عالم میں ہے روشن چیز اپنی چیز ہے
کیا ہو گویائی زبانِ شمع سے گلگیر کو

خط کترتا ہے ترا اے شمع رو حجام آج
کیوں نہ سمجھوں ایک اب مقراض اور گلگیر کو

ہوتے ہیں عاشق کڑے عالم میں اور معشوق نرم
شمع نے پایا ہے موم، آہن ملا گلگیر کو

۱- یہ شعر نول کشور کے ایڈیشن ۱۸۷۲ء میں موجود نہیں ہے۔

۲- مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع محمدی:
"ہے شبِ فرقت کی تاریکی یہی تو کیا عجب"

واقعی ناسخ عبادت ہے جو دیدارِ علیؑ
دیکھ لیتے ہیں ملائک ہر سحر تصویر کو

۲۰۹

بھولے نہ بعدِ مرگ بھی ہم رقصِ یار کو
ٹھوکر کی آرزو ہے ہمارے مزار کو

جانے دیا نہ باغ میں اس گل عذار کو
روکا ہے باغباں نے نسیمِ بہار کو

زیبا ہے عشقِ زلفِ دلا مال دار کو
الفت بہت خزانے سے ہوتی[1] ہے مار کو

دامن سے ارتباط مبارک ہو خار کو
عریانی ہے پسند مرے جسمِ زار کو

اے ابر! تو نہ کیجیو میرے غبار کو
پہنچا سکے گی پھر نہ ہوا کوئے یار کو

کہیو صبا! جو پائے تو اس شہسوار کو
روندا کبھی نہ آ کے ہمارے غبار کو

پتے ارنڈ کے چھوئیں دستِ نگار کو
کیونکر لگے نہ آتشِ حسرت چنار کو

اس شمع رو کو کیا ہے مرے مرنے کی خوشی
ہنستا ہی دیکھتا ہوں چراغِ مزار کو

تنکا سمجھ کے دور کرے بزمِ یار سے
فراش دیکھ لے جو مرے جسمِ زار کو

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخہ مطبع مجتبائی:-
"الفت بہت خزانے سے ہوتی ہے مار کو"

کرتا ہے قتل بھلسوں کو نہ زیبا ہے گو کبھی
شمشیر آب دار ترے آب دار کو
نشتر لگائے اشک رگِ ابرِ تر میں آج
دکھلا دوں جی میں ہے مژۂ اشک بار کو
لے لے گئی ہے پنبۂ مینائے سے ہوا
نسبت ہے کیا نجار سے ابرِ بہار کو
کاوش[1] دلوں سے اس کو ہے تلوّن سے ہے اسے
تشبیہ دوں نہ میں تری مژگاں سے خار کو
پینا ہے جانے دے مجھے اب خونِ محتسب
شیشے کو توڑے وہ تو میں توڑوں خمار کو
دوڑے جلو میں ہو کے پیادہ برنگِ گرد
دیکھے گلِ سوار، جو بس اُس سوار کو
موجود انتقام کو ہے سنگِ محتسب
ترسا نہ مے فروش کسی بادہ خوار کو
گذرے ہزار سال، نہیں ہے نشانِ صبح
کیا طول ہو گیا ہے شبِ انتظار کو
شمشاد و سرو میں یہ خوش آوازیاں کہاں
طوطی کہوں میں قامتِ موزونِ یار کو
کیا جذبِ عشق ہے کہ ہوا جس طرف کی ہو
سیدھا چلے غبار مرا کوئے یار کو
دل کیا ہیں میری آہ کی تاثیر کے حضور
پتھر میں کردے قطرۂ خوں ہر شرار کو

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع ہدی طبع ۱۲۵۸ھ:
"کاوش دلوں کو اس کو ہے تلوّن سے ہے اُسے

فرقت میں ہے بسے دیکھو چکے ہے شہر دل
کیا لائیں ہم شمار میں روزِ شمار کو

ہے اس قدر عروج سے لفرقت کہ بعدِ مرگ
صرصر اڑائے گی نہ ہمارے غبار کو

کیونکر نہ لائے طالبِ دنیا کو دام میں
زاہد ہے عنکبوت مگس کے شکار کو

لامسخ کی التجا ہے کہ یا مرتضیٰ علیؑ
کھینچو برائے قتلِ علو ذوالفقار کو

ردیف ہائے ہوز

۲۱۰

ہیں اشک مری آنکھوں میں قلزم سے زیادہ
ہیں داغ مرے سینے میں انجم سے زیادہ

سو رمز کی کرتا ہے اشارے میں وہ باتیں
ہے لطف خموشی میں تکلّم سے زیادہ

جز صبر دلا چارہ نہیں عشقِ بتاں میں
کرتے ہیں یہ ظلم اور تظلّم سے زیادہ

مے خانے میں سو مرتبہ میں مر کے جیا ہوں
ہے قلقلِ مینا مجھے تم قم سے زیادہ

بھر جائے اگر بادہ منہا منہ نہ کروں میں
میخواری میں ہے ظرف مرا خم سے زیادہ

ہر نہرِ چمن ہجر میں اژدر سے ہے افزوں
ہر گل ہے مری جان کو کژدم سے زیادہ

سو رقص سے افزوں ہے پری رو تری رفتار
پاؤں کی صدا لاکھ ترنم سے زیادہ

تکلیفِ تنگئ سے چھٹ گیا عشق نے آزاد
موئے سرِ شوریدہ ہیں قائم سے زیادہ

معشوقوں سے امیدِ وفا رکھتے ہو ناسخ
ناداں کوئی دنیا میں نہیں تم سے زیادہ

۲۱۱

آئنے میں زلف ، زلفِ پُرشکن میں آئنہ
یہ حلب میں مشک ہے ، وہ ہے ختن میں آئنہ

بزم میں رونا جو میں سمجھا وہ اپنے حُسن کو
آبجو نے گل کو دکھلایا چمن میں آئنہ

خاک ہو کر صورتِ اصلی کو بھی وہ دیکھتا
رکھ دیا ہوتا سکندر کے کفن میں آئنہ

ہنسنے میں کھلتے ہیں جس دم صاف پڑ جاتا ہے عکس
اے پری ہر دانت ہے گویا چمن میں آئنہ

یا الٰہی وہ صنم محوِ خود آرائی رہے
جب تلک خورشید ہے دیرِ کہن میں آئنہ

ہیں جو قانع ، خانہ ویرانی میں بے ساماں نہیں
ہے ہر اک روزن مرے بیت الحزن میں آئنہ

جیسے آتا ہے نظر سب کا بدن آئینے میں
صاف آتا ہے نظر اس کے بدن میں آئنہ

باعثِ حسرت[1] اگر پوچھے ترا اعجازِ حسن
صورتِ طوطی ابھی آئے سخن میں آئنہ

۱- مصطفائی اول و دوم ، نسخۂ مطبع مہدی :
"باعثِ حیرت اگر پوچھے ترا اعجازِ حسن"

وصل میں بے تاب ہو کر دل نکل آیا جدا
ہو گیا وارد عجب دولہا دلہن میں آئنہ

سن کے سرخی لعل جاناں کی یہ رنگت اڑ گئی
پر عقیق سرخ ہے ملک یمن میں آئنہ

عکس ہے اپنا ہی ہر شے دور ہو کر زنگ شرک
چاہیے ہر بت ہو چشم برہمن میں آئنہ

کر دیا ہے عکس اقدس نے سکندر سے زیادہ
جب گیا ہے خلوت شاہ زمن میں آئنہ

قتل عالم کو کرے کا حسن اپنا دیکھ کر
ہے بجائے تیغ ، دست تیغ زن میں آئنہ

اس قدر دیکھی نہیں ہم نے صفائی حسن کی
ہے بدن کے بدلے اس کو پیرہن میں آئنہ

رخ صاف اپنا دکھا دیتا مرا یوسف اگر
ڈوب مرتا شرم سے چاہ ذقن میں آئنہ

کر دیا حیراں یہ تیرے رقص نے اے رشک گل
ہو گیا طاؤس کا ہر پر چمن میں آئنہ

اس قدر ہے تیرگی اک دم میں ہو جائے توا
کوئی گر لائے مرے بیت الحزن میں آئنہ

چشمۂ شب اور ہے یہ چشمۂ خورشید حسن
ہو توے کی جا ترے چاہ ذقن میں آئنہ

جو صفائی میرے سیم اندام میں ہے سو کہاں
کیوں عبث قلعی چڑھاتا ہے بدن میں آئنہ

ہیں وہی آزاد ناسخ ، ہے لہ گھر جن کا نہ در
جو کھٹا لگتے ہی بندھتا ہے رسن میں آئنہ

ردیف یاے تحتانی

۲۱۲

دیدۂ اہلِ صفا ہوئے روشن تری تصویر سے
گوشِ گوہر کانِ جواہر بن گئے تقریر سے

پیر نے مجھ کو لڑایا ہر جوانِ نو پیر سے
ہوں تنِ تنہا مقابل سو کمان و تیر سے

گھر مرا شورِ جنوں سے اس قدر معمور ہے
خود بخود برپا ہے غل دروازے کی زنجیر سے

پیر جا پہنچے عدم کو، رہ گئے پیچھے جواں
ہیں کمانیں راہ چلنے میں زیادہ تیر سے

کیوں نہ داغِ عشق سے ہو دور خامی طبع کی
پختہ ہوتے ہیں ثمر خورشید کی تاثیر سے

ہے یہ پاسِ بختِ خوابیدہ کہ زلفوں کی طرح
غل کبھی برپا نہیں ہوتا مری زنجیر سے

خانۂ دنیا دلا گویا کمانِ خانہ[1] ہے
ہو گیا جن کا گزر اس میں گئے وہ تیر سے

زلف سے ہے اے پری رو حسن تیرا جس طرح
بس یونہی زینت ہے ہم دیوانوں کی زنجیر سے

اہلِ غفلت جو کہ ہیں دنیا میں نابینا وہ ہیں
بند ہو جاتی ہیں آنکھیں خوابِ بد کی تاثیر سے

رہ گئی مثلِ کماں آغوشِ وا حسرت میں یاں
عید کو دکھلائی دیتے ہیں وہ بھاگے تیر سے

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع یوسفی:
"خانۂ دنیا دلا گویا کماں کا خانہ ہے"

زلف و رخسارِ صنم پر ہو گیا سودا مجھے
گل کھلے ہیں عشق پیچاں کی طرح زنجیر سے

ابرِ غم میں گھر گیا میں تیری زلفیں دیکھ کر
بجلیاں گرتی ہیں مجھ پر سونے کی زنجیر سے

خشک ہونے پر بھی فارغ خامہ قدرت نہیں
سادہ لوحوں کے خطِ رخسار کی تحریر سے

ہو دلا مضطر نہ اتنا کیا ہے وہ رعنا غزال
شیر کو لاتے ہیں قابو میں بشر تدبیر سے

کیوں نہ ہو تیرا تصور قلبِ ناسخ میں مدام
مرتبہ ہے عرش سے[1] اعلٰی تری تصویر سے

۲۱۳

کیا عجب سودائے زلفِ یار کی تاثیر سے
سنبلستاں ہو جو پیدا دانۂ انجیر سے

ہستیٔ عاشق ہے تیرے حسن کی تاثیر سے
ذرے پیدا ہوتے ہیں خورشید کی تنویر سے

بختِ بد نے موردِ نفرت کیا ایسا مجھے
ہو گیا چیں بر جبیں کاغذ مری تصویر سے

پائے قاصد پھرتے پھرتے گھس گئے مثلِ قدم[2]
خط وہ لیتا ہی نہیں، کیا فائدہ تحریر سے

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی :
"مرتبہ ہے عرش کا اعلٰی تری تصویر سے"
۲۔ مصطفائی طبع اولؔ و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی : "مثلِ قلم" ۔

ہو خطِ مشکیں سے دونا کیوں نہ حسنِ روئے یار
قدر صفحے کی زیادہ ہوتی ہے تحریر سے

سارے عالم کو ہے کیا بے اختیارانہ رجوع
خاکِ گورستاں نہیں کم سرمۂ تسخیر سے

عاریت جو شے ہے حاجت اس سے بر آتی نہیں
پر تو ہیں پر کب اڑا جاتا ہے از خود تیر سے

خط جو نکلا ہے ترے منہ پر پڑی ہے میری آہ
سبز مزرع ہو گیا ہے برق کی تاثیر سے

ہوں میں ایسا پست طالع ہو نہ صرصر سے بلند
کاغذِ بادی بنائیں گر مری تصویر سے

آئینہ خانہ ہے عالم عکس افگن ہے وہی
ہے فروغِ مہر و ذرات ایک ہی تنویر سے

خط نکل آیا وہاں، باقی یہاں مضمونِ شوق
دیکھیے کب ہو فراغت نامے کی تحریر سے

ہو نہ برہم گر تری زلفوں میں غل کرتے ہیں دل
کس طرح نالے نہ نکلیں اے پری زنجیر سے

اپنی صورت دیکھ کر وہ آپ دیوانہ ہوا
آئینہ شاید بنا ہے آہنِ زنجیر سے

فندقوں سے گوری گوری انگلیاں ہیں مثلِ شمع
ہے بجا تمثیل ناخن گیر کو گلگیر سے

وہ تو ہے تیرے لیے ناسخ یہ اوروں کے لیے
قبر کی تعمیر کرنا، قصر کی تعمیر سے

جل اٹھا باغ اس کی برقِ حسن کی تاثیر سے
پھول اب گلچیں اٹھاتے ہیں تو آتش گیر سے

چھوٹتا ہے کب لہو میرا کسی تدبیر سے
تیغِ جوہر دار قاتل ہے سوا زنجیر سے

مست ہے عالم مرے اشعار کی تاثیر سے
مثلِ مینا مے ٹپکتی ہے مری تقریر سے

فاش ہو باغِ جہاں میں رازِ دل ممکن نہیں
سیکھے ہیں طرزِ فغاں ہم بلبلِ تصویر سے

گر شبیہ اس گل کی رکھ دیں تو مرقع ہو ابھی
عرصۂ محشر فغانِ بلبلِ تصویر سے

بندھ سکے مضموں نہ میری وحشتِ پُر زور کا
مثلِ سودائی کوئی باندھے اگر زنجیر سے

رزق کا کیا غم کہ ہوتا ہے تولّد بعدِ طفل
پہلے بھرتا ہے خدا پستانِ مادر شیر سے

شمع ہے وصفِ رخِ پُر نور لکھنے میں قلم
ہے بجا نسبت جو دوں قط گیر کو گلگیر سے

بے گنہ ایذا نہ دے ہم کو صنم بہرِ خدا
امن ہے سودائیوں کو جرم کی تعزیر سے

تھا تو جاں بخشی میں عیسیٰ پر ہوا موسیٰ کا شک
آشکارا جب ہوئی لکنت مری[1] تقریر سے

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع جعفری : ''لری تقریر سے'' ۔

سرو قد اس نوجواں کا بس ہے مجھ آزاد کو
شجرۂ ملعونہ مالگوں زاہدا کس پیر سے

بعد مردن بھی تصور ہے کسی شب گرد کا
حشر برپا ہے عدم میں نالۂ شبگیر سے

نرم کرتے دل ترا گر عشق کھو دیتا نہ عقل
کرتے ہیں پتھر کو پانی شیشہ گر تدبیر سے

زر تصدق کرتے ہیں جو اغنیا تل بیٹھ کر
کالبد ان کے بناتے[1] ہیں مگر اکسیر سے

مے پرستو! آؤ کر لیں محتسب کو سنگسار
بچ رہے ہیں سنگ کچھ میخانے کی تعمیر سے

موجِ خوں بھی مثلِ برقِ ابر ہے دامن کے ساتھ
جا سکا قاتل نہ میرے خونِ دامن گیر سے

ہے نکوکاری عبث اے بانیٔ بنیادِ ظلم
فائدہ حجاج کو کیا کعبے کی تعمیر سے

ہے ریاضِ فکرِ ناسخ کی جو شادابی یہی
لکھنؤ میں آئے کی روحِ غنی کشمیر سے

۲۱۵

پھری رو دیر سے اس سوچ میں سارا زمانا ہے
خطِ رخ میں ہیں دالت یا زلفوں میں شانا ہے

بگڑتے جاتے ہیں لاکھوں ہزاروں بنتے جاتے ہیں
جہاں میں رات دن جاری خدا کا کارخانا ہے

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع بھتی:
"کالبد ان کے بناتے ہیں مگر اکسیر سے"

نہ دو تشبیہ تیغِ ابروئے خمدارِ جاناں کو
کہ ماہِ نو تو اک اترا ہوا اوتا پرانا ہے

چراغ و شمع کیا، لا جام و مینائے مئے گلگوں
مری تربت پہ ساقی ابر رحمت شامیانا ہے

ہوا سائل جو آکر جان سے مارا وہیں اس کو
مگر بندوق کے[1] پاس اہلِ دولت کا خزانا ہے

ہوا ہوں زرد، رنجِ ہجر سے میں ناتواں ایسا
کہ شاخِ زعفراں میں مرغِ جاں کا آشیانا ہے

کہیں ہے فوق بلبل شاخِ گل پر دستِ جاناں کو
کہ اس میں طائرِ رنگِ حنا کا آشیانا ہے

مہیا بزمِ مے میں ساقیا سب سازِ عشرت ہیں
کہ دورِ جام رقص اور قلقلِ مینا ترانا ہے

کوئی دل گر نہ ہو دو دن مکدر تو غنیمت ہے
ہوا کو ایک دن آخر غبار اپنا اڑانا ہے

حقارت سے نظر کرتے ہو کیا چاکِ گریباں پر
نہ سمجھو مفلسی ہم عشق بازوں کا یہ بانا ہے

بچھا دے توڑ کر شیشوں کو ساقی میرے بستر پر
شبِ فرقت ہے، مجھ کو بے کلی سے تلملانا ہے

فلک[2] کی تاک بندی ہے یہ گل خیزی زمیں کی ہے
بہارِ گلشنِ ایجاد کو اک روز جانا ہے

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع بھدی:
"مگر بندوق کا پاس اہلِ دولت کے خزانا ہے"
۲- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع بھدی:
"فلک کی تاک بندی ہے نہ گل خیزی زمیں کی ہے"

جہاں تارِ نفس ٹوٹا گیا میدانِ ہستی سے
دہانِ توسنِ عمرِ رواں کا یہ دہانا ہے
ترا قمچی دکھانا اے معلّم طفلِ بدخو کو
ہمارے توسنِ عمرِ رواں کو تازیانا ہے
پری رو رشک کی جا ہے ملے گا جا کے حوروں سے
کوئی دم میں ترا ناسخ سوئے جنت روانا ہے

٢١٦

ہمیشہ زیرِ بارِ اپنی محبت میں زمانا ہے
اٹھاتے ہیں جو رنج اک دن انھیں لاشہ اٹھانا ہے
دکھا دیتا ہے کافورِ سحر روز آسماں سب کو
ولیکن غافل اپنے غسلِ میّت سے زمانا ہے
میں وہ ہوں مردۂ بیکس کہ میری قبر کے اوپر
بنی ہے برق جھالر، ابرِ رحمت شامیانا ہے
نہ ہوگا مزرعِ اعمالِ زاہد باروَر ہرگز
کہ سرسبزی سے ہے محروم سبحہ کا جو دانا ہے
خطِ عارض یہ رہتی ہے نظر آئینے میں اس کی
مقرّر آہوانِ چشم کو سبزہ چرانا ہے
جو مالک گنجِ زر کا ہو بجا[1] ہے سرکشی اس کو
کہ فوارے کو دیکھو پاس پانی کا خزانا ہے
چھپایا ہے جو منہ پردے میں تو نے اے پری ہم سے
کفن میں ہم کو اب سارے جہاں سے منہ چھپانا ہے

١۔ مصطفائی طبع اول و دوم، نسخۂ مطبع محمدی: ''بجا ہے سرکشی اس کی''۔

ہزاروں قاتلِ عاشق رگڑتے ہیں جبیں آ کر
برائے تیغِ ابرو سنگ تیرا آستانا ہے

ہزاروں مرغِ آتش خوار اے جرّاح آتے ہیں
تجھے بھایا جو میرے داغِ سوزاں سے چھڑانا ہے

جدا ہوتا نہیں زیرِ زمیں بھی جو مرے سر سے
زرِ داغِ جنوں شاید کہ قاروں کا خزانا ہے

تصوّر روز رہتا ہے عذارِ صافِ جاناں کا
ہمارا خانۂ دل اب تو آئینے کا خانا ہے

ہوا ثابت جو دیکھا اژدہا و گنج کو باہم
جو موذی ہیں ہمیشہ اُن کے قبضے میں خزانا ہے

غبارِ راہ ہم سمجھیں نہ کیونکر جسمِ خاکی کو
رگِ جاں توسنِ عمرِ رواں کو تازیانا ہے

نہ کیوں غائب رہوں چشمِ جہاں سے ان دنوں ناسخ
مجھے اُس کی کمر کا غیب سے مضموں چرانا ہے

۲۱۷

اجل سر پر کھڑی ہے خوابِ غفلت میں زمانا ہے
چھپر کھٹ کے عوض لازم جنازے کا بنانا ہے

غبارِ ہستیٔ عاشق جو آج اُس کو اُڑانا ہے
سمندِ ناز کو گردن کا ڈورا تازیانا ہے

بعذلِ آتشیں پھر بادکش کا اک بہانا ہے
کہ منظور اُس کو اپنے سبزۂ خط کا جلانا ہے

لب گل رنگ پر مستی لگانے کا بہانا ہے
اسی برگِ گل و لالہ کو نافرماں بنانا ہے

نکلتا ہے جو ہر گل زر بکف گل زارِ عالم میں
خدا جانے زمیں میں دفن یہ کس کا خزانا ہے

نہ دے اے جوش بدمستی بہت ترغیب گستاخی
خجالت یار سے ہوگی کبھی تو ہوش آنا ہے

اشارہ آمد و رفتِ نفس کا ہے یہی ہر دم
بدن میں دم جو آیا ہے مقرر اس کو جانا ہے

رکھا ہے ہاتھ شفقت کا کب اس نے میرے سینے پر
اسے اب آتشِ رنگِ حنا سے دل جلانا ہے

کمی ہوتی نہیں نقدِ سخن کی یاں کبھی ناسخ
ازل سے اپنے قابو میں معانی کا خزانا ہے

۴۱۸

یہ آدمی ہے کہ پرسوں جمال رہتا ہے
وگرنہ ماہ کو اک شب کمال رہتا ہے

یہ پھنک رہا ہے مرا جسم آتشِ غم سے
کہ طوق بھی مری گردن میں لال رہتا ہے

کبھی نہ آئنہ دیکھا ہے خود آرائی
یہ بے مثالی کا اس کو خیال رہتا ہے

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع بھدی - "وہی برگِ گل و لالہ"۔

ہوا ہوں خال رخِ یار دیکھ کر حیراں
سیاہ آگ میں کیونکر زگال[۱] رہتا ہے

ہے فیض، خاک نشینوں سے سربلندوں کو
کہ سبز پانی ہی سے ہر نہال رہتا ہے

یہ رنگ سینہ خراشی میں اب ہے ناخن کا
کہ جیسے سرخ شفق میں ہلال رہتا ہے

نہ ترک صحبتِ احباب کیجیو ناسخ
گرا جو برگِ شجر، پائمال رہتا ہے

۲۱۹

بھرے ہیں جام مے لبریز شبنم ساغرِ گل ہے
اُدھر ہے نغمۂ بلبل، اِدھر شیشے کی قلقل ہے

دلِ پُر داغ کی ہے بے قراری ظاہر اشکوں سے
عیاں خورشید کا جس طرح پانی میں تزلزل ہے

کمر ہی اُس صنم کی گو نظر آتی نہیں ہم کو
خدا غائب ہے لیکن اُس کی ہستی بے تامّل ہے

اُفق سے تا اُفق بس ایک ہی سطحہ ہے پانی کا
ہمارے اشک کا دریا ہے عالم آسماں پل ہے

کوئی نالاں ہے، کوئی داغ ہے تجھ بِن گلستاں کا
جو بلبل تھی وہ گل ہے اور جو گل تھا وہ بلبل ہے

لٹکتی ہیں جو سر سے پاؤں تک دونوں طرف زلفیں
قدِ نازک ترا لامِ خدا اک شاخِ سنبل ہے

۱۔ نسخۂ مطبع ہمدی: "زگال رہتا ہے"۔ زگال=زغال: سیاہ کوئلا آگ کا جو روشن نہ ہو۔ (نور اللغات، جلد سوم، ص ۱۳۰)۔

ترا کوچہ بھی کب اے رشکِ گل کم ہے گلستاں سے
وہاں ہے بلبلوں کا غل، یہاں زنجیر کا غل ہے

رہوں کیونکر نہ اس کے گرد میں مانندِ پروانہ
کہ منہ ہے شمع کا شعلہ تو دودِ شمع کاکل ہے

لگا دی آگ کس آتش کے پرکالے نے گلشن میں
کہ ہر گل شاخ میں گویا ہمارے ہاتھ کا گل ہے

ہوئی تقلید سے کب قدرِ عالی پست، فطرت کی
چمن میں گل ہے سرپر اور کسی جا کفش کا گل ہے

نسیمِ باغ ہے دودِ چراغاں بے دماغی میں
تری فرقت میں ہر گل مجھ کو گویا شمع کا گل ہے

جلا ایسا چمن رشکِ بہارِ روئے جاناں سے
بنیں گلبن کی شاخیں شمع، ہر گل شمع کا گل ہے

حُدی خواں ہیں جلو میں ناقۂ لیلیٰ کے تو للسیغ
ہجومِ کودکاں گلیوں میں مجنوں کا تجمّل ہے

۲۲۰

پنجۂ[1] کلگوں چمن کو اب دکھایا چاہیے
رشک سے مہندی کی ٹٹی کو جلایا چاہیے

ٹھوکر اک پائے حنائی سے لگایا چاہیے[2]
پھول کوئی میری تربت پر چڑھایا چاہیے

۱- یہ شعر مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجیدی میں موخر ہے۔

۲- نسخۂ مطبع مجیدی :

''ٹھوکر اک پائے حنائی سے لگا کر گل رکھو''

باغ میں لے کر گل کو لے جا کر ہنسانا ہے ضرور[1]
کھیتیوں میں عندلیبوں کو اڑانا چاہیے

اشک کوئی چشمِ میگوں سے گرا کر نشے میں[2]
بادہ بھی میکش کی تربت پر چڑھانا چاہیے

چہرۂ جاناں ہے مصحف اور میں بیمار ہوں
وار کر اس پر سے لب[3] پانی پلانا چاہیے

دل کو خواہش ہے کہ طفلانِ حسیں گھیرے ہوں
آپ کو ان روزوں دیوانہ بنانا چاہیے

میرے نالے سن کے چڑھ آیا وہ ظالم بام پر
آسماں پر اب دماغ اپنا چڑھانا چاہیے

جس کے ہاتھ آیا خزانہ قصد رکھتا ہے یہی
مثلِ فوارہ جہاں میں سر اٹھانا چاہیے

داغِ شیفتہ زیست بھر، سوزِ جہنم بعدِ مرگ
ان بتوں کو کس توقع پر خدایا چاہیے

یار کی ٹیڑھی نگہ بھی لطف سے خالی نہیں
ہو اگر تلوار اصیل اس کو دبایا چاہیے

طالبِ زینت نہیں رنگینیٔ بے ساختہ
پنجۂ مرجاں کو کیا مہندی لگایا چاہیے

۱۔ مصطفائی اول و دوم:
"باغ میں اس گل کو لے جا کر ہنسانا چاہیے"

۲۔ مصطفائی اول و دوم:
"اشک کوئی چشم میگوں سے گرانا چاہیے"

۳۔ مصطفائی اول و دوم:
"وار کر اس پر سے پانی اب پلانا چاہیے"

محفلِ عشرت میں لاسخے یاد آیا جھ کو
شمع ساں ہنستے ہی میں یاروں کو رلایا ہے

۲۲۱

کون سا خورشید آج اپنا چراغِ خانہ ہے
بزم میں باہم ہجومِ ذرہ و پروانہ ہے

دل خیالِ چشمِ مستِ یار سے مے خانہ ہے
داغِ سودا جو نظر آتا ہے اک پیمانہ ہے

پاؤں میں کانٹے چبھے ہیں، پیرہن ہے چاک چاک
باغ میں جو گل ہے تیرے عشق میں دیوانہ ہے

میں نے ڈالا ہے جو ڈورا سوئے زلفینِ یار کا
مشک دانہ ہے مری تسبیح کا جو دانہ ہے

دم نہیں پاتے[۲] کسی میں تیری صورت دیکھ کر
بزمِ خوباں جوششِ حسرت[۳] سے اک بت خانہ ہے

رہتی ہیں[۴] محفل میں حائل درمیانِ فانوس شرم
روئے جاناں شمع ہے، اپنی نگہ پروانہ ہے

اس قدر ہوتا نہیں دستِ حنائی کا اثر
پنجۂ خورشید تیرے گیسوؤں کا شانہ ہے

۱۔ نسخۂ مطبع بھدی: "شمع ساں ہنستے ہیں"۔
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع بھدی:
"دم نہیں باقی کسی میں تیری صورت دیکھ کر"
۳۔ مصطفائی طبع اول و طبع دوم۔ نسخۂ مطبع بھدی: "حیرت سے اک بت خانہ ہے"۔
۴۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع بھدی: "رہتی ہے"۔

کر گئے وحشی نہ اس وحشت فزا سے کون کون
مثلِ مجنوں کل ہمارا حال بھی افسانہ ہے

وہ گلشن داغ ہائے یاس سے سینہ مرا
ہے مرہمِ زنگار جس میں سبزۂ بیگانہ ہے

آج کس شمعِ تجلّی کا تصور ہے مجھے
جو مژہ ہے میری آنکھوں میں پرِ پروانہ ہے

ہو گیا میخانے سے خالی اگر تو جان لے
ساقیا! لبریز اپنی عمر کا پیمانہ ہے

مول لیتا ہے برنگِ لالہ تیرا داغِ عشق
ہاتھ میں زر لے کے گل کہتا ہے یہ پیمانہ ہے

عازمِ گلگشت وہ غارت گرِ گلشن ہے کیا
آمد و رفتِ نسیمِ صبح بے تابانہ ہے

بعد مر جانے کے عاشق بھی نہیں رہتے ہیں پاس
کون بھی بالینِ شمعِ مردہ پر پروانہ ہے

اس زمیں میں ناسخ اب مستانہ پڑھیے چند شعر
ہے بغل میں شیشۂ مے، ہاتھ میں پیمانہ ہے

۲۲۲

باعثِ گریہ خیالِ نرگسِ مستانہ ہے
دل مرا میخانۂ مے ہے، چشمِ تر پیمانہ ہے

دل مرا فانوسِ شمعِ عارضِ جانانہ ہے
روح قالب میں نہیں ہے، بزم میں پروانہ ہے

نورِ رخسارِ صنم سے اور مژہ کے عکس سے
شانہ تھا سو آئنہ ہے، آئنہ سو شانہ ہے

کرتے ہیں محروم رحمت ہی عبادت کا شمار
سبز کیا باراں نے ہو تسبیح کا جو دانہ ہے

بال سلجھاتا ہے وہ دستِ حنائی سے جو آج
پنجۂ مژگانِ دلا آں گیسوؤں کا شانہ ہے

ہوش بدمستی میں رہتا ہے عبادت کا مجھے
منہ کے بل گرنا زمیں پر سجدۂ شکرانہ ہے

خندۂ دنداں نما خوش آئے کس محبوبہ کا
یاد اے قاتل تری تلوار کا دندانہ ہے

نام سرسبزی ہے جس کا بوستانِ دہر میں
اے نہالِ آرزو وہ سبزۂ بیگانہ ہے

مجھ کو حاجت ہے کبوتر کی نہ قاصد کی تلاش
بار میرا شمع ہے، نامہ مرا پروانہ ہے

جان دے کر جاؤں گا اندر میں جنت کی طرح
جان کا خواہاں جو دربانِ درِ جانانہ ہے

رخ اٹھا کر بھاگتا ہے پھر بھلا دیتا ہے شوق
شمع ہے تو اے ستمگر، دل مرا پروانہ ہے

رات دن ہے جو تصور گیسوئے شب رنگ کا
پنجۂ خورشید بھی اک آبنوسی شانہ ہے

آتشِ داغِ جدائی کے جو مضموں ہیں تمام
شمع ہے مکتوب، مرغِ نامہ بر پروانہ ہے

بیدِ مجنوں میری تربت پر ہوا، بویا جو تخم
استخواں سونگھا مرا جس سگ نے وہ دیوانہ ہے

جوشِ مستی میں پڑھوں پیرِ مغاں کے سامنے
اس زمیں میں مجھ کو یاد اور اک غزل مستانہ ہے

۲۲۳

اُن لبوں کی یاد میں داغِ دلِ دیوانہ ہے
آتشِ یاقوت سے روشن چراغِ خانہ ہے

پھر بہار آئی، کفِ ہر شاخ پر پیمانہ ہے
پھر روش میں جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے

ہر بگولے میں عیاں اک لغزشِ مستانہ ہے
گردشِ چشمِ غزالاں گردشِ پیمانہ ہے

ابر ہے صحنِ چمن ہے، ساقی[1] مستانہ ہے
ہر طرف کو خندۂ برق و گل و پیمانہ ہے

میرے یوسف کی خریداری عزیزو ہے محال
نقدِ جاں رہے اس کی قیمت، نقدِ دل بیعانہ ہے

کیا فقط مجھ کو غمِ دنیا سے آزادی ملی
چھٹ گیا تکلیف جینے[2] سے بھی جو دیوانہ ہے

ہر کسی نے کی فریبِ دوستی میں دشمنی
میری شمعِ قبر پر موجِ ہوا پروانہ ہے

ہے نشانِ[3] شمع روشن ہر چراغِ چشمِ غول
ہو چکا ہے بارہا آباد جو ویرانہ ہے

سرخوشی ممکن نہیں جب تک نہ چھلکے جامِ عمر
یہ خراباتِ جہاں بھی زور ہی میخانہ ہے

۱۔ مصطفائی طبع اول: ''ابر ہے صحنِ چمن ہے ساقیا مستانہ ہے'' (کذا)
۲۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع ہدی: ''چھٹ گیا تکلیف دینے سے بھی۔''
۳۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع ہدی: ''ہے نشان شمع روشن''۔

دیکھتے تھے کل جنھیں آنکھوں سے ہم اے غافلو
آج اُن کا اپنے کانوں کے لیے افسانہ ہے

محو ایسے خانۂ رنگیں میں مہماں ہو گئے
یہ نہیں ثابت کسی پر کون صاحب خانہ ہے

عقلِ عیشِ جہاں کا ہے دلا کیا اعتماد
نشۂ ہے خواب ، آوازِ غنا افسانہ ہے

نال گڑتا ہے کبھی اور لاش گڑتی[1] ہے کبھی
جو زچہ خانہ ہے ، وہ اک روز ماتم خانہ ہے

گورے کالے ہوتے ہیں یکرنگ مل کر خاک میں
سبز ہی ہوتا ہے جیسے خاک میں جو دانہ ہے

آج گوا ے مہ جبینو ! شغل ہے تم کو یہی
چہرہ ہے اور آئنہ ہے ، زلف ہے اور شانہ ہے

جانے آئینہ ہے کل آئینۂ زانو جدا
اور عوض شانے کے ٹکڑے استخوانِ شانہ ہے

شہر دم میں ہوتے ہیں آباد جن کے حکم سے
ایک دن اُن کے لیے بھی گوشۂ ویرانہ ہے

آج ہے جس کے قدم سے رونقِ باغِ جہاں
کل وہی رخصت برنگِ سبزۂ بیگانہ ہے

گرچہ بیداری میں اب ہیں دیدۂ نظارہ باز
پر کبھی یہ ماجرا اک خواب کا افسانہ ہے

اپنے کاموں میں رہو مشغول تم اے غافلو !
اس کی باتوں پر نہ جاؤ ناسخ اک دیوانہ ہے

۱- نسخۂ مطبوعہ بھدی : "اور لاش گڑتا ہے کبھی" (کذا)

۲۲۴

لالہ و گل کا جوش ہے ، بلبلوں کا خروش ہے
فصلِ وداعِ ہوش ہے ، موسمِ ناؤ نوش ہے

مر گئے تیرے غم میں ہم، کچھ بھی ہوا نہ تجھ کو غم
ہے یہ وہ غم کہ اے صنم، کعبہ سیاہ پوش ہے

چھڑکے ہو تیری چال پر کیوں نہ نسیمِ ہر سحر
نقشِ قدم سے رہگذر ، دامنِ گلفروش ہے

عشقِ گلِ عذار ہے ، بس یہی خار خار ہے
فصلِ بہارِ یار ہے ، اپنے جنوں کا جوش ہے

رنج ترا ہے ناگوار ، سر مرے تن سے جلد اتار
کس لیے اے ستم شعار تیغ وبالِ دوش ہے

ذکرِ نزاکتِ جاناں ہے جو چمن کے درمیاں
موجِ نسیم ہے زباں ، گل سو برنگِ گوش ہے

رنگ ہے اس کے جسم پر گل سے کہیں زیادہ تر
آئے برہنہ گر نظر سب کہیں سرخ پوش ہے

دیکھتے ہیں جدھر کو ہم ، پیشِ نظر ہے وہ صنم
کہتے ہیں جس کو سب حرم خانۂ بت فروش ہے

شکل نظر نہیں پڑی ، آیا نہیں پیام بھی
برسوں ہوئے کہ ایک سی حالتِ چشم و گوش ہے

ناسخ یہ قول ہے بجا حضرتِ میر درد کا
حسن بلائے چشم ہے ، نغمہ وبالِ گوش ہے

آتشِ عشق وہ ہے جس میں سمندر جل جائے
اک شرر جائے جو پتھر میں تو پتھر جل جائے

ہو پروانہ ہے کیا، شمعِ رخِ جاناں پر
گر فرشتہ بھی اگر[1] آئے تو شہپر جل جائے

تن بدن پھونک دیا ہے تپِ فرقت نے مرا
کیا عجب ہے جو مرے جسم سے بستر جل جائے

شمع ساں شرحِ تپِ غم سے ہے سوزاں مکتوب
کیوں نہ پروانے کے مانند کبوتر جل جائے

ہو ترا روئے جہاں سوز اگر عکس فگن
ہے یقیں خانۂ آئینہ، سترگر جل جائے

دوست کہتے ہیں آئے ساتھ جو دے آفت میں
شمع کے جلتے ہی پروانہ نہ کیونکر جل جائے

کھیل سمجھے وہ صنم جان کے آتش بازی
سوزِ غم سے جو کوئی عاشقِ مضطر جل جائے

جب نہ تب نالۂ سوزاں سے جلا خانۂ دل
نہ ہوا یہ کہ کسی غیر کا بھی گھر جل جائے

ہے وہ پرکالۂ آتش قدِ موزوں تیرا
دیجیے اس سے جو تشبیہ، صنوبر جل جائے

شجرِ طور کے مانند عصائے موسیٰ
دیکھ کر کاکلِ دلدار کا اژدر جل جائے

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع مجدی :
"گر فرشتہ بھی کوئی آئے تو شہپر جل جائے"

آتشیں چہرہ ہے[1] ہر مجاہدِ مضمون ناسخ
کیا عجب گر سرے اشعار کا دفتر جل جائے

۲۲۶

تیشہ لا فرہاد یاں سر بھی بدن پر بار ہے
جانِ شیریں میری اک شیریں دہن پر بار ہے
لے وہ کیونکر سرغِ دل کو نازکی سے ہاتھ میں
عندلیبِ زار ، شاخِ یاسمن پر بار ہے
ہم سبک دوشوں سے طے ہوتی ہے راہِ دیرِ عشق
رشتۂ زنار دوشِ برہمن پر بار ہے
کس طرح دوں چاہِ کنعاں سے بھلا اس کو مثال
عکسِ یوسف بھی ترے چاہِ ذقن پر بار ہے
گو نزاکت انتہا کی ہے میانِ یار میں
اس کا مضموں بھی مرے نازک سخن پر بار ہے
کیا نزاکت ہے کہ بوئے عطر سے ہے بے دماغ
رنگ مہندی کا کفِ نازک بدن پر بار ہے
کیوں سبک کرتا ہے واں لے جا کے اے بیچین دل
میرا ہونا اس کی ساری انجمن پر بار ہے
تیرے ہونٹوں کی کبودی سے ہوا ثابت مجھے
رنگ مسّی کا ترے نازک دہن پر بار ہے
کیا خیال اپنی سبکدوشی کا آیا ہے جو آج
کوہ کو تیشہ لگانا کوہ کن پر بار ہے

۱- مصطفائی طبع اول و دوم: "آتشیں چہرہ ہے"۔

ناتواں ایسے ترے فرقت میں ہیں اے رشکِ گل
برگِ گل سوسن کا ہم مرغِ چمن پر بار ہے

بوئے زلفِ عنبر افشاں لے گئی جب سے نسیم
مشک کا رکھنا غزالانِ چمن[1] پر بار ہے

کیا عجب زنجیر ساں تنگ آ کے چلانے لگے
دل ہمارا اُس کی زلفِ پر شکن پُر بار ہے

وہ گئے دن ، جو اٹھا لیتا تھا کوہِ عشق کو
کاہ کا سایہ بھی اب ناسخ کے تن پر بار ہے

۲۲۷

سامنے آنکھوں کے اب دن رات اس کا خال ہے
ان دنوں تاباں ہمارا کوکبِ اقبال ہے

لڑکھڑاتے ہیں قدم ، مستانہ تیری چال ہے
تاک انگور اے بتِ نازک جو سر پر شال ہے

گھر میں بیٹھے یار کو جو چاہے پاؤں سو بغیر
جب تلک خانے میں آئینہ ہے بے تمثال ہے

رو رہا ہوں جب سے اک موئے کمر کی یاد میں
صورتِ درِ نجف ہر اشک میں اک بال ہے

یاس نے مجھ کو عطا کی رنجِ نقصاں سے نجات
برق غمگیں ہو جو کشتِ آرزو پامال ہے

اُڑ نہیں سکتی تری انگیا کی چڑیا اس لیے
جالی کی کُرتی کا اُس پر اے پری رو جال ہے

۱۔ مصطفائی طبع اول و طبع دوم ۔ نسخہ مطبع مجتبائی :
"مشک کا رکھنا غزالانِ ختن پر بار ہے"

باندھتا ہوں اضطرابِ دل کے مضموں رات دن
یاں زمینِ شعر میں بھی ان دنوں بھونچال ہے

نرگس آنکھیں، شاخِ نرگس سرمہ دنبالہ دار
کو ہے ریحاں سبزۂ خط، تخمِ ریحاں خال ہے

اسفلوں سے دولتِ دنیا کو الفت ہے کمال
دیکھو تا زیرِ زمیں ہمراہِ قاروں مال ہے

ہم کو عاشورہ محرّم کا ہے ہر روزِ فراق
وہ گلے لگ جائے جس دن غرّۂ شوال ہے

سانپ کالا ہے اگر وہ گیسوئے عنبر فشاں
سانپ کے نیچے کا بچھو زیرِ گیسو خال ہے

روز ہوتا ہے زیادہ اے رستم گارو سیاہ
کیا خطِ مشکیں تمہارا نامۂ اعمال ہے

اے صنم نامِ خدا چھنتا[1] ہے دن رات اس سے نور
یہ تری جالی کی کرتی بھی عجب غربال ہے

شست و شوئے عارضِ گل ہے بہ اے شبنم عبث
یاد ہم کو سیرِ گلشن میں کسی کا گال ہے

کچھ نہیں اے ناسخ اس کو[2] فتنہ انگیزی سے خوف
ضربتِ عیسیٰ ہوں میں، دشمن اگر دجّال ہے

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع بھدی :
"اے صنم نام خدا چھنتا ہے دن رات اس سے نور"
۲- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع بھدی :
"کچھ نہیں اے ناسخ اس کی فتنہ انگیزی سے خوف"

۲۲۸

طور سے بھی اپنی وادی میں زیادہ نور ہے
آنکھ ہے جس غول کی گویا چراغِ طور ہے

منع کی ہے مے پرستی کس کی چشمِ مست نے
غنچۂ گل کی گلابی تک جو چکناچور ہے

یاں سرِ کاوش توانائی کے عالم میں نہ تھا
آج جسمِ ناتواں کیوں خارِ پائے مور ہے

ہے معنبر زلف اُس کی دودِ آتش ناک پر
بوئے خوش دیتا ہے دود اُس اِس شمع میں کافور ہے

عمدگی سے باز آ گر چاہیے سازِ نشاط
تارِ سیم و زر بھلا کب قابلِ طنبور ہے

جان لے گا تو بھلا کر معجزوں کی بحث کیوں
دم میں کب آتا ہے اے قاتل مسیحا دور ہے

کوہکن بھی ہے پرستاروں میں تیرے اے صنم
زخم تیشے کا نہیں، پیشانی پر سیندور ہے

دے اسی کو کوٹ کر مانجھا تو اپنی ڈور کو
شیشۂ دل میرے پہلو میں جو چکناچور ہے

تنگ آ کر جب کہا میں نے کہ مر جاؤں کہیں
بدگماں سمجھا کہ اس کو اشتیاقِ حور ہے

کر تماشائے جہاں سے پہلے اپنی آنکھیں بند
دیکھنا اُس کا اگر ناسخ تجھے منظور ہے

۲۲۹

جو اٹھائے ناز محبوب اُس جواں میں زور ہے
ورنہ یوں کہنے کو تو سارے جہاں میں زور ہے

آہ کرنے کا ابھی مجھ ناتواں میں زور ہے
ناوک اندازی کا اب تک اس کماں میں زور ہے

بارہا چھینا ہے مجھ کو دستِ عزرائیل سے
کس قدر ظلم خدا اُس جانِ جاں میں زور ہے

ہجر میں آئے یہاں تو پیس ڈالوں موت کو
اس قدر باقی ابھی اس نیم جاں میں زور ہے

جان دوں گا میں پہنچ کر تا سگِ کوئے بتاں
اب تک اتنا میری مشتِ استخواں میں زور ہے

ہے قوی دشمن تو غالب ہوجئے تدبیر سے
پیلباں[1] میں کب ہے جو پیلِ دماں میں زور ہے

دشت کو لیلیٰ کا ناقہ کھینچ کر لے جائے گا
جذبِ مجنوں سا بھلا کب سارباں میں زور ہے

مردمِ دانا پہ دشمن کا نہیں چلتا ہے زور
پیل کے آگے فقط یہ پیلباں میں زور ہے

ناتواں ایسا تری فرقت میں بے اغراق ہوں
جس قدر صاحبقوان و استناں[2] میں زور ہے

جب لڑیں باہم زبانیں وصل میں، بولا صنم
ناتواں ہے تو مگر تیری زباں میں زور ہے

۱- پیل بان = مہاوت ۔ فیلبان ۔
۲- مصطفائی اول و دوم ۔ نسخہ مطبع ہدی :
"جس قدر صاحبقراں داستاں میں زور ہے"

وہ بھی ہیں عشق سے لڑتے ہیں جو غم ٹھونک کر
ورنہ ناسخ اس قدر کب پہلواں میں زور ہے

۲۳۰

خیالِ یار میں دل شادماں ہے
نہیں ہے غم جو لفظوں سے نہاں ہے
ہنسی مبالغہ لب پر رنگِ پاں ہے
تماشا ہے تہہِ آتش دھواں ہے
تصور سیم تن کا دل میں ہے گنج
خیالِ یار[1] کاکل پاسباں ہے
تکلم ہی فقط ہے اس صنم کا
خدا کی طرح گویا بے دہاں ہے
کروں نالے ، ہوئی آخر شبِ وصل
طلوعِ صبح ہے ، وقتِ اذاں ہے
سراپا ہوں غمِ فرقت سے میں زرد
مرا قد مثلِ شاخِ زعفراں ہے
نقاب الٹی گلِ عارض سے اس نے
گلِ خورشید کی بھی اب خزاں ہے
تصور ہے جو اک خورشید رو کا
کُرہ دل کا مثالِ آسماں ہے
نہ کیوں اس شمع رو کے گرد ہو خلق
کہ فانوسِ خیالی آسماں ہے

۱۔ مصطفائی طبع اول و طبع دوم ۔ نسخۂ مطبع نہدق :
"خیالِ مار کاکل پاسباں ہے"

ہما تا کوئے جاناں کاش پہنچائے
کہ نامہ[1] ہے مرا جو استخواں ہے

ستارے جھڑتے ہیں جو کفشِ پا کے
زمیں فیضِ قدم سے آسماں ہے

دہانِ سگ میں ہے مانندِ مشعل
یہ سوزاں میرا ہر اک استخواں ہے

خیالِ زلف میں نالاں جو ہے دل
بسانِ اژدہا آتش فشاں ہے

برنگِ طائرِ رنگِ حنا ہوں
کفِ پائے حسیناں آشیاں ہے

ہرا اک انگلی ہے اس کی شمعِ کافور
ہتھیلی اک بلوریں شمع داں ہے

غزل اک اور پڑھیے اس زمیں میں
کہ سب مشتاقِ بزمِ دوستاں ہے

۲۳۱

ہمارا ہر نفس اک بادباں ہے
روانہ کشتیٔ عمرِ رواں ہے

ابھی ہرچند وہ بت نوجواں ہے
سفید اس کا مگر موئے میاں ہے

معطّر آتشِ گل کا دھواں ہے
کہ منہ پر گیسوئے عنبر فشاں ہے

۱۔ یہ شعر مصطفائی طبع اول و طبع دوم اور نسخۂ مطبع مہدی میں موجود نہیں ہے۔

تنِ خاکی میں قطرا اپنی نہاں ہے
زمیں جیسے حبابِ آسماں ہے

تصور میں جو ہے روئے عرق ناک
بجائے دل بغل میں عطر داں ہے

دہن ہے غنچۂ گلزارِ فردوس
کہ اک عالم کی نظروں سے نہاں ہے

کروں کیا احتیاطِ جسمِ خاکی
غبارِ توسنِ عمرِ رواں ہے

تصور میں ہے اک[2] انگیا کی چڑیا
یہ دل کنجشک کا اب آشیاں ہے

کیا اک آگ سے مچھلی کو پیدا
یہ اعجاز کفِ رنگیں عیاں ہے

ز بس واژوں ہے اپنا کوکبِ بخت
زمیں اوپر ہے، نیچے آسماں ہے

بحمد اللہ سرا ممدوح ناسخ
جگر بندِ امامِ انس و جاں ہے

۲۳۷

قیامت پائمالِ جلوۂ رفتارِ دلبر ہے
جو اُس کا نقشِ پا ہے پنجۂ خورشید محشر ہے

۱- مصطفائی طبع دوم میں :
"تن خاکی میں قدم اپنی نہاں ہے"
۲- مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجدی: "تصور میں ہے ایک"۔

نہ جا اے نامہ بر! اس کی گلی میں جان کا ڈر ہے[1]
کہ بالِ شوق سے نامہ ہمارا خود کبوتر ہے

قیامت کیوں نہ ہو جس دم چڑھائے آستیں قاتل
صفائے ساعدِ سیمیں بیاضِ صبحِ محشر ہے

دہن ہے چشمۂ آبِ بقا خط ہے[2] خضر اس پر
پھرا جو دل مرا محروم یہ گویا سکندر ہے

کسی کے خطِ مشکیں کے تصور میں جو روتا ہوں
مرا ہر پارۂ دل اشک کے دریا میں عنبر ہے

نکل جائے گا، تکتے تکتے اس کی راہ، دم اک دن
غنیمت ہے جو میرے غم کدے کا قبلہ رو در ہے

رہا بے تاب و نالاں زندگی بھر وادیِ غم میں
خداوندا جرس شاید مرے طالع کا اختر ہے

بلائے عشق سے بھاگوں نہ کیونکر گور کی جانب
برائے طفلِ ترسیدہ پناہ آغوشِ مادر ہے

اڑا جاتا ہوں اس کوچے کو میں بے اختیاری میں[3]
دھواں ہوں میں سیہ بخت اور جذبِ بار صرصر ہے

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"نہ جا اے نامہ بر گر اس گلی میں جان کا ڈر ہے"

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : "خط خضر ہے اس پر" ۔

۳۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"اڑا جاتا ہوں اس کوچے کو میں بے اختیارانہ"

شفا تدبیر[1] سے کیا ہو کہ مجھ بیمارِ ہجراں کو
کہ آبِ زندگی بے یار مجھ کو آبِ خنجر ہے

لب و دندان جاناں کو کہوں لعل و گہر کیونکر
صریحاً ایک پانی کا ہے قطرہ، ایک پتھر ہے

جلا دے کیوں نہ مضمون آتشِ داغِ جدائی کا
کہ کاغذ ہے مرا مکتوب یا بالِ سمندر ہے

بیابانوں میں ہے ریگِ رواں حکمِ رواں اپنا
شہِ اقلیمِ وحشت ہوں بگولا گردِ لشکر ہے

نشاں اس کے قدم کے پڑ گئے جب میری تربت پر
یہ سمجھا میں کہ میری خاک پر پھولوں کی چادر ہے

قریب آیا ہے شاید جلوہ گاہِ یار اے ناسخ
فروزاں پاؤں کا ہر آبلہ مانندِ اختر ہے

۲۳۳

جی میں ہے خارِ بیاباں جانئے مژگاں دیکھیے
زلفِ جاناں کے عوض شامِ غریباں دیکھیے

کھائیے کیوں داغِ معشوقانِ گل رخسار پر
مدعا[2] ہے دیکھنے سے، اس گلستاں دیکھیے

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی : "تبرید" ۔
تبرید : وہ شربت یا دوا جو تپ کے اول تین دن اور مسہل کے بعد اس کی حرارت کے انطفا کرنے اور دل کو تقویت دینے کے واسطے دی جاتی ہے ۔ ٹھنڈی دوا ۔ (نور اللغات ، جلد دوم ، صفحہ ۲۲۵) ۔

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی :
"مدعا ہے جی بہلنے سے گلستاں دیکھیے"

چل کے چھلّوں کی کمر میں کیجیے طوق اپنے ہاتھ
نرگسِ جادو کی جا چشمِ غزالاں دیکھیے

پھوڑ لی[۱] آنکھیں مژہ سے نیشِ عقرب کی طرح
کاکلِ پیچاں کے بدلے مارِ پیچاں دیکھیے

تا بہ کے اغیار میری[۲] آنکھ میں کھٹکا کریں
آبلوں میں کچھ دنوں خارِ مغیلاں دیکھیے

کر نے پھرئیے[۳] کیوں کسی کے مصحفِ رخ پر نگاہ
صبح سے تا شام بیٹھے اس سے قرآں دیکھیے

کیجیے اب دیدۂ غولِ بیاباں پر نگاہ
خشم آلودہ کہاں تک چشمِ گریاں[۴] دیکھیے

بہہ چکے ہیں اپنی آنکھوں سے بہت سیلابِ اشک
کوہ کے چشموں کو بھی یک چند جوشاں دیکھیے

کر چکے اقلیمِ وحشت میں بہت جوش و خروش
چند مدت عالمِ شہرِ خموشاں دیکھیے

ہو چکیں وہ عشق کے غم میں گریباں چاکیاں
اپنے غم میں گور کا چاکِ گریباں دیکھیے

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی :
"پھیرے آنکھیں مژہ سے نیش عقرب کی طرف"

۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی :
"تا بہ کے اغیار اپنی آنکھ میں کھٹکا کریں"

۳۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی :
"کرتے پھرتے کیوں کسی کے مصحفِ رخ پر نگاہ"

۴۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی :
"خشم آلودہ کہاں تک چشمِ نوباں دیکھیے"

ہے خدا شاہد ابھی تک اپنی قسمت ملتفت حضرت کی
کربلا میں روضۂ شاہِ شہیداں دیکھیے

۲۳۲

جلوہ گاہ اُس کا ازل سے یہ دلِ بیتاب ہے
جس کے آگے آفتاب اک کرمکِ شب تاب ہے
صحنِ گلشن ہر گمانِ مسلخِ قصاب ہے
بے فراقِ یار میں مجھ کو چھری کی آب ہے
کیا ہوا گر ایک دم آتی نہیں آنکھوں کو نیند
میرے[1] طالع کو عوض اس کے ہمیشہ خواب ہے
کر تواضع تار ہیں سب تیرے آگے سرنگوں
موردِ سجدہ قدِ خم گشتہ محراب ہے
فکر ہے تعمیر کی جو ان دنوں ہم کو مگر
اس خرابی کی طرف پھر آمدِ سیلاب ہے
تا بہ کے اس کی کشاکش کی ہے ایذا دیکھیے
ہر نفس خنجر ہے لیکن خنجرِ بے آب ہے
داغ ہو سر پر، گلے میں طوق، بیڑی پاؤں میں
کچھ تو ہو اسباب، آخر عالمِ اسباب ہے
بوٹی بوٹی ناز سے جس کی پھڑکتی ہے مدام
اُس کے غم سے سینے میں ہر لختِ دل بیتاب ہے
موں گی بند آنکھیں تو سمجھو گے کہ بیداری یہ ہے
دیکھتے ہو کھول کر آنکھیں جو تم یہ خواب ہے

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ـ نسخۂ مطبع ہندی:
"میرے طالع کو عوض ان کے ہمیشہ خواب ہے"

رنج ہوتے زمانۂ فراقِ یار میں اسبابِ عیش
چاندنی جو ہے سرِ ویرانے کو سیلاب ہے

کس بتِ سیمیں بدن کا آج ہے دل میں خیال
سلکِ اشک آنکھوں میں مثلِ سبحۂ سیماب ہے

ایک دم ہے یاں ترقی اور تنزل ایک دم
کوزے ہیں اہلِ جہاں اور آسماں دولاب ہے

ہے برنگِ گل جو ہر اک زخم اپنا خندہ زن
اشکِ بلبل ہے[1] تری تلوار میں کیا آب ہے

اشتیاق ایسا ہے آبِ تیغِ قاتل کا مجھے
مضطرب ہر زخم مثلِ ماہیٔ بے آب ہے

ایک قطرے میں ہوا فاسخ مرا ٹکڑے جگر
بادۂ گلگوں فراقِ یار میں زہراب ہے

۲۳۵

خاک اُڑوائی، کیا جنگل میں آوارا مجھے
چرخ سمجھا گردبادِ دامنِ صحرا مجھے

وصل کی شب عیش ہے اے ماہ لیکن غم بھی ہے
آفتابِ حشر ہوگا صبح کا تارا مجھے

ساقیا بے یار کیا ساغر لگاؤں منہ سے میں
ہر حبابِ بادہ ہے ہونٹوں کا تبخالا مجھے

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مہدی :
"اشکِ بلبل سے تری تلوار میں کیا آب ہے"

مثلِ ماہی پڑ گئے کانٹے زباں میں پیاس سے
بو لیا جھٹ نے کیا منّت کشِ دریا مجھے

زیست ہے میری جہاں میں گو سپندوں کی طرح
آسماں نے ذبح کرنے کے لیے پالا مجھے

سرد ہوتا ہوں تڑپ کر کوئی دم میں ہمدمو!
وصل کا یاد آ گیا ہے موسمِ سرما مجھے

داخلِ خلوت سرا ہونے کی کس کو تاب ہے
دیکھ کر زنجیرِ در کو ہو گیا سودا مجھے

ہو گیا مانندِ خورشید آشکارا داغِ عشق
صبح ساں چاکِ گریباں نے کیا رسوا مجھے

باندھتا ہوں جب کہ میں دستِ حنائی[1] کا خیال
خواب میں موسیٰ دکھاتا ہے یدِ بیضا مجھے

ہجر میں مثلِ پلنگ اب پھاڑے[2] کھاتا ہے پلنگ
کاٹنے کو دوڑتی ہے صورتِ دیبا مجھے

پوچھ اے ناسخ نہ کچھ میری اداسی کا سبب
آپ میں دن رات حیراں ہوں، ہوا ہے کیا مجھے

۴۴۶

نہیں پہنچتے جو نالے بھی ہم صفیروں کے
قفس کی طرح ہیں دل چاک ہم اسیروں کے

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخہ مطبع ہمدی :
"باندھتا ہوں جب کہ میں دستِ منور کا خیال"

۲- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخہ مطبع ہمدی : "اب پھاڑ کھاتا ہے پلنگ" ۔

سرِ حصول یہ عادت[1] یہاں بھی ہے قائل
جو رشک بالِ ہما ہر ہیں تیرے تیروں کے
کرے تو سلسلہ زلف میں اگر داخل
مرید ناکشِ بیعت ہوں سارے پیروں کے
بڑھا محیط مرے جوشِ اشک سے ایسا
کہ اب نشاں نظر آتے نہیں جزیروں کے
یہ انقلاب کیا تو نے چرخِ مینائی
کہ تھے جو ساغرِ مے ، کاسے ہیں فقیروں کے
جوابِ خط میں نہ پرزہ کبھی لکھا اُس نے
اور اُلٹے پرزے اڑائے مرے سفیروں کے
نظر کب اُن کی رگِ[2] گل پہ پڑتی ہے اے گل
جو شیفتہ ہیں ترے ہاتھ کی لکیروں کے
مجھے تو کہتے ہیں پروانہ اور آپ کو شمع
مزاج گرم ہیں کس درجہ ان شریروں کے
اگر حسیں ہو فقیر ، اس کے بندے ہیں ناسخ
نہ ہم ہیں شاہوں کے مشتاق نہ وزیروں کے

۲۳۷

گو کہ پروانہ ہے ہا میرا دلِ مشتاق ہے
شمع ہے فانوس میں یا ہانچے میں ساق ہے

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخہ مطبع ہدی :
"سرِ حصول سعادت یہاں بھی ہے قائل"
۲- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخہ مطبع ہدی :
"نظر کب ان کی رگِ برگِ گل پہ پڑتی ہے"

زلف کے مضموں سراسر ہیں مرے دیوان میں
تارِ سنبل رشتۂ شیرازۂ اوراق ہے
وادیِ وحشت میں ہیں اپنے ہی بہ جوش و خروش
طاقتِ جنبش کہاں اُس میں کہ مجنوں قاق ہے
ایک جا ہے عشق[1] میں عاشق کی مرگ اور زندگی
زلفِ مشکیں ناگ ہے، خالِ سیہ تریاق ہے
گل ہے غنچے میں نہاں، بو سے معطّر ہے[2] دماغ
پردۂ دل میں ہے لیکن شہرۂ آفاق ہے
ایک سی آئیں نظر مسجد کی محرابیں ہزار
اے صنم لیکن تری محرابِ ابرو طاق ہے
کہتے ہیں سب ہے جنوں جو ایسی چپکی ہے لگی[3]
ہاں خیالِ یار میں دن رات استغراق ہے
سجدے کرتے ہیں ہزاروں عابد و زاہد مدام
تیرے ابرو سے جو مسجد کا مشابہ طاق ہے
دور ہوں لیکن مفصّل ہے عیاں سب حالِ یار
یہ تصور کشف ہے، اعجاز ہے، اشراق ہے
ہوتی ہے ہردم شرر بار آتشِ رنگِ حنا
یہ تری دستک نہیں مطرب پسر، چقماق ہے

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مھدی : ”ایک جا ہے حسن میں“ ۔
۲۔ مصطفائی طبع اول ۔ نسخۂ مطبع مھدی :
”گل ہے غنچے میں نہاں بو سے معطر ہیں دماغ“
۳۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مھدی :
”کہتے ہیں سب ہے جنوں جو ایسی چپکی لگ گئی“

جان دی ہے جس نے تجھ کو نان بھی دے گا وہی
جو ترا خلاق ہے قاسم وہی رزاق ہے

۲۳۸

آگے آنکھوں کے تصور میں وہ گل رخسار ہے
ہر گلِ بے خارِ جنت جس کے آگے خار ہے

اے کلیم اپنا دل اس کا طالبِ دیدار ہے
آفتابِ حشر جس کا روزنِ دیوار ہے

کیوں گزرتی ہے بچا کر ہم کو وہ کافر نگاہ
جسمِ زار اپنا مگر ہائے نگہ کو خار ہے

کہہ رہا ہے باغ میں ہر گل زبانِ حال سے
مبتلائے خارِ غم رہتا ہے جو زردار ہے

جوششِ سودا میں کم ہونا لہو کا ہے مفید
کیا ہو ہم دیوانوں کو غم عشق اگر خونخوار ہے

ایک خوابِ طالعِ واژوں کو افسانہ ہوا
دردِ[1] عالم میرے نالوں کے سبب بیدار ہے

ایک ہیں میرے دلِ پُرداغ میں سو خارِ غم
فرق جو لالہ ہے باغِ دہر میں بے خار ہے

رو لگتا منہ پر نہیں آنکھوں میں پلکیں ہیں فقط
دیکھنا نرگس ہے پُرخار اور گل بے خار ہے

داغ ہائے یاس میں پھولوں کی چادر کے عوض
دل مرے پہلو میں گورِ حسرتِ دیدار ہے

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع مہدی :
"فتنۂ عالم میرے نالوں کے سبب بیدار ہے"

کہہ دیا تجھ کو خبر دلوا ہے ہا جل جائے گی
استخواں میرا غذائے مرغِ آتش خوار ہے

مانگ سب کہتے ہیں جس کو سالپ کی ہے وہ لکیر
کیچلی موباف ہے اور اس کی چوٹی مار ہے

وہ بت کافر ہے گلدستہ ریاضِ حسن کا
رشتۂ گلدستہ بالائے کمر زنّار ہے

زلف ہے مار اور موتی کان کے دندانِ مار
کان اس کا میری نظروں میں دہانِ مار ہے

چاہیے قاتل کا خنجر زخم پر پھاہے[1] کی جا
رنگ اس خنجر کا مجھ کو مرہمِ زنگار ہے

گر نہیں ہے جیب، سینے کی اڑا دے دھجیاں
فصلِ گل میں کس لیے دستِ جنوں بیکار ہے

تیر مجھ کشتے کے پہلو سے نہ کھینچو یار کا
بعدِ مردن بوسہ لینے کو لبِ سوفار ہے

دور[2] سے ہوتی ہے پیدا خاکساروں کی دوا
زخم کو جادے کا[3] سبزہ مرہمِ زنگار ہے

آتشِ نمرود گلشن بن گئی تھی جس طرح
یوں مجھے آتش کدہ بے یار پر گلزار ہے

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم: "پھاہے کی جا"۔
۲۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع بھدی:
"درد سے ہوتی ہے پیدا خاکساروں کی دوا"
۳۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع بھدی:
"زخم کو جادے کے، سبزہ مرہمِ زنگار تھا"

دوڑتا ہے جس طرح طاؤس پیچھے سانپ کے
یوں دلِ پُرداغ میرا گردِ زلفِ یار ہے
ہے خدا کی یاد کا حیلہ بےؔ اخفائے راز
اے صنم قاسمؔ تری فرقت میں شب بیدار ہے

۲۳۹

نہ فقط چاہ مجھے قامتِ دلدار کی تھی
مثلِ منصور زمانے کو ہوس دار کی تھی
ہر خریدار کو تھا مرتبۂ موسائی
آتشِ طور سے گرمی ترے بازار کی تھی
جو ترا رخنۂ دیوار نظر آتا تھا
صاف تصویر مرے دیدۂ بیدار کی تھی
تھا مجھے بالِ ہما ہر پرِ کاہِ دیوار
چھاؤں جس دم[1] مرے سر پر تری دیوار کی تھی
آشنا تھا نہ کبھی پائے نگہ کانٹوں سے
رات دن دید مجھے گلشنِ بےخار کی تھی
جن دنوں گلشنِ رخسار ترا تھا بےخار
کون بلبل تھی کہ خواہش جسے گلزار کی تھی
تھا تری نرگسِ میگوں سے زمانہ بدمست
سدھ کسی رند کو کب خانۂ خمار کی تھی
چہرہ آتش کدہ ، ابرو تھے سو محرابِ حرم
گردن آگے ترے خم کافر و دیندار کی تھی

۱- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع ہندی :
”چھاؤں جس دن مرے سر پر تری دیوار کی تھی“

صلح نامہ جو لکھا تیرے خطِ مشکیں نے
نہ رہی جنگ جو کچھ میری اور اغیار کی تھی
ہو گئی سبزۂ خط اُس کو شفا کی بُوٹی
اس سوا اور دوا کیا دلِ بیمار کی تھی
تھی نہ اُمید رہائی کی دلِ ناسخ کو
لاکھ زنجیر ترے گیسوئے خم دار کی تھی

۲۲۰

داغِ دل چمکا خیالِ عارضِ پُر نور سے
ہو گیا روشن چراغ اپنا چراغِ طور سے
زخمی ہوں تیغِ نگاہِ نرگسِ مخمور سے
مے ٹپکتی ہے مرے ہر زخم کے انگور سے
کس کے دانتوں کی چمک کا دھیان ہے جو رات دن
متّصل آتے ہیں آنسو سبحۂ بلّور سے
آدمی کوئی نہیں مثلِ سگِ اصحابِ کہف
ہیں سگِ دنیا ہزاروں بلعمِ باعور سے
ہوں حسینوں کے ستم سے جاں بلب تو غم یہ ہے
ہو سقر کا طور جنّت میں نہ جورِ حور سے
چاند کو اپنا مشابہ دیکھ کر کہنے لگا
ہم نے عکسِ آئنہ گردوں یہ دیکھا دور سے
کب ہوا مارِ سیہ کے سامنے روشن چراغ
بھاگتا ہے آفتاب اپنی شبِ دیجور سے
دستِ وحشت سے ہے اب جیبِ صبوری تار تار
پیرہن جلدی اتار اپنے تنِ پُر نور سے

فصلِ گل کرتی ہے پالیدہ ہولنگِ گل مجھے
جامۂ وحشت زیادہ ہو فزا منثور سے

شبہ ہو جاتا ہے تیری زلف کا شاید انھیں
بھاگتے ہیں سانپ کو سب دیکھ کر جو دور سے

اس میں ہے آبِ بقا اور اس میں ہے زہرِ فنا
کیا ہے ظلمت کو مثل اپنی شبِ دیجور سے

پیر زن نے کوہکن کا کام آخر کر دیا
زور کا کچھ بس نہیں چلتا ہے ہرگز زُور سے

نغمۂ مطرب سے مجلس مست ایسی ہو گئی
مے چھلک پڑتی ہے ہردم کاسۂ طنبور سے

پا شکستہ جو ہے کرتا ہے جہاں میں سلطنت
یہ صدا آتی ہے ہردم تربتِ تیمور سے

وصفِ لب[1] کرتا ہوں اک برقِ تجلی کے رقم
بہرِ خامہ شاخ منگوائی ہے نخلِ طور سے

۲۲۱

آتے آتے کیوں نہ الٹے پاؤں بھاگے دور سے
صبح ڈرتی ہے بہت میری شبِ دیجور سے

طالبِ دیدار جس کا ہے دِلا وہ تجھ میں ہے
جلوۂ برقِ تجلی تھا شرارِ طور سے

خلق کے اعمالِ بد کرتے ہیں ایسا انقلاب
جانے آتش جوش پانی کا ہوا تنّور سے

۱- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع ہندی : "وصف اب کرتا ہوں" -

منعمِ موذی کے گھر کو اہلِ حاجت لوٹتے
مانگتا ہے کب کوئی جا کر عسل زنبور سے

وعدۂ دیدار اُس نے حشر پر رکھا تو ہے
طالعِ خفتہ بھی ہوں بیدار لیکن صُور سے

باعثِ الفت ہے جنسیت ، گریز اتنی ہے کیوں
نرگسِ بیمار کو میرے دلِ رنجور سے

ہو گیا ہے مجھ کو سودا اک تجلی دیکھ کر
کہہ دو لڑکوں سے[۱] بھریں دامن وہ سنگِ طور سے

بعدِ مردن بھی ہے ایسا خوف قاتل کا مجھے
بات کر سکتا نہیں جنت میں آ کر حور سے

کیوں نہیں آتی صدائے نالۂ مرغِ سحر
کیا دہل کر مر گئے[۲] میری شبِ دیجور سے ؟

جسمِ خاکی کا ملک بانی ہے ساکن ہے خدا
اپنے رہنے کو یہ بنوایا ہے گھر مزدور سے

غور سے ٹیکے کی سرخی کچھ نظر آتی نہیں
رنگِ پیشانی صنم کا مل گیا سیندور سے

بانٹ لے کوئی کسی کا درد ، یہ ممکن نہیں
بارِ غم دنیا میں اٹھواتے نہیں مزدور سے

مثلِ مے ظاہر ہے پشتِ دست سے رنگِ حنا
کم نہیں اس کی ہتھیلی ساغرِ بلّور سے

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجیدی :
”کہہ دو لڑکوں کو بھریں دامن وہ سنگِ طور سے“
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجیدی : ”کیا دہل کر مر گئی“۔

خون ہے ہم میکشوں کا اُن کے سر پر واعظا!
جانے ہے سر کہ بناتے ہیں جو لوگ انگور سے
جب دیکھتا ہوں جب کلام اُس کا بہت آتا ہے یاد
اُنس تھا مجھ کو نہایت ناسخِ مغفور سے

۲۴۲

تھی محبت شعلہ ہائے عارضِ پُرنور سے
ہو حنوط اپنا موئے پر شمع کے کافور سے
ہے محبت مجھ کو اس سروِ قدِ پر نور سے
سایہ روشن تر ہے جس کا برقِ نخلِ طور سے
گرتی ہے بجلی جو عکسِ عارضِ پر نور سے
آئینہ کیا تو نے بنوایا ہے سنگِ طور سے
جل گیا ہے دل مرا برقِ رخِ پُر نور سے
یہ صنوبر کم نہیں رتبے میں نخلِ طور سے
وہ پری برگشتہ گر ہو تو بھی اپنی جان ہے
روح حاصل جس طرح ہوتی ہے قلب حور سے
دم بخود ہوں تیرے ماتھے کا یہ ٹیکا دیکھ کر
لال ہوتی ہے زبانِ ناطقہ سیندور سے
نزع میں ہوں پر مرے نزدیک آ سکتی نہیں
موت بھی ڈرتی ہے فرقت کی شبِ دیجور سے
یہ تری رفتار سے طرزِ قیامت ہے عیاں
منہ لگا دیتا ہے اسرافیل ہردم صور سے
دیکھنا اے اہلِ عبرت انتقامِ آسماں
بنتے ہیں جام گدا خاکِ سرِ فغفور سے

خون لاکھوں بے گناہوں کے ترے سر پر ہوئے
اے بتِ سفاک تو کچھ کم نہیں مزدور سے
مثلِ موسیٰ ہو مسیحا کو یدِ بیضا نصیب
ہاتھ لگ جائے اگر میرے تنِ محرور[1] سے
جو نظر آیا حرم میں ، دیر میں دیکھا وہی
ناسخ اپنی آنکھیں روشن ہیں خدا کے نور سے

۲۲۳

زار انتظارِ خط نے کیا اس قدر مجھے
پہچانتا نہیں ہے مرا نامہ بر مجھے
شاخوں کی طرح سائے کو رکھتا ہے دوش پر
گر دیکھتا ہے دھوپ میں کوئی شجر مجھے
ہوں وہ غمی[2] کہ لب نہ ہنسی سے ہوں آشنا
دیوارِ قہقہہ بھی جو آئے نظر مجھے
دل میں بتوں کے سوزِ محبت نے گھر کیا
گویا ہے دخل سنگ میں مثلِ شرر مجھے
میں سر پٹک پٹک کے مروں یعنی اس جگہ
دکھلا دیا قضا نے ترا سنگِ در مجھے
کعبے میں جا کے بیٹھ رہوں گا میں دیکھنا
تو دیر سے نکالے گا اے بت اگر مجھے

۱۔ محرور : حرارت کیا گیا ۔ گرم ۔ تتا ۔ (فرہنگ آصفیہ ، جلد چہارم ، ص ۳۰۶) ۔

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی :
"ہوں وہ غمیں کہ لب نہ ہنسی سے ہوں آشنا"

ممکن نہیں سوائے خدا علمِ غیب ہو
کیونکر صنم تری نظر آئے کمر مجھے

مر جاؤں پیشتر میں الٰہی وصال سے
فرقت میں زیست کی ہو تمنا اگر مجھے

صندل کی جستجو ہے عبث ، فائدہ ہے کیا
اک دردِ سر میں اور جو ہو دردِ سر مجھے

تھی اس کے ہاتھ میں جو چھڑی اور فندقیں
کیا شاخِ خشک میں نظر آئے[1] ثمر مجھے

روشن دلوں سے رکھتے ہیں نفرت سیاہ کار
مکروہ جیسے وصل کی شب ہے سحر مجھے

تیرے سنہرے رنگ پہ مجھ کو جو ہے جنوں
اطفال کرتے ہیں ہدفِ خشتِ زر مجھے

ناسخ برنگِ نکہتِ گل ہے سفر مرا
مرکب ہوا ہے دوشِ نسیمِ سحر مجھے

۲۴۴

ابھی ہم قید ہیں گو روح چھوٹی محبسِ تن سے
موئے پر بھی نہ اترا مثلِ قمری طوق گردن سے

بہارِ حسن ہے ایمن خزانِ جورِ دشمن سے
چراغِ گل کبھی ہوتا نہیں گل ، بادِ دامن سے

خطِ رخسارِ تاباں کے تصوّر میں جو روتا ہوں
ہوئے ہیں دانے ہائے اشک حاصل مہ کے خرمن سے

۱- نسخۂ مطبع مجھی : "کیا شاخِ خشک میں نظر آئے ثمر مجھے" -

جنوں نے میری عریانی کو یہ تاثیر بخشی ہے
نہ اُلجھا میرے صحرا کا کبھی کانٹا بھی دامن سے

زمیں کو کر دیا رشکِ فلک تیری سواری نے
ہزاروں ماہِ نو نکلے نشانِ نعلِ توسن سے

اگر اندر گلستاں ہے تو باہر نرگستاں ہے
لگی رہتی ہیں آنکھیں تیری دیواروں کے روزن سے

جو دے خورشید سے نسبت تجھے وہ تیرہ باطن ہے
کہ روشن عالمِ دل ہے ترے رخسارِ روشن سے

زباں یوں میری دزدانِ سخن نے بند کر دی ہے
کہ رستے بند ہو جاتے ہیں جیسے خوفِ رہزن سے

نکالوں دشت میں کیا خار پانے ناتوانی سے
کہ میرے ہاتھ کو ہوتا ہے رعشہ بارِ سوزن سے

مسی آلودہ لب سے جب کھلے دانت اس کے ہنسنے میں
نظر آنے لگیں بیلے کی کلیاں برگِ سوسن سے

چمن میں گل بھی مرتا ہے ہر اک میری طرح تجھ پر
ہوا ثابت یہ اے گل پیرہن ! بلبل کے شیون سے

کشش ہے ہم اسیرو اپنے[1] ایسی عشق کی دیکھو
کھنچی آتی ہے بوئے گل قفس کو صحنِ گلشن سے

ہوائے سرد میں خوش آتی ہے خار کی بھٹی
غریبوں کی ہے جیسے زندگی جاڑوں میں گلخن سے

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخہ مطبع بھدی :
"کشش ہے ہم اسیرو ایسی اپنے عشق کی دیکھو"

میں سر دینے کو حاضر ہوں ، اسی کو شرم آتی ہے
جھکی ہے گردنِ قاتل زیادہ میری گردن سے
اچنبھا کیا اگر زندے ہیں تیرے تابعِ فرماں
تری آواز پر مردے نکل آتے ہیں مدفن سے
جنوں تھا مجھ کو جب میں طوق منت کا پہنتا تھا
پری زادوں سے لاسخ عشق ہے مجھ کو لڑکپن سے

۲۲۵

دل مرا مرگِ شبِ فرقت میں ایسا شاد ہے
شیونِ یاراں مجھے شورِ مبارک باد ہے
شکوۂ فصلِ بہارِ روئے جاناں ہے عبث
مثلِ گل سینہ مرا صد چاک مادر زاد ہے
زنگ ہو جاتا ہے منزل میں پہنچتے ہی خموش
گور میں بھی میرے دل کو نالہ و فریاد ہے
قدردانی جور سے خالی نہیں ہے دہر میں
دستِ گلچیں سے گلوں پر باغ میں بیداد ہے
دور ہے یار اپنی نظروں سے ، تصور میں قریب
گھر تو ویراں ہے مگر بزمِ خیال آباد ہے
بندھ گیا مجھ کو تصور کس قدِ موزوں کا آج
جو بگولہ ہے مری نظروں میں اک شمشاد ہے
جی نہیں بچتا نظر آتا شبِ فرقت میں آج
کہکشاں تلوار ہے اور آسماں جلّاد ہے
قصرِ تن کی بے ثباتی کا جو آیا ہے خیال
ہر حباب اپنی نظر میں قلعۂ فولاد ہے

شوقِ گلزارِ فنا میں میرے تنِ روح کو
چار دیوارِ عناصر خانۂ صیاد ہے

یہ ہمارا دل ہے ، یا پروانہ ہے ، یا فاختہ
ہے وہ قد ، یا شمعِ کافوری ہے ، یا شمشاد ہے

سر جھکائے ہوں تواضع سے گنہگاروں کی طرح
ہر کوئی اس پر بھی میری جان کو جلاد ہے

کیا سمجھ کر کوے مہ رویاں میں پھر جاتا ہے تو
آتشِ عشقِ گذشتہ تجھ کو ناسخ یاد ہے

۲۴۶

شبیہِ قامتِ موزوں سرا پر ایک مصرع ہے
نہیں دیواں ، تصاویرِ حسیناں کا مرقع ہے

ترا زیور جو سارا اے پری پیکر مرصع ہے
تو اس کے وصف میں بالکل کلام اپنا مرصع ہے

ترے رخسارِ تابندہ کے مضموں کا جو مطلع ہے
بعینہ آفتابِ صبحِ محشر کا وہ مطلع ہے

شگافِ خامہ ہے چاکِ گریبانِ سحر گویا
جو مطلع ہے مرا خورشیدِ معنی کا وہ مطلع ہے

طواف اس کا نہ کیوں بارہ مہینے ہم پہ واجب ہو
کہ رتبہ طاقِ ابرو کا کہیں کعبہ سے ارفع ہے

پڑا جوشِ صفا سے عکس جو اس پر ستاروں کا
گماں ہے ایک عالم کو کہ جسم اس کا مرصع ہے

کروں مذکور کچھ آتا ہے آخر ذکر جاناں کا
مری جو بات ہے گویا وہ اک بندِ مرجع ہے

پس از مردن بھی ظاہر ہے دغل ان اہلِ دنیا کا
وگرنہ کیا سبب جو ان کے ہونٹوں پر ملمع ہے

کہاں بیت الصنم میں ہر کسی کو بار ملتی ہے
وہ بیت‌اللہ ہے سارے جہاں کا جس میں مجمع ہے

غرورِ اوجِ دو روزہ عبث ہے مجھ کو اے اسفل
میں مثلِ ماہِ گردوں ہوں، تو مثلِ ماہِ مقنع ہے

بھلا دیر و حرم کیا آگے تیرے آستانے کے
صنم نامِ خدا ہندو مسلماں کا یہ مرجع ہے

مرا خامہ ہے باغِ فکر میں شجرہ رباعی کا
مری طبعِ رواں اشعار کی بحروں کا منبع ہے

اگر تقطیعِ شعر اس سے کوئی پوچھے تو حیراں ہو
یہ شیخِ شہر سارے شاعروں میں جو مقطع ہے

رگڑتا ہے سر اپنا کب سے تیرے آستانے پر
سبب یہ ہے جو اے خورشیدِ تاباں ماہِ اقرع ہے

حسینوں کی لگی رہتی ہیں آنکھیں سبزۂ خط پر
چھپا ہے گر آکے کبھی غزالوں کا یہ مرتع[1] ہے

امیر اپنا کہوں کیونکر نہ مداحِ شاہِ مرداں کو
قضا[2] میں بھی وہ اقضیٰ ہے شجاعت میں وہ اشجع ہے

۱۔ مرتع : چراگاہ۔
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم - نسخہ مطبع ہندی :
"قضا میں بھی تو اقضیٰ تھے، شجاعت میں جو اشجع ہے"

۲۴۷

روشن جو عکسِ رخ سے یہ جامِ شراب ہے
کہتے ہیں دستِ ماہ میں اب آفتاب ہے

تاثیر گل رخوں کے تصوّر کی دیکھنا
لختِ جگر جو گل ہے تو آنسو گلاب ہے

بے بار ہتے ہی جو ہوا چاک چاک دل
ساقی یہ ہے شراب کہ خنجر کی آب ہے

حیرت سی ہے طلسمِ جہاں دیکھ کر مجھے
یا رب مرا خیال یہ ہے یا کہ خواب ہے

کانٹے جو کر رہے ہیں غریبوں سے کاوشیں
اس ظلم سے ہر ایک بیاباں خراب ہے

کتنے لگے ہیں زخم ملے ہوسے کس قدر
قاتل سے ہم سے حشر کے دن یہ حساب ہے

ایسا جنوں میں رونے کہ دریا بنا ہے دشت
زنجیرِ موج آبلۂ پا حباب ہے

آخر وہاں ہے حسن، یہاں زندگی تمام
پیری ہی اپنے[1] یار کا عہدِ شباب ہے

ہم میکشوں کو غم نہیں مرنے کا محتسب
فردوس میں بھی سنتے ہیں نہرِ شراب ہے

زلفوں کو قطع کر کہ یہ ہیں دشمنِ جہاں
سانپوں کے قتل کرنے میں ظالم ثواب ہے

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہُدی:
"پیری ہی اپنی، یار کا عہد شباب ہے"

یوسف کی طرح کھینچ ہی لاؤں گا دیکھنا
ظالم مرا خیال ، زلیخا کا خواب ہے

اس مست نے جو کی سوئے دریا نگاہ گرم
پانی ہوا شراب تو ماہی کباب ہے

آباد دل میں ہے غم و اندوہ کا جہاں
سینہ فلک ہے ، داغِ فراق آفتاب ہے

کس کو ہیارے یار کے نظارے کی ہے
خورشید جس کو کہتے ہیں اُس کی نقاب ہے

ہے عشق اس کے رونے کتابی سے بس مجھے
ناسخ جو شوخ صاحبِ ام الکتاب ہے

۲۲۸

فکر سے میں نہیں خالی غمِ جاناں میں کبھی
کبھی زانو پہ مرا سر ہے ، گریباں میں کبھی

ناتواں ایسے ہیں ہم ، سایہ گلوں پر جو پڑے
نکہتِ گل سے نہ جنبش ہو گلستاں میں کبھی

ہے یہ میرے دلِ صد چاک سے نفرت اُس کو
شانہ کرتا نہیں وہ زلفِ پریشاں میں کبھی

قافلہ کیا کہ جرس کی بھی صدا دہشت سے
نہیں آتی مرے پُر ہول بیاباں میں کبھی

عالم[۱] آہوں کے شراروں کا یہ ہے رونے کا
جس طرح اُڑتے ہیں جگنو شبِ باراں میں کبھی

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی :
''عالم آہوں کے شراروں کا یہ ہے رونے میں''

ہم ہیں وہ وحشیٔ عریاں کہ اگر قتل بھی ہوں
لہو اپنا لگے قاتل کے نہ داماں میں کبھی

فائدہ قربِ تونگر سے تہی دستوں کو؟
نظر آئے نہ گہر پنجۂ مرجاں میں کبھی

راہ پائے ترے کوچے میں جو وہ آنے کی
نہ رکھے بادِ صبا پاؤں گلستاں میں کبھی

شوق قاتل کی گلی کا ہو فرشتہ نقال
لاشہ اپنا نہ رہے گورِ غریباں میں کبھی

کہہ دے اک روز کہ غیر آنے نہ پائے گھر میں
جنگ دیکھی نہ اگر ہو سگ و درباں میں کبھی

یار آیا نہ نظر، برسوں رہا میں گریاں
برق چمکی نہ مرے سامنے باراں میں کبھی

دن جدائی کا شبِ وصل سے رہتا ہے دراز
دخل ہوتا نہیں خورشید کا میزاں میں کبھی

سرد مہری یہ رہی شعلہ رخوں کی ناسخ
گرم پہلو نہ ہوا فصلِ زمستاں میں کبھی

۲۲۹

دہر میں غرقِ گنہ کون مرا ثانی ہے
موجِ مے مجھ کو بجائے خطِ پیشانی ہے

لشکرِ مورچۂ خط ہو کہیں کبر شکن
ہر پری چہرہ کو دعوائے سلیمانی ہے

نور کا نام شبِ تارِ جدائی میں نہیں
جو ستارہ ہے سو اک دیدۂ قربانی ہے

ٹکٹکی[1] لگ گئی جس سمت ہوا منہ اپنا
مثلِ آئینہ یہاں عالمِ حیرانی ہے
چشمِ جاناں سے مرے حال پہ آنسو ہیں رواں
دیکھنا چشمۂ خورشید میں بھی پانی ہے
سوزِ غم سے نہیں ہرگز دلِ بیتاب کو رنج
ایک[2] سیاب کو اورنگِ سلیمانی ہے
اس قدر کر گئی پرواز زمانے سے تموز
کہ ہر اک تاجِ خروس افسرِ سلطانی ہے
کام شمشیر نگہ کرتی ہے جس مقتل میں
جوہرِ تیغ وہاں دیدۂ قربانی ہے
گور زنجیروں سے ڈھانکو[3] عوضِ چادرِ گل
تھا میں دیوانہ ، مری روح بھی دیوانی ہے
کم شبِ مہ سے شبِ تار نہیں ہے **ناسخ**
اب تصور میں جو وہ چہرۂ نورانی ہے

۲۵۰

پھر وحشت لامکاں کا چاہیے میداں مجھے
گوشۂ زنداں ہوا ہے عالمِ امکاں مجھے
واقعی انساں ہے اشرف ساری مخلوقات سے
لاکھ پریوں کو بھلا دیتا ہے اک انساں مجھے

۱۔ یہ شعر نسخۂ مصطفائی اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجیدی میں موخر ہے ۔
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجیدی :
"آگ سیاب کو اورنگ سلیمانی ہے"
۳۔ مصطفائی طبع اول : "ڈھانپو" ۔

میرے بستر سے جو وہ صبحِ شبِ وصل اٹھ گیا
صورتِ تصویرِ توشک کر گیا بے جان مجھے

جانتا گر یہ شرارت ، دل نہ دیتا اے صنم
سنگ سے آتی نظر کیا آتشِ پنہاں مجھے

پاسباں سمجھا ، نکیرین آئے جب بہرِ سوال
گور میں بھی ہے خیالِ کوچۂ جاناں مجھے

ہونٹ اپنے پہروں دانتوں سے چباتا ہوں میں آہ
یاد جب آ جاتے ہیں اُس کے لب و دنداں مجھے

ہوش آتا ہے جو سودا میں تو کرتا ہوں خیال
کیا میں کانٹا ہوں ملا جو دشت کا داماں مجھے

حور ہے تو اے پری رو ، گھر ترا باغِ بہشت
مثلِ رضواں ہے ترے دروازے کا درباں مجھے

مردمِ دنیا مرے حق میں سگِ دیوانہ ہیں
کاٹنے کو دوڑتے ہیں صورتِ انساں مجھے

کیوں ملامت کرتے ہیں ناسخ یہ چاک جیب ترا[1]
چاک کرنا ہے ابھی تو دشت کا داماں مجھے

۲۵۱

حیرت سے اشک چشم کے باہر نہ ہو سکے
دریا بھرے رہے پہ مژہ تر نہ ہو سکے

حاصل ہو غیرِ گوشۂ تجرید کیا کہاں
بن سیپ قطرۂ آب کا گوہر نہ ہو سکے [1]

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ، نسخۂ مطبع محمدی : "چاک جیب پر"

باہر قدم نکالیں جو ہم گھر سے کیا مجال
یہ ضعف ہے کہ آپ سے باہر نہ ہو سکے

بھولے نہ تیرا مصحفِ رخسار دیکھ کر
جس سے کہ ایک حرف بھی ازبر نہ ہو سکے

تقلید سے ہوا شرفِ ذات کب حصول
آئینہ ساز مثلِ سکندر نہ ہو سکے

کیونکر کروں میں اپنی طرف اس کا دل رجوع
جب اختیار اپنے ہی دل پر نہ ہو سکے

رکھو کسی طرح تو سروکار مہرباں
کدنے رہو جفا ہی، وفا گر نہ ہو سکے

شامل نہ ہو جو ناسخِ برگشتہ[1] کا غبار
صحرا میں گردباد سے چکّر نہ ہو سکے

۲۵۲

گو مرا تابوت یاروں کو وبالِ دوش ہے
گور تو میرے لیے کھولے ہوئے آغوش ہے

کیا چمکتا ہے ترے[2] نورِ بدن سے پیرہن
ایک عالم کے گماں میں تو تمامی ہوش ہے

خوب بزمِ دہر میں آتش زبانی کر چکے
آج کل اپنا چراغِ زندگی خاموش ہے

۱۔ نسخۂ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مهدی :
"شامل نہ ہو ناسخِ سرگشتہ کا غبار"

۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مهدی : "کیا چمکتا ہے ترا"۔

پنجۂ خورشید کیا ہے پنجۂ پا کے حضور
حسن میں خورشید سے افزوں تری پاپوش ہے
ہوں میں وہ بیکس، ہوا کوئی نہ مجھ پر نوحہ گر
آدمی تو کیا چراغِ گور تک خاموش ہے
کھیل گنتا ہے فغانِ عاشقِ جاں باز کو
محو ایسا کھیل میں وہ طفلِ بازی کوش ہے
مرگ کے ساماں مہیا ہیں، قضا کی دیر ہے
باڑھ واں تلوار پر ہے، یاں لہو کا جوش ہے
چاند پر یہ خاک ہے یا اس کے چہرے پر بھبوت
بدلی میں سورج ہے یا محبوب کمبل پوش ہے
عید ہے اک شب چلو مل کر پئیں ہم تم شراب
آج وہ دن ہے کہ میخانوں میں نوشانوش ہے
ہوں وہ میکش رات دن رہتا ہوں لبریزِ شراب
طائرِ جاں تک ہطِ مے کی طرح بے ہوش ہے
مثلِ **ناسخ** چاہیے بے ہوش ہو پی کر شراب
اس خراباتِ کہن میں جو کوئی ذی ہوش ہے

۲۵۳

شان آگے خاکساروں کے سرکش کی کب رہے
پیدا ہو بوتراب تو کیا بولہب رہے
مانندِ دانۂ خال یہ ہم خاک میں ملے
نکلا جو اس کا سبزۂ خط کھیت اب رہے
ریگِ رواں بنی ہے ہمارے جسد کی خاک
اک دم نہ بعدِ مرگ بھی ہم بے طلب رہے

اس باغ میں ثبات ہے گل کو نہ خار کو
اسفل رہے جہاں میں، نہ عالی نسب رہے
مر دے جیا کیے لبِ جاں بخش یار سے
بوسے کے انتظار میں ہم جاں بلب رہے
اے تاجدارِ ملک کہاں مغتنم یہ ہے
قابو میں گر لحد کی زمیں دو وجب رہے
گر کر کے شیشے اشک کے ٹوٹیں گے کس قدر
اے گریہ میرے دل کا سلامت حلب رہے
انسان دل میں کہتے ہیں حسرت سے مرتے دم
تنہا عدم کو ہم چلے دنیا میں سب رہے
ہر موجِ بوریا رگِ خوابِ گراں ہوئی
راحت میں عمر بھر مرے ہاتھ طلب رہے
کی ہے خیالِ زلف میں سب زندگی بسر
گویا کہ ہم جہان میں بس ایک شب رہے
ناسخ ہر ایک ملک کی ہوتی ہے اور رسم
آزردہ وضعِ دہر سے ہم بے سبب رہے

۲۵۴

عاشق کی سعادت ہے جو سر اُس کا جھکا ہے
قاتل تری تلوار نہیں، بالِ ہما ہے
جب وادیٔ وحشت میں گذر میرا ہوا ہے
ہر ایک بگولہ پئے تعظیم اُٹھا ہے
نادان ہیں، ہوتا ہے گماں جن کو شفق کا
گلشن کا ترے رشک سے یہ رنگ اُڑا ہے

جو دن ہے سو ہے دیوِ سفید اپنی نظر میں
جو رات ترے ہجر میں ہے، کالی بلا ہے

وہ سنگدل اک روز ہوا صاف نہ مجھ سے
کہتے ہیں غلط سنگ سے آئینہ بنا ہے

ممکن نہیں تا حشر فنائے غمِ خوں خوار
گویا مرے خون میں اثرِ آبِ بقا ہے

گر آ کبھی پامال کہ اس شوق میں دن رات
گلشن میں جو ہے شاخِ گل اک دستِ دعا ہے

دعوائے خدائی جو بتو ہے نہ پھرو دور
سوچو کہ رگِ جاں سے بھی نزدیک خدا ہے

خالق نے یہ سُرخ اس کے کفِ پا کو بنایا
ہوتا ہے زمانے کو یقیں رنگِ حنا ہے

گر سودۂ الماس نہ تھا لُون چھڑکتا
یہ ہر دہنِ زخم کو قاتل سے گلا ہے

ہر دم ہے تمنا کہ کہیں تن سے جدا ہو
جس دن سے مرا سر ترے قدموں سے جدا ہے

عالم نظر آتا ہے ترے عشق میں بیمار
عشق اس کو نہ کہیے یہ زمانے میں وبا ہے

کہیے جو طویل اس کو سزاوار ہے ناسخ
جس بحر میں اس زلف کا مضمون بندھا ہے

۲۵۵

باد کے مانند ساقی لے اڑا پانی مجھے
کشتی ہے ہوگئی تختِ سلیمانی مجھے

اس قدر اے غم نہ میرے استخوانوں کو گھلا
کرنی ہے اک دن سگِ جاناں کی مہمانی مجھے
کرتی ہے ضایع عبادت کو سیہ کاری مری
سجدے میں حاصل نہیں جز داغِ پیشانی مجھے
اس قدر تو نے اڑایا ہے مجھے باتوں میں آج
اے پری! زیبا ہے دعوائے سلیمانی مجھے
بن گیا مقیش کا تار ان دلوں تارِ نگاہ
بس کہ آتا ہے نظر وہ روئے نورانی مجھے
کب ہوا ساکن کہاں کے خانہ رنگیں میں تیر
روکے کیا نقش و نگارِ عالمِ فانی مجھے
تھا میں عاشق جب غرورِ حسن دنیا میں نہ تھا
سنگ میں آئینہ تھا ہے جب سے حیرانی مجھے
قتل ہوتا ہوں، نہ مجھ سے بے دماغی کیجیے
تاب ہے تلوار کی یہ چینِ پیشانی مجھے
کیا سبک روحی نے ناسخ کردیا رتبہ بلند
بوئے گل ہوں، ہے صبا تختِ سلیمانی مجھے

۲۵۶

ترے گلگوں ہیں اے رنگیں ادا بادِ بہاری سے
بنالیں غازۂ رخسارِ گل، گردِ سواری سے
ہنسی آتی ہے اس گل کو ہماری اشک باری سے
شگفتہ ہوتے ہیں گل جس روش ابرِ بہاری سے
فراقِ یار میں نفرت ہے مجھ کو بادہ خواری سے
کہیں زاہد نہ کردے متہم پرہیزگاری سے

پس از مردن چلا ہوں سوئے جاناں بے قراری سے
مشابہ ہو گیا ہے گنبدِ مدفن عماری سے
ترے آگے چمن ہے پانی پانی شرمساری سے
روانی میں مشابہ رنگِ گل ہے خونِ جاری سے
گریزاں وہ سہی قد کیوں ہے میری اشکباری سے
کہیں شمشاد بھی کرتے ہیں وحشت نہرِ جاری سے
جو دعوائے ہدایت ہے گذر عاری[۱] وقاری سے
ہوئے نقشِ قدم خضرِ بیاباں خاکساری سے
فراقِ یار میں آئی اجل ابرِ بہاری سے
ہر اک بوندی نہیں کم مجھ کو بوندی کی کٹاری سے
زمیں پر پاؤں کس انداز سے رکھتا ہے اے ظالم
رواں ہے ساتھ ہر نقشِ قدم تک بے قراری سے
مریضِ عشق ہوں جب سے ہوئی نفرت زمانے کو
گریزاں جس طرح ہوتے ہیں سب امراضِ ساری سے
کیا گلگشت میں کس سرو قد نے زلف میں شانہ
درختوں کو چمن میں کم نہیں ہر برگ آری سے
مربی کے نہیں محتاج ہمت جن کی عالی ہے
بھلا کشتِ فلک ہے سبز کس کی آبیاری سے
اگر ہے آبرو انسان میں ، ہوگی شجاعت بھی
بُرش تلوار میں ہوتی ہے پیدا آبداری سے
درختوں سے نہیں باغِ جہاں میں کم ہیں دیوانے
ہرے ہو جاتے ہیں داغِ کہن بادِ بہاری سے

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی :
"جو دعوائے ہدایت ہے گزرِ عالی وقاری سے"

اگر ہے مشک میں کیڑا اجل اُس کو بھی آتی[1] ہے
ہوا کب قصرِ تن محکم محل کی پائداری سے
پسند آتا ہے گر تجھ کو عروج اک دم کا اے منعم
حبابِ آبجو بھی کم نہیں تری عماری سے
جو اک دن وصل کی راحت تو اک دن رنج فرقت کا
وہ ہیں ہمدرد میرے جن کو تپ آتی ہے باری سے
بری ہوتے ہیں تدبیروں سے جو دنیا میں کامل ہیں
تعلق بخیہ و مرہم کو کیا ہے زخمِ کاری سے
ہوا ایسی بھری گلزار کی اُس گل کے آنے ہی
چراغِ گل ہوئے گل، جنبشِ بادِ بہاری سے
نظر آتا ہے شیشہ سربریدہ ہجرِ ساقی میں
شرابِ ارغوانی کم نہیں ہے خونِ جاری سے
سیہ رو کیوں کہا کرتا ہے ہم مستوں کو اے زاہد
کہ اپنے چہرے پر رہتی ہے سرخی بادہ خواری سے
زبانِ شمعِ سوزاں سے یہ مصرع گرم سنتا ہوں
سر عریاں ہے اس محفل میں بہتر تاجداری سے
جو خونریزی کی عادت رکھتے ہیں بے فیض ہوتے ہیں
کہاں ملتی ہے سائل کو کبھی کوڑی کٹاری سے
دلیل اس پر ہے کیا جو حکم کرتا ہے نجاست کا
کہ مے گردش میں زاہد کم نہیں ہے آب جاری سے
رلایا مجھ کو جب برسوں تب آیا وہ سہی قامت
ہوا ہے سرو پیدا باغباں کی آبیاری سے

۱۔ نسخۂ مطبعِ مجیدی: ''اجل اس کو بھی آتی ہے''۔

شہادت پائی جو سودائے زلفِ یار میں ہم نے
ہوا نقشہ عیاں مارِ سیہ کا خونِ جاری سے
تنزّل میں ترقی کرتی ہے افتادگی لاسخ
کہ معراجِ شجر پائی نے پایا خاکساری سے

۲۵۷

جب تلک گردش ہے اُس کو اک جہاں گردش میں ہے
مثلِ فانوسِ خیالی آسماں گردش میں ہے
کیوں[1] نہ ظالم کی مدد کرتا رہے دورِ فلک
تیزیِ شمشیر کی خاطر فساں گردش میں ہے
تم جو یاں شب باش ہو، پھرتا ہے کیا نالاں رقیب
خوابِ آسائش میں ہم تم، پاسباں گردش میں ہے
جو کہ ہیں صاحب سخن اک دم نہیں اُن کو قرار
ہے زباں بالفرض اگر معجز بیاں، گردش میں ہے
ہوں[2] میں ہر دورے میں محروم اور سب ہیں کامیاب
آسماں کی طرح جامِ مے کشاں گردش میں ہے
ہوں[3] وہ سرگشتہ کہ میرے عکس کی تاثیر سے
آئنہ آنکھوں پھر گرداب ساں گردش میں ہے
تو وہ ماہِ مصر خوبی ہے کہ تیرے عشق[4] میں
مدتوں سے اختروں کا کارواں گردش میں ہے

۱-۲- یہ اشعار نسخہ مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخہ مطبع مجیدی میں موخر ہیں -

۳- یہ شعر نسخہ مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخہ مطبع مجیدی میں مقدم ہے -

۴- نسخہ مصطفائی طبع اول و دوم - نسخہ مطبع مجیدی :
"تو وہ ماہِ مصر خوبی ہے کہ تیرے شوق میں"

ہے قرار ایسا ہوا اُس دورِ خط کو دیکھ کر
ہالۂ مہ ، شعلۂ جوّالہ ساں گردش میں ہے
کیا ہی مضموں خیز ہے دورِ خطِ مشکیں ترا[1]
رات دن یاں خامۂ عنبر نشاں گردش میں ہے
ہے طلب میں دشت دشت آوارہ مثلِ گرد باد
بعدِ مردن بھی غبارِ عاشقاں گردش میں ہے
سعی سے فارغ نہیں ، ہرچند ہوں سیر اہلِ حرص
ہے دہن لبریز نعمت سے ، زباں گردش میں ہے
یہ نشاں ہے لاسخِ سرگشتہ کے ویرانے کا
آسیا کی طرح سنگِ آستاں گردش میں ہے

۲۵۸

چہرہ ہوا ہے غیرتِ گل ، آفتاب سے
خوشبو میں ہے زیادہ پسینا گلاب سے
اس روئے آتشیں نے دیا ہے یہ داغِ دل
روشن ہوا چراغ مرا آفتاب سے
ہم بوسہ مانگتے ہیں ، وہ کچھ بولتے نہیں
محروم ہے سوال ہمارا جواب سے
دم میں تمام دامنِ صحرا محیط ہو
سرکے جو آستیں ابھی چشمِ پُرآب سے
جینا فراق کا نہیں ہرگز حساب میں
مدت ہوئی کہ مر چکے ہیں ہم حساب سے

۱۔ مصطفائی اول و دوم :
''کیا ہی مضموں خیز ہے دور خط مشکینِ یار''
نسخۂ مطبعِ مجیدی : ''دور خطِ مشکینِ مار'' ۔

۲۶۵

دربانِ حسن گر وہ پری رو نہیں دلا
پھر کیوں یہ سینے پر ہیں عیاں دو حباب سے
خط ہے جو گردِ عارضِ جاناں عجب نہیں
کیونکر نہ نکلیں خطِ شعاعِ آفتاب سے
کب تک غبارِ جسم سے آلودہ میں رہوں
کرتا ہوں غسل خنجرِ قاتل کی آب سے
کھا جائے بل کمر جو نزاکت سے، ڈر نہیں
رسّی[1] کی طرح ہوگی قوی پیچ و تاب سے
کرتے تھے سیرِ مصحفِ رخ، زلف میں پھنسے
دشتِ خطا میں جا پڑے راہِ صواب سے
اس حال سے شفاعتِ ناسخ ہو حشر میں
امید ہے جنابِ رسالت مآب سے

۲۵۹

یہ جسمِ زار بے حرکت پیرہن میں ہے
سب مجھ کو جانتے ہیں کہ مردہ کفن میں ہے
فرقت قبول، رشک کے صدمے نہیں قبول
کیا آئیں ہم، رقیب تری انجمن میں ہے
آتا ہے لب کو شکوۂ داغِ فراق کیا
جائے زبانِ زبانۂ آتش دہن میں ہے
ہیں بے نصیب صحبتِ جاناں سے ایک ہم
پروانہ بزم میں ہے تو بلبل چمن میں ہے

۱- مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مہدی :
"رشتہ کی طرح ہوگی قوی پیچ و تاب سے"

آنکھیں ہوئیں سفید ترے انتظار میں
ہر شب یہ چاندنی مرے بیت الحزن میں ہے
بن جائیں عطر دان نہ کیوں گوشِ سامعیں
خوشبو نسیمِ خلد سی تیرے سخن میں ہے
مرہم کی بتی[1] بنتی ہے بتی چراغ کی
سوزش یہ آج تک مرے داغِ سخن میں ہے
سونا سوگند[2] کیوں نہ کہوں تجھ کو اے پری
رنگت سنہری اس پہ یہ خوشبو بدن میں ہے
دونوں کا کر چکا ہوں میں اے ناسخ امتحاں
سنّد میں مہر ہے، نہ وفا برہمن میں ہے

۲۶۰

لغزش اس وادی میں پائے خضر کو ہر گام ہے
نقشِ پا میرا شرابِ بے خودی کا جام ہے
رتبہ میری خانہ ویرانی کا ہے ایسا بلند
آسماں کہتے ہیں جس کو میرے گھر کا بام ہے
ہوگئی صبحِ شبِ وصل اس کے جاتے ہی سیاہ
آفتاب اپنی نظر میں اک چراغِ شام ہے
آگے وحشت شہر سے تھی، اب ہے دلیا سے گریز
تھا وہ آغازِ جنونِ عشق، یہ انجام ہے

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخہ مطبع ہدی :
"مرہم کی بٹی اتنی ہے بتی چراغ کی"

۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخہ مطبع ہدی : "سونا سگند کیوں نہ کہوں ۔"

جاں بلب ہوں پر نہیں صحت[1] کی مجھ کو آرزو
کیا مرض ہے عشق جس کے درد سے آرام ہے

بعدِ مردن کعبۂ مقصود کو پہنچیں گے ہم
کہتے ہیں جس کو حرم ، وہ کعبۂ احرام ہے

روز تیرا خط بنا کر قتل کرتا ہے ہمیں
کیا ہماری جان کو جلّاد یہ حجّام ہے

دیکھنا جالی کی ٹوپی میں رکھے ہیں اُس نے پھول
بلبلوں کے دام تھے ، اب یہ گلوں کا دام ہے

دیکھتا ہے جب نہ تب کڑوی نگاہوں سے مجھے
چشمِ قاتل ہے کہ کوئی تلخ یہ بادام ہے

جب میں ناکام اُس سے کہتا ہوں کہ ہو جا میرے پاس
ہنس کے کہتا ہے ضرور اس دم مجھے کچھ کام ہے

کوچہ و بازار میں کہتے ہیں مجھ کو دیکھ کر
ہے یہی آتش زباں ، **ناسخ** اسی کا نام ہے

۲۶۱

شق کروں سینے کو ، تا داغ نمایاں ہووے
ایسے خورشید سے صبحِ شبِ ہجراں ہووے

راز کا چاہیے عاشق کو چھپانا ایسا
دل میں ہو ذکرِ صنم ، ہاتھ میں قرآں ہووے

گر کوئی لعلِ لبِ یار کی تعریف لکھے
نام اُس کا وہیں یاقوت رقم خاں ہووے

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہندی :
"جاں بلب ہوں پر نہیں صحت کی مجھ کو آرزو"

کعبے سے قبلہ نما کا نہیں پھرتا کبھی منہ
کاش اس مرغ کی تقلید میں انساں ہووے

کیوں نہ دیواروں سے ٹکراتی پھرے سرکو نسیم
اس روش سے جو تو گلشن میں خراماں ہووے

سرخرو گل کی روش تب ہوں میں دیوانوں میں
پاؤں میں خار چبھیں، چاک گریباں ہووے

کب سے یہ دل میں تمنا ہے کہ تو قتل کرے
ہاتھ میں میرے ترا گوشۂ داماں ہووے

آمدِ مہدی و عیسیٰ ہے قریب اے **ناسخ**
کہہ دے اب قومِ نصاریٰ کو مسلماں ہووے

۲۶۲

گر تری تابِ کمر کرتی ہے بے تاب مجھے
خواب آلودہ لگہ رکھتی ہے بے خواب مجھے

مست ہوں مارے خوشی کے میں شرابی سے زیاد
ہاتھ سے اپنے جو تو دے قدحِ آب مجھے

کوئی ایسا نہیں دنیا میں ہوا ہجر نصیب
روز پروانہ ملا ہے شبِ سرخاب مجھے

چشمِ جاناں ہے تصور میں کنول کے بدلے
عوض آنکھوں کے خدا نے دیے تالاب مجھے

بعدِ مردن بھی رہائی نہیں ممکن اس سے
ہو گیا چاہِ ذقن حلقۂ گرداب مجھے

سجدے میں کرنے لگا جان کے ابرو تیرے
کسی مسجد کے نظر آئے جو محراب مجھے

ساتھ خیمہ بھی نہیں چاہیے مانندِ حباب
چھوڑ جانا ہے یہیں اپنا سب اسباب مجھے

زلفِ جاناں کے یہ سودے میں میں آوارہ ہوں
حلقۂ مار ہوا حلقۂ احباب مجھے

شمع ساں محفلِ عالم میں ہوں میں شب بیدار
تار رونے کا ملا جانے رگِ خواب مجھے

جوشِ گریہ سے ہے زنداں میں گلے تک پانی
دوسرا طوق ہوا حلقۂ گرداب مجھے

واعظا غم نہیں دوزخ کی گرفتاری کا
بے قراری نے دیا عالمِ سیماب مجھے

پیاس میں یاد جو شبیرؑ کی آئی ناسخ
گھونٹ کیونکر نہ لہو کے ہوں دمِ آب مجھے

۲۶۳

کچھ عدم کا بھی خیال اے دل تجھے یاں چاہیے
گو عزیزِ مصر ہے، پر یادِ کنعاں چاہیے

کوچۂ دل دار کی حسرت میں رونے کے لیے
پاؤں کو اب آبلے کی چشمِ گریاں چاہیے

حشر برپا کر رہی ہے ناقۂ لیلیٰ کی چال
صورِ اسرافیل اب جائے حُدی خواں چاہیے

چاک رکھتا ہوں جو وحشت میں گریباں مثلِ صبح
اک پری رُو غیرتِ خورشیدِ تاباں چاہیے

غل مری زنجیر کا پہنچا تو وہ کہنے لگا
خانۂ زنجیر کو بھی اب نگہباں چاہیے

میرے غل میں رو کے عالم کو کرے گا اب وہ قتل
اشک کیسے ناوکِ مژگاں کو پیکاں چاہیے

ہوں وہ مجنوں عہدِ طفلی میں مجھے کہتے تھے لوگ
گوشۂ زنداں اسے جائے دبستاں چاہیے

استلامِ سنگِ اسود سے مجھے کیا زاہدا
بوسۂ خالِ تہِ ابروئے جاناں چاہیے

دم بدم کہتی ہے میری کشتیٔ عمرِ رواں
مجھ کو آبِ خنجرِ قاتل کا طوفاں چاہیے

آ گیا پیری میں اس کے بوسۂ لب کا خیال
ہونٹ کاٹوں کس طرح حسرت سے دنداں چاہیے

پنجۂ خورشید کو کافی ہے اک جیبِ سحر
روز یاں دستِ جنوں کو سو گریباں چاہیے

حسرتِ نظارۂ زلفِ پریشاں دل میں ہے
بہرِ تسکیں گور میں کچھ مارِ پیچاں چاہیے

عمر گذری روتے روتے ہنس بھی لوں اب جی میں ہے
میرے منہ پر کوئی قاتل زخمِ خنداں چاہیے

دردِ مژگاں کی زباں سے ہیں لبِ جاناں کے وصف
اشک خوں کی چشم کو تسبیحِ مرجاں چاہیے

سنگ ریزے لے چلوں چن چن کے بہرِ کودکاں
عاریت اے کوہ مجھ وحشی کو داماں چاہیے

روحِ سعدی ہوگئی ہوگی خوشی سے باغ باغ
آج پڑھنے کے لیے اس کو "گلستاں" چاہیے

طالب دنیا مونث ہیں۔ بھلا کیا ان سے کام
مرد ہے ناسخ تو، عشق شاہ مرداں چاہیے[۱]

۲۶۴

ظلم جو کرتا ہے تو، ڈرتا نہیں انجام سے
روسیہ ہوتا[۲] ہے اک دن خط عنبر فام سے

شوق ہم دیوانوں کو بالا نشینی کا نہیں
کیا تعلق خانۂ زنجیر کو ہے بام سے

کل شب فرقت نہ ہوتی تھی کسی صورت سے صبح
وصل ہے، خورشید ہوگا آج طالع شام سے

ہے ازل کے روز سے برہم ہماری بزم عیش
لی ہے مینائے فلک نے گردش اپنے جام سے

کیا شب فرقت کے صدموں سے ہے نسبت موت کو
مر گیا ہے جو کوئی، سوتا ہے وہ آرام سے

صید لاغر ہوں مگر تکبیر پہنچا دے مجھے
مرغ روح آزاد ہو جائے رگوں کے دام سے

گرچہ یہ پیغام بر عیسائی پیغمبر نہیں
جان میں جان آ گئی پر وصل کے پیغام سے

اس کے ہم عاشق ہیں جو باتیں خوشامد کی کرے
صاحب غیرت کو ناسخ کام کیا دشنام سے

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجیدی: ''مرد ہے ناسخ کو''۔

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجیدی: ''روسیہ ہوتا ہے اک دن''۔

۲۶۵

اے شیخ و گبر سبحہ زنّار توڑیے
پر دل کسی بشر کا نہ زنہار توڑیے

پیرِ[1] مغاں کو جی میں ہے کعبہ بنایے
بت نشۂ شراب میں دو چار توڑیے

چہرے پہ خط ہوا ہے برنگِ سپر سیاہ
بس اب تو اپنے ناز کی تلوار توڑیے

برسوں دہانِ زخم سے ہنستے رہے ہیں ہم
اک عمر رونے کا بھی نہ اب تار توڑیے

آیا مہِ صیام ، علی الرغمِ محتسب
روزے شراب سے سرِ بازار توڑیے

ہم وحشیوں کے پاؤں کو کانٹوں سے کیا ہے اُنس
ہاتھوں سے بھی گلوں کے عوض خار توڑیے

ہے کس کو فہم زمزمہ ہائے صریر کا
بس عندلیب کلک کی منقار توڑیے

یاروں کی ہم سے دل شکنی ہو سکے کہاں
ہاں پاس ہے نہ خاطرِ اغیار توڑیے

خرمہرے سے بھی گوہرِ مضموں کی کم ہے قدر
وہ وقت ہے کہ کلکِ گہر بار توڑیے

ہم جورِ چشمِ یار سے دم مارتے نہیں
یعنی روا ہے کب دلِ بیمار توڑیے

۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجتبائی:
"دیر مغاں کو جی میں ہے کعبہ بنالیے"

یاں دردِ سر خمار سے ہے واں دکاں بند
ٹکرا کے سر کو اب درِ خمار توڑیے

ٹکراؤں واں جو سر تو وہ کہتا ہے کیا مجھے
صاحب! نہ مجھ غریب کی دیوار توڑیے

دم توڑنا ہے فرقتِ جاناں میں اپنا کام
کچھ کوہکن نہیں ہیں جو کہسار توڑیے

ناسخ بقولِ افصحِ ہندوستاں کبھی
زاہد کا دل، نہ خانہ[1] خمّار توڑیے

۲۶۶

روز مرگِ آرزو ہے تا بکے غم کیجیے
تا کجا دستِ دعا کو وقفِ ماتم کیجیے

حسنِ گندم گوں پہ ہے یہ خالہ بربادی بجا
ابنِ آدم ہیں نہ کیوں تقلیدِ آدم کیجیے

یاں چراغِ زندگی روشن ہے سوزِ داغ سے
امتحاں کو پہلے عیسیٰ شمع پر دم کیجیے

جو بخیلوں سے ملا وہ قابلِ ایثار ہے
داغِ حسرت کو چراغِ گورِ حاتم کیجیے

میکدے میں دیکھیے چل کر طلسماتِ جہاں
موجِ مے کو آج خطِّ ساغرِ جم کیجیے

نام رہ جاتا ہے دنیا میں تواضع کے سبب
اپنے[2] قامت کو خمیدہ مثلِ خاتم کیجیے

۱۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع بھدی: "خاطر میخوار"۔
۲۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع بھدی: "اپنی قامت کو خمیدہ"۔

ہر طرف مصروف زاہد ہیں نمازِ صبح میں
گردنِ مینا کو بھی لازم ہے اب خم کیجیے

زہد و استغنا و حلم و صبر چاروں ہیں وزیر
انتظامِ ملکِ ابراہیم ادہم کیجیے

جذبۂ معشوق سے افتادگی ہے بال و پر
کیوں نہ حسرت کی نگاہیں سوئے شبنم کیجیے

دوستی وہ ہے نہ ہو جس میں غرض کا شائبہ
روزِ روشن میں چراغِ مردہ کا غم کیجیے

چاکِ در کے بند کرنے کا تو ہے شوق آپ کو
سینہ چاکوں کے لیے بھی فکرِ مرہم کیجیے

ہوتی ہے کوتاہ شب آتی ہے جب فصلِ بہار
ہے بہارِ سبزۂ خط زلف کو کم کیجیے

خالِ ناسخ کی پریشانی سے کیا نسبت اسے
آپ اپنی زلف کو کتنا ہی برہم کیجیے

۲٦۷

ایک دل مجنوں ہے جس کی لاکھ جا تدبیر ہے
جس پری کی آنکھ ہے اک حلقۂ زنجیر ہے

مارتے ہیں حد افاقہ مست کو ہوتا ہے جب
یعنی اس کے ہوش میں آنے کی یہ تعزیر ہے

عاشقوں کی طرح تو اس کو مٹا دے سو بخیر
یہ خطِ رخسار ظالم کاتبۂ تقدیر ہے

کوچہ ہائے زخمِ دل تیری تجلی گھر میں[۱]
داغ جو سینے میں ہے اُس میں تری تصویر ہے

شاخِ گل ہے قد و قامت، برگِ گل رخسارِ یار
خندۂ گل جنبشِ لب، بوئے گل تقریر ہے

ہو گئی ہیں انتظارِ یار میں آنکھیں سفید
سادے کاغذ میں حقیقت نامہ بر[۲] تحریر ہے

کوئی کچھ کہتا ہے دنیا میں کوئی کہتا ہے کچھ
معنیِ اشعارِ مہمل خواب کی تعبیر ہے

ابروے جاناں میں اور کعبے میں ظاہر ہے یہ فرق
یہ خدا کی ہے بنا، وہ بندے کی تعمیر ہے

جسم ایسا ہو گیا لاغر بہارا ان دنوں
طوق کے بدلے گلے میں حلقۂ زنجیر ہے

آپ کو جو دور کھینچے بے حقیقت ہے دلا
دیکھ لے[۳] سوئے فلک قوسِ قزح بے تیر ہے

ہاتھ سے اُس قاتلِ عالم کے کیونکر جی بچے
جس کا ہر ناخن بریدہ غیرتِ شمشیر ہے

ہوں میں ایسا کوہکن جس کا فلک ہے بے ستوں
کہکشاں کہتے ہیں جس کو میری جوئے شیر ہے

زیرِ آں مژگاں کو جز ابرو نہ کوئی کر سکا
برچھیوں پر آئے جو غالب یہی شمشیر ہے

۱۔ نسخۂ مطبع مجدی:
"کوچہ ہائے زخمِ دل تیری تجلی گہ ہیں"
۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی: "حقیقت نامہ تحریر ہے"۔
۳۔ مصطفائی طبع اول: "دیکھ تو سوئے فلک"۔

خط وہاں نکلا دلِ بے تاب کو آیا قرار
پارہ کیوں قائم نہ ہو، بوٹی ہی با تاثیر ہے

سانس لے سکتا تھا وہ مجھ ناتواں میں دم نہیں
کیوں نہ سب مجھ کو کہیں مجنوں کی یہ تصویر ہے

ناتوانی میری وہ پوچھے تو کہیو قاصدا
یہ ترا موئے کمر **ناسخ** کی بس تصویر ہے

۲۶۸

نہ چھٹے بعدِ فنا کوچۂ جاناں ہم سے
یا رب آباد نہ ہو روضۂ رضواں ہم سے

ایسے رسوا ہوئے ملنے سے پری زادوں کے
متوحش نظر آتے ہیں سب انساں ہم سے

ہے مثل سچ، کبھی کام آتا ہے کھوٹا پیسہ
صنمِ دیر ہوئے طالبِ ایماں ہم سے

غمِ فرقت میں ہوئے سوکھ کے کانٹا ایسے
اپنے دامن کو بچاتے ہیں بیاباں ہم سے

کاٹتا ہے وہ دلا پیار سے ہردم ہم کو
عشق رکھتا ہے سگِ کوچۂ جاناں ہم سے

بتِ ہستی کو جو توڑیں تو خدا آئے نظر
آتشِ سنگ کی صورت ہے وہ[۱] پنہاں ہم سے

اس لیے تعزیہ خانوں سے ہے کافر کو گریز
کہ مشابہ ہے[۲] بہت سروِ چراغاں ہم سے

۱۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع ہدی:
"آتش سنگ کی صورت وہ ہے پنہاں ہم سے"
۲۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع ہدی: "کہ مشابہ ہیں"۔

لفظ رنگیں میں یہ ہیں معنئ روشن پنہاں
ہو سکا بس یہی وصفِ لب و دندان ہم سے

ضعف نے طاقتِ رفتار ہی کھو دی ناسخ
آتش جب کرنے لگا یار کا درباں ہم سے

۲۶۹

عشقِ بلبل ہے جہاں یہ خار واں درکار ہے
گلشنِ تصویر کو کب باغباں درکار ہے

ہے طلب میرے دلِ نالاں کی زلفِ یار کو
خانۂ زنجیر کو بھی پاسباں درکار ہے

آشنائے فقر پہلے کرتے ہیں ترکِ ہوا
کشتئ درویش کو کب بادباں درکار ہے

کر رہا ہے خانقہ تعمیر جو اب شیخِ شہر
کیا اُسے ایماں فروشی کو دکاں درکار ہے ؟

لے چلی دنیا سے مجھ آتش نفس کو جو قضا
باغِ جنت کو مگر بادِ خزاں درکار ہے

ہے بجا تعمیر کرتا ہے جو وہ قصرِ بلند
ہے سراپا چاند اُس کو آسماں درکار ہے

شکر تیغِ یار نے حد زیست کا عرصہ ہے تنگ
ہر دہانِ زخم میں مجھ کو زباں درکار ہے

شمع ساں جلتا ہے حسرت سے مرا ہر استخواں
کیا سگِ جاناں کو کوئی استخواں درکار ہے

کام کیا ہے جوہروں سے گردشِ افلاک کو
واقعی کیا تیغِ چوبیں کو فساں درکار ہے

حسن کے عالم میں کچھ اسباب کی حاجت نہیں
چشمِ گویائی صنم کو کیا زباں درکار ہے

عذر ہے مجھ کو جو مجھ سے بات وہ کرتا نہیں
دل میں باتیں پیار کی ہیں ، پر دہاں درکار ہے

کون سا جاں دار تیرے عشق میں نالاں نہیں
بہرِ نالہ مچھلیوں کو بھی زباں درکار ہے

باغِ عالم میں نہیں ہے جز دلِ صد چاک گل
یاں سوا اشکوں کے کب آبِ رواں درکار ہے

ہے لبِ دلدار کو[1] قلیاں کشی کی آرزو
آتشِ یاقوت کو گویا دھؤاں درکار ہے

ہے ارادہ بیٹھ رہیے جا کے کوئے یار میں
جیتے جی ناسخ مجھے سیرِ جناں درکار ہے

۲۷۰

نہ پتھر[2] سے فقط دامانِ طفلاں ہو گئے خالی
مرے سر پر تو کہساروں کے داماں ہو گئے خالی

مرے زخموں کی وہ تدبیر سے اک دم نہیں غافل
منگائے مشک نافے گر نمک داں ہو گئے خالی

مری دیوانگی کا ان دنوں ہے شور گلیوں میں
معلّم رہ گئے تنہا ، دبستاں ہو گئے خالی

۱۔ قلیاں کشی : (ف) مؤنث ۔ حقہ پینا ۔ (نوراللغات ، جلد سوم ، ص ۶۶۱)۔
۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجیدی : ”نہ پتھروں سے“۔

ترا کوچہ وہ گلشن ہے کہ جس کے شوق میں اے گل[1]
جہاں میں عندلیبوں سے گلستاں ہو گئے خالی

عبث ان غافلوں کو رات دن فکرِ عمارت ہے
کریں عبرت کہ کیا کیا قصر و ایواں ہو گئے خالی

ہزاروں بے گناہوں کا ہوا خوں، کچھ نہیں پروا
ہوا قاتل کو غم اس کا کہ زنداں ہو گئے خالی

صدف کی طرح تب منہ ہم نے کھولا تشنہ کامی سے
برس کر جب کہ سارے ابرِ نیساں ہو گئے خالی

جِلانے ٹھوکروں سے اس قدر مُردے کہ ان روزوں
ترے اعجاز سے شہرِ خموشاں ہو گئے خالی

قلم اتنے ہوئے فرسودہ خطِ شوق لکھنے میں
کہ کلکوں سے نیستاں کے نیستاں ہو گئے خالی

مرے نالوں نے کی صحرا میں جس دم شعلہ افشانی
وہیں شیروں سے اے ناسخ نیستاں ہو گئے خالی

۲۷۱

کیوں ہو گیا دوچار میں اُس شہ سوار سے
جاتی رہی عنانِ شکیب اختیار سے

نخلِ بریدہ ہوں مجھے کیا برگ و بار سے
شاخِ شکستہ ہوں، نہیں مطلب بہار سے

چشمے رواں ہوئے مژۂ اشک بار سے
رتبے میں کاہ کم نہیں یاں کوہسار سے

۱- مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع ہندی:
"ترا وہ کوچہ گلشن ہے کہ اُس کے شوق میں اے گل"

آتی ہے بوئے گل دہن[1] داغ دار سے
آج اے نسیم آتی ہے کیا کوئے یار سے

برپا ہوا ہے حشر جو رفتارِ یار سے
روشن ہے آفتابِ قیامت عذار سے

محو خیالِ عارضِ تاباں ہوں اس قدر
آئینہ آفتاب ہو میرے غبار سے

منہ کھولتا ہوں میں کہ پلادے[2] کوئی شراب
ہر دم جماہیاں نہیں لیتا خمار سے

عریانی میں ہے چادر آب اپنے جسم پر
سیکھے ہیں طرز رونے کا[3] ہم آبشار سے

ہر ایک کی صدائے قدم روندتی ہے دل
بہتر ہے ہم کو یاس ترے انتظار سے

یوں روسیاہ عشق سے ہوتے ہیں سرخرو
باروت جیسے بنتی ہے شعلہ شرار سے

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مہدی :
"آتی ہے بوئے گل بدنِ داغدار سے"

۲۔ نسخۂ مطبع مہدی :
"منہ کھولتا ہوں میں کہ پلاوے کوئی شراب"

۳۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مہدی :
"سیکھے ہیں طرز رونے کی ہم آبشار سے"

طرز : تذکیر و تانیث مختلف فیہ ۔ ترجیح مذکتر کو ہے :

نہیں ملتا کسی مضموں میں ہمارا مضموں
طرز اپنا ہے جدا سب سے جدا کہتے ہیں (داغ)

زلف کے مانند کنگن نے ترے بیداد کی
طرز ہے شاگرد میں بھی ٹھیک ٹھیک استاد کی (امیر)

چھلنی کی طرح داغ ہیں! جزوِ بدن نہیں
تلووں کو بھی ہے ربط بیاباں میں خار سے

موہائے تاب دار میں اک موئے تابدار
کیونکر کمر نہ الجھی رہے زلفِ یار سے

کھلوائی فصد یار نے، میں قتل ہو گیا
کم تھی لہو کی دھار نہ خنجر کی دھار سے

مٹی مری عزیز ہوئی بارے خاک کو
کیا گور نے بغل میں لیا مجھ کو پیار سے

اس گل کے دیکھتے ہی مرا رنگ اڑ گیا
آئی خزاں یہ میرے چمن میں بہار سے

وہ کان تک تو یہ ہے دلِ یار تک رسا
آنسو زیادہ ہیں گہرِ آب دار سے

ہے ساتھ ایسی آتشِ غم، بعدِ مرگ بھی
دامن صبا بچاتی ہے میرے غبار سے

نقشِ وجود محو ہوا مثلِ نقشِ پا
نکلے نہ بعدِ مرگ بھی ہم کوئے یار سے

جلتے ہیں سوزِ غم سے مرے استخواں[2] آج
پروانہ کیا جلا کوئی شمعِ مزار سے

اے چشمِ تر تصورِ ابروئے یار بالدھ
قوسِ قزح نمود ہو ابرِ بہار سے

دستِ تہی ہیں سوختنی زیرِ آسماں
کیونکر نہ نکلے آتشِ حسرت چنار سے

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی : "چھلنی کی طرح داغ ہے" ۔
۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی : "مرے استخواں جو آج" ۔

ناسخ یہ وہ غزل ہے جنوں زا کہ سنتے ہی
سودا کفن کو پھاڑ کے نکلے مزار سے

۲۷۲

ہم صفیر اس باغ کی کیسی ہوا ناساز ہے
طائرِ رنگِ چمن تک مائلِ پرواز ہے

بیشتر سبزے کی ہوتی ہے نمو بالائے چاہ
ہے بجا خط کا زنخداں پر اگر آغاز ہے

ہیں روانہ کوئے قاتل سے عدم کو قافلے
بسملوں کی ہچکیوں میں زنگ[۱] کی آواز ہے

آسماں پر دل فرشتوں کے ملے جاتے ہیں آج
یہ زمیں پر پاؤں رکھنے کا نیا انداز ہے

کچھ رقیبوں کی عداوت سے نہیں دہشت مجھے
نالہ برق انداز ہے ، اور آہ تیر انداز ہے

دم نکلتا ہے مرا ہر عاشق و معشوق پر
گل میں تیرا رنگ بلبل ، میں تری آواز ہے

فصلِ گل ہے چار دن ، ایامِ توبہ ہیں مدام
عمر بھر اے میکشو بابِ اجابت باز ہے

ساتھ ہے داغِ جنوں کے مرہمِ زنگار بھی
ہاں ہے آغازِ جنوں واں سبزے کا آغاز ہے

جس کو آنکھوں نے کبھی دیکھا نہ کانوں نے سنا
ہے دہانِ تنگ اُس کا اور اپنا راز ہے

۱- زنگ : گھنٹی - گھنگھرو - (فرہنگ آصفیہ ، جلد دوم ، ص ۱۰۳) -

ابر ہے اُس ابرِ رحمت کی سواری کا غبار
رعد بھی اس کے جلو میں ایک برق انداز ہے
کر گیا ہے کون صیّاد آج گلگشتِ چمن
دیدۂ بلبل میں ہر گل چنگلِ شہباز ہے
سنتے ہی مطرب بجانے لگتے ہیں جو تالیاں
نعرۂ صوفی بھی گویا چغد کی آواز ہے
سرمگیں آنکھیں ہزاروں مل گئی ہیں خاک میں
جو زباں ہے خار کی صحرا میں بے آواز ہے
چونک اٹھے خوابِ لحد سے سن کے سودا یہ غزل
شاعری ہرگز نہیں ناسخ، فقط اعجاز ہے

۲۷۳

شعر لکھنے میں جو یاد اُس کا خرامِ ناز ہے
کلک میں جانے صریر اب صور کی آواز ہے
نور افشاں اس قدر اُس کا خرامِ ناز ہے
چادرِ مہتاب گویا فرشِ پا انداز ہے
بات جو میرے مسیحا کی ہے اک اعجاز ہے
جان آ جائے تنِ بے جاں میں، وہ آواز ہے
جوششِ سودا میں بھی پوشیدہ اپنا راز ہے
مثلِ زلفِ یار یاں زنجیر بے آواز ہے
اُس سہی قد کو خراماں دیکھ کر کہتی ہے خلق
سرو چلتا ہے یہ دیکھو حسن کا اعجاز ہے
چھوٹ کر اڑ جائیے اب کیونکر کہ دستِ نازنیں
طائرِ رنگِ حنا کو چنگلِ شہباز ہے

کر دیا تھا جس طرح موسیٰ نے پانی کو لہو
خوں ہوئی ہے مے یہ ہجرِ یار کا اعجاز ہے

زاہدا کیا ڈھونڈھتا پھرتا ہے کعبے کی کلید
آ، درِ مے خانہ، مثلِ بابِ توبہ باز ہے

جب لگا دی آگ غم نے رقص خوش حالی کیا
یہ دلِ پُرداغ کیا طاؤس آتش باز ہے

سوچ ہے جب سے[1] کبوتر لے گیا ہے خطِ شوق
کوئے جاناں میں رقیب اپنا کبوتر باز ہے

مثلِ صحرا انتظارِ میلِ غم میں رات دن
چار جانب سے درِ ویرانۂ دل باز ہے

لکھتے ہی اڑتے[2] ہیں اطرافِ جہاں میں اپنے شعر
طائرِ معنی کو کاغذ شہپرِ پرواز ہے

اڑ چلا کیا ایک تیرے سامنے رنگِ چمن
گل کو بھی ہر برگِ گل اک شہپرِ پرواز ہے

جلوۂ معشوق کے باعث ہیں عاشق آپ ہی
آتشِ گل بلبلوں کا شعلۂ آواز ہے

دیکھ آنکھوں سے اٹھا کر پردۂ تارِ نظر
گر صدائے نغمہ ہے معشوق، عاشق ساز ہے

اٹھ گئی جب سے دوئی ناسخ کو کہتا ہوں یہی
آپ ہی شاہد ہے، آپ ہی[3] رندِ شاہد باز ہے

۱۔ نسخۂ مطبع مھدی: ”سوچ ہے جیسے“۔
۲۔ مصطفائی طبع اول: ”لکھتے ہی پھرتے ہیں“۔
۳۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مھدی:
”آپ ہی شاہد ہے آپ رندِ شاہد باز ہے“

۲۷۲

جسم کو جی ہے گراں ، سینے کو ہے دل بھاری
ہے وہ درپیش مجھے عشق کی منزل بھاری

اہلِ غفلت کا ہے ہر جزوِ بدن تک دشمن
ہاتھ بھی خواب میں ہے سینے کو اک سل بھاری

جو گیا سایۂ دیوار میں ، دیوانہ بنا
اس پری رو کی گلی سمجھے ہیں عامل بھاری

یہ درائے دلِ نالاں سے صدا آتی ہے
ناقۂ روح کو ہے جسم کا محمل بھاری

سر کے جز پنجۂ خورشیدِ قیامت لیں کبھی
کیا مری رات ہے بے حور شمائل بھاری

اے دلِ زار نہ ڈر کوہِ غمِ عشق سے تو
کہ اواخر ہے سبک ، اور اوائل بھاری

سحر پیدا جو ترے چاہِ زنخداں سے ہوئی
رکھ دیا سنگ بروئے چہِ بابل بھاری

سرخ چہرہ نظر آتا ہے اسی باعث سے
عارضِ نازکِ جاناں کو ہوا تل بھاری

باوقاروں کی بھی صحبت میں سبک ہیں بے وقر
ہو سکے کوہِ گراں کا نہ کبھی ظل بھاری

قیدِ غفلت میں بھلا قطع ہو کیا راہِ طلب
پاؤں میں خوابِ گراں کی ہے سلاسل بھاری

۱۔ مصطفائی اول و دوم :
"ہاتھ بھی خواب میں ہے سینے کو اک غل بھاری"

رنج ہے گیسوئے جاناں کو ہجومِ دل سے
شاخِ سنبل کی تو نازک ہے عنادل بھاری

بارِ غم بحرِ محبت کے شناور کو نہیں
دھارے میں ہلکی ہے کشتی لبِ ساحل بھاری

جو گراں آج سمجھے ماہ کو گرمی سے نقاب
کیا ہی تجھ پر ہے یہ رات اسے مہِ کامل بھلوی

نہ سنا پر نہ سنا کیا ہی گراں گوش ہے[1] گل
ہو گئی نالوں سے آوازِ عنادل بھاری

خفت اس درجہ اٹھائی ہے سیہ کاری سے
کہ مرے جہنم سے ہے دانہ فلفل بھاری

گرچہ ہے فکرِ سخن خاطرِ ناسخ کو گراں
لاکھ[2] پر بھی تو ہے یہ شاعرِ کامل بھاری

۲۷۵

مائل سوئے مسجود یہ تیرے حضور ہے
ہو میرا ورنہ یار بہت پُر غرور ہے

ہے فرق اس کی صورت و سیرت میں اس قدر
باطن میں ہے وہ نار تو ظاہر میں نور ہے

مجھ کو تو یار سے ہے ہم آغوشی کا خیال
وا میرے اشتیاق میں آغوشِ گور ہے

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخہ مطبع بھدی : "گراں گوش ہیں گل"۔
۲- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخہ مطبع بھدی :
"لاکھ پر تو بھی ہے یہ شاعر کامل بھاری"

آیا ہے رزق ہاتھ فلک سے یہی مجھے
ہے داغ نان، سینۂ سوزاں تنور ہے

کمخاب کی قبا ہے سراپا جسمِ داغ دار
سرما میں موئے سر بھی کلاہِ سمور ہے

چشمِ خیال میں ہے دہان و میانِ یار
ان روزوں علمِ غیب پہ مجھ کو عبور ہے

خورشید کی تلاش ہے نصف النہار میں
وہ بے حضور تو ہی دلا بے حضور ہے

ٹھوکر لگا کے چلتے ہیں جس کھوپڑی کو لوگ
کس بادشاہ کا یہ سرِ پُر غرور ہے

ہیں[1] بیت ہی میں معنیٔ نیت خیال بند
نزدیک ہے[2] بہت جسے سمجھیں ہیں دور ہے

دے گا غمِ فراق مجھے بعدِ وصلِ یار
اے آسمان یہ بھی ترا ایک زور ہے

معشوق سے ہے دل کے عوض طالبِ وفا
ناسخ بھی عاشقوں میں بڑا بے شعور ہے

۲۷۶

کر گیا ہے مری آغوش کو جاناں خالی
اس مہینے کو بجا کہتے ہیں انساں خالی

بارہا ہو گئے لالے سے بیاباں خالی
نہ کبھی داغ سے پایا دلِ نالاں خالی

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی : "ہے بیت ہی میں"۔
۲۔ نسخۂ مطبع ہدی : "نزدیک ہیں بہت جسے سمجھے ہیں دور ہے"۔

باغ میں سن کے مری زمزمہ پردازی کو
آشیاں کر گئے مرغانِ خوش الحاں خالی

ہو گیا وصل میں لبریز مرا ساغرِ دل[1]
شیشۂ مے نہ ہوا تھا ابھی چنداں خالی

یہ لگی چاٹ مرے زخموں کو سیری نہ ہوئی
ہو گئے کتنے ہی قاتل کے نمک داں خالی

جان سے پہلے چلا مال مرا پیری میں
کر چکے[2] دُرجِ دہن کو دُرِ دنداں خالی

صاف ہوں خاک کدورت سے یہ دل ہائے خراب
کس طرح ریگِ رواں سے ہو بیاباں خالی

ایک چھوٹا تو ملی دوسرے کو قیدِ حیات
کبھی ہوتا نہیں یہ خانۂ زنداں خالی

کس قدر تشنۂ دیدار ہوئے ہیں سیراب
نظر آتا ہی نہیں[3] چاہِ زنخداں خالی

دیکھ سکتی نہیں کانٹے کی زباں تک شبنم
کیوں نہ ہو چشمۂ خورشیدِ درخشاں خالی

میں ہوں کیا چیز دلا خاک نشیں مور ضعیف
کر دیا موت نے اورنگِ سلیماں خالی

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مہدی :
''ہو گیا وصل میں لبریز مرا ساغرِ عمر''
۲- مصطفائی اول و دوم : ''کر چلے درج'' ۔
۳- مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مہدی :
''نظر آتا ہے ترا چاہِ زنخداں خالی''

روحیں جنّت کو گئیں جسم سوئے کوچۂ یار
دفن ہوتے ہی ہوئے[1] کنجِ شہیداں خالی

لعلِ لب خط کے نکلتے ہی ہوا ہے بے آب
خضر آیا تو ہوا چشمۂ حیواں خالی

قابلِ گوہرِ مقصود نہیں رنگیں طبع
عین دریا میں رہا پنجۂ مرجاں خالی

کون دونوں میں خدا جانے خدا کو ہو پسند
کفر بھی چاہیے، لازم نہیں ایماں خالی

خانۂ عاریتی میں جو درم بھرتے ہیں
عقل سے مجھ کو نظر آئے وہ انساں خالی

ہوئی میرے سرِ شوریدہ پہ آفت نازل
آج لڑکوں کو[2] نظر آتے ہیں داماں خالی

میرے آغوش سے تو صبحِ شبِ وصل چلا
رہ گیا ہالہ مرا اے مہِ تاباں خالی

یہ غبار اُن کو ہے ناسخ نہ ملا ایک گھڑی
صورتِ شیشۂ ساعت دلِ حیراں خالی

۲۷۷

اہلِ فنا کے ساتھ جو ہے سرفراز ہے
مردوں پہ بے سجود ہمیشہ نماز ہے

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : ''دفن ہوتے ہی ہوا'' ۔
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
''آجِ لڑکوں کے نظر آتے ہیں داماں خالی''

گرتا ہے سر کے بل وہی جو سرفراز ہے
واللہ گواہِ دعویٰ صادق غلط ہے

یہ مشتِ خاک تیرے جلو کی نیاز ہے
گر اے سمندِ ناز یہی ترک و تاز ہے

زنداں خیالِ یار میں عشرت سرا ہوا
نالہ مرا غنا ہے تو زنجیر ساز ہے

مجھ ناتواں سے گیسوئے جاناں کو ہے گریز
وہ مور ہوں کہ مار کو بھی احتراز ہے

کیونکر نہ ہو گریز زمرّد سے سانپ کو
آغازِ خط سے[1] رخصتِ زلفِ دراز ہے

دیکھی جہانِ عشق میں الٹی ہر ایک رسم
محمود[2] ہے غلام تو صاحب ایاز ہے

لالے کو ربط داغ سے ہے گل کو خار سے
دنیا میں جو حسین ہے بے امتیاز ہے

ہے آہِ سرد عشق بنا گوشِ یار میں
ہردم نسیمِ صبح کو یاں اہتزاز ہے

تارِ نفس ہے پاؤں میں ڈورا بندھا ہوا
صعوہ ہے مرغِ روح ، اجل شاہباز ہے

۱- مصطفائی طبع اول و دوم ـ نسخہ مطبع مجیدی :
"آغاز خط ہی رخصتِ زلفِ دراز ہے"
۲- مصطفائی طبع اول :
"یوسف بھی ہے غلام تو صاحب ایاز ہے" (کذا)

کھلتی نہیں ہے آنکھ لبِ جو تک شکار آئے
شوقِ مراقبے میں مرا[۱] شاہباز ہے

حیرت سی ہے طلسمِ جہاں دیکھ کر مجھے
شیشے یہ جس کے ہیں وہ کہاں شیشہ باز ہے

زنہار اختیار نہیں صلح و جنگ میں
عالم تمام بازیٔ شطرنج باز ہے

جب تک طلوع مشرقِ خم سے ہو آفتاب
اے میکشو یقیں ہے درِ توبہ باز ہے

ہیں داغ نانِ گرم تو آنسو ہیں آبِ سرد
آسودۂ معاش دلِ عشق باز ہے

آتا ہے رحم کافر و مومن کے حال پر
بت محوِ ناز ہے تو خدا بے نیاز ہے

روشن ہوا یہ محفلِ عالم میں شمع سے
پروانۂ سر نہیں جسے، وہ سرفراز ہے

ممکن نہیں ہے بے مے و معشوق زندگی
واعظ اب اضطرار میں سب کچھ جواز ہے

ہر عضو اس کے عضوِ دگر سے ہے منعکس
حیران بزمِ یار میں آئینہ ساز ہے

سب دولتوں پہ حسن کی دولت کو ہے شرف
محمود بادشاہ غلامِ ایاز ہے

جیتے ہیں ظلمتِ شبِ فرقت کو کرکے طے
کچھ خضر سے بھی ہماری عمر دراز ہے

۱۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع بھنی:
"شوقِ مراقبے میں ہر اک عنقا ہے"

۲۷۷

نامِ خدا لیا جو نکیرین کے حضور
سن کر بھی اے صنم مجھے اخفائے راز ہے
دعوے کے ساتھ یثرب و بطحا ہیں دو گواہ
لاسخ ازل سے بندۂ شاہِ حجاز ہے

۲۷۸

فریبِ غیر نے مجھ کو نکالا کوئے جاناں سے
کیا ابلیس نے آدم کو باہر باغِ رضواں سے
پھرے دل دور خط میں کیا لبِ جاں بخش جاناں سے
ملی ظلمت تو کیا ہم ہاتھ دھوئیں آبِ حیواں سے
میں وہ مجنوں ہوں پابندِ وفا جو قیدِ الفت میں
لگہ باہر نہ نکلی رخنۂ دیوارِ زنداں سے
نظر جب وہ پری آتا ہے تو کہتا ہے ہوش اپنا
بلند اس دم سری پرواز ہے تختِ سلیماں سے
چرا کر آنکھ ہم سے بھی نہ کیوں عالم گریزاں ہو
ہمارا جسمِ عریاں کم نہیں شمشیرِ عریاں سے
گنہگاروں کے تن سے جس طرح سے دم نکلتا ہے
نکلنا یوں ہوا مشکل ہمارا کوئے جاناں سے
جو اعلیٰ ہے سو اعلیٰ ہے جو ادنیٰ ہے سو ادنیٰ ہے
نہیں کچھ قدر سائے کی بڑھے[1] گو قدِ انساں سے
سریع السیر ہوں ایسا میں راہِ خاکساری میں
کہ آگے بڑھ گیا ہوں منزلوں ریگِ بیاباں سے

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع بھدی:
"نہیں کچھ قدر سایہ کی، بڑھا گو قدِ انساں سے"

ہوئی ہے چاک کیوں نہ آتے ہی فصلِ بہاری کے
قبائے گل مگر سی تھی مرے تارِ گریباں سے

کسی کا کب کوئی روزِ سیہ میں ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

گرا دیتے اگر اخوانِ یوسف اس میں یوسف کو
نکلنا تھا بہت مشکل ترے چاہِ زنخداں سے

گرے پڑتے ہیں پروانے ہزاروں رات بھر تجھ[1] پر
تشابہ ہے تنِ پُر داغ کو سروِ چراغاں سے

بسانِ ساحلِ دریا ہو مشکل چھوٹنا ناسخ
لپٹ جاؤں اگر میں کھول کر آغوشِ جاناں سے

۲۷۹

دو چار حزیں پہنچیں اگر اور بھی ہم سے
ہستی کی طرف منہ نہ کرے کوئی عدم سے

فرصت نہیں دم لینے کی اک طفل کے غم سے
معدوم کھلونے کی طرح حسِ ہوئی ہم سے

کیا ہوگی نگہبانیِ جاں فوج و حشم سے
ڈرنے کا نہیں پیکِ اجل طبل و علم سے

پاتا ہوں مضامین میں ہر نقشِ قدم سے
اس طفل نے کیا سیکھی ہے رفتار قلم سے

۱۔ مصطفائی اول ۔ نسخۂ مطبع بھدی :
"گرے پڑتے ہیں پروانے ہزاروں رات بھر مجھ پر"۔
مصطفائی طبع دوم : "ہزاروں رات بھر مجھ پر"۔

مضمون جو زلفِ یار کے لکھے ہیں نے قلم سے
لبریز بسانِ دہنِ مار ہے سم سے

ہر تارِ نفس رشتۂ دیگر ہے بجز شمع
پہنچا نہ کبھی رنج کسی کو مرے دم سے

شانہ نظر آتا نہیں گیسوئے پری میں
اس ناگ نے یہ ہاتھ نکالا ہے شکم سے

زاہد میں پڑھوں اس پہ جو نام اپنے صنم کا
خورشید ابھی ہوں تری تسبیح کے شمسے

امکان نہیں تا بہ ابد دخلِ خزاں کا
داغوں کے چمن کم نہیں گلزارِ ارم سے

گل پھولے ہیں میرے قلمِ فکر سے جیسے
یوں گل نہ شگفتہ ہوں کسی گل کے قلم سے

سکانِ خرابات ہیں مطلق متواضع
ثابت مژۂ نرگسِ میگوں کے ہے خم سے

وہ حسن ترا نامِ خدا ہے ترے آگے
نکلیں گے شرر بن کے عرق سنگِ صنم سے

رکھتا ہے فلک سر پہ بنا کر شفق اس کو
اڑتا ہے اگر رنگِ حنا تیرے قدم سے

سمجھے ہیں وطن کوچۂ جاناں کو جو وحشی
آزاد وہ ہیں اور حسینوں کے ستم سے

کیا دام میں زلفوں کے کوئی لا سکے اس[1] کو
رم کرتے ہیں صیاد غزالانِ حرم سے

۱- "ان کو" نسخۂ مطبع محمدی طبع ۱۲۵۸ھ - مصطفائی طبع اول و دوم -

ناسخ کو ہوتی یاس بتوں سے تو نہیں غم
محروم اے خدایا! تو نہ رکھ اپنے کرم سے

۲۸۰

مشتاق سب ہیں بدر سے افزوں ہلال کے
دنیا میں قدر داں نہیں صاحب کمال کے

مجنوں گیا جو مرقدِ لیلٰی پہ[۱] پھنس گیا
جالی نہیں مزار کی، حلقے ہیں جال کے

ظالم نہ اپنی آہ میں ہو گردباد کا
تودے ہمارے دل میں ہیں گردِ ملال کے

تارے سیاہ ہوتے ہیں تشبیہ کے لیے
مضموں ڈھونڈھتا ہوں اگر تیرے خال کے

مرنا قبول ہے[۲]، مجھے دنیا نہیں قبول
غمزے اٹھیں گے مجھ سے نہ اس پیرزال کے

ہمت نہیں اگر فلکِ دوں کو کیا ہے غم
یاں لب بھی[۳] آشنا نہیں حرفِ سوال کے

آنسو ٹپک پڑا جو کوئی بزمِ یار میں
دریا بہے[۴] مرے عرقِ انفعال کے

۱- مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع ہمدی:
"مجنوں گیا جو مرقدِ لیلیٰ میں پھنس گیا"

۲- مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع ہمدی:
"مرنا قبول ہے مجھے دنیا میں قبول"

۳- مصطفائی طبع اول و دوم۔ نسخۂ مطبع ہمدی: "یاں لب ہی آشنا"

۴- مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع ہمدی:
"دریا بھی میرے عرق ہونے انفعال کے ہیں"

گلشن میں مجھ کو دھیان جو صحرا کا آگیا
نرگس کے پھول بن گئے دیدے غزال کے

چھپتا ہوں جا کے کنج لحد میں شب فراق
تارے مجھے ڈراتے ہیں آنکھیں نکال کے

فرقت میں ہم کو مرنے بھی دیتا نہیں فلک
تا ہوں وصال پائیں نہ طالب وصال کے

آگے تری بہار کے یہ رنگ گل اڑا
ہیں دامن نسیم میں تودے گلال کے

کیا بار زلف ہے کمر یار پر وبال
اپنا اٹھائی کس نے نہ موذی کو پال کے

بے سایہ ضد سے چرخ نے اس کو کیا وہیں
ٹھہرا ہوں ایک دم میں تلے جس نہال کے

ڈر تھا اثر کا اس کو سو وہ بھی نکل گیا
نادم ہوا ہوں منہ سے میں نالہ نکال کے

ملتی ہے خاک سے کوئی دم میں ہماری خاک
یہ بھی وصال ہے جو گئے دن وصال کے

آرام کیا کہ جس سے ہو تکلیف اور کو
پھینکوں[۱] کبھی نہ پاؤں سے کانٹا نکال کے

ناسخ اٹھیں گے حشر میں وہ لوگ سرخ رو
دنیا میں جو محب ہیں پیمبر کی آل کے

۱- ''پھینکو'' مصطفائی اول و دوم، لکھنؤ، مطبع بھیی ۱۲۵۸ھ -

۲۸۱

جو ترے سامنے آ جائے وہ شیدا ہووے
تجھ کو خورشید اگر دیکھے تو حربا ہووے

کچھ تصرّف سے نہیں پیرِ مغاں کے یہ بعید
تاک اگر دانۂ تسبیح سے پیدا ہووے

متوجہ ہے سوئے اہلِ زمیں توسنِ ناز
ورنہ پامال ابھی عالمِ بالا ہووے

پوست کی طرح نہ چھوٹے ترے تن سے تو ٹھیک
میری تصویر اگر صورتِ دیبا ہووے

تیغِ قاتل سے تمنا ہے یہ زخموں کی مجھے
کہ ہر اک جزوِ بدن لایتجزیٰ ہووے

مے کشی کیا کروں بے یار کہ زخموں سے ابھی
ہے یقیں ساغرِ مے منبعِ دریا ہووے

یہ نزاکت ہے جو لگ جائے صبا کا لطمہ
گلِ رخسار ابھی اس کا گلِ رعنا ہووے

سر کٹا کر جو پسِ توسنِ قاتل دوڑوں
قتل گہ خلق کو اک جائے تماشا ہووے

دھیان ارسالِ خطِ شوق کا آیا جو مجھے
ہے یہ قسمت کہ کبوتر وہیں عنقا ہووے

تو وہ بت ہے جو تجھے ایک نظر دکھلاؤں[۱]
پیرِ ترسا ابھی ناقوسِ کلیسا ہووے

---

(۱) مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع لکھنؤ : "دکھلا دوں تجھے" ۔

دہر جوں جوں کہ لگاتی ہے اجل ، ڈرتا ہوں
مار کر مجھ کو نہ قاتل کہیں رسوا ہووے

ہو اگر سحر بیان دشمنِ افعی سیرت
قلم اپنا بھی عصائے کفِ موسیٰ ہووے

ہے مرا جوشِ جنوں جن سے زیادہ ناسخ
مرے ستائے کو جو دیکھے آپے سودا ہووے

۲۸۲

بجا ہے گر وصالِ اغیار کو ہے ، مجھ کو ہجراں ہے
کہ دنیا کافروں کو باغ ہے ، مومن کو زنداں ہے

مرے محبوب کے گردے[1] میں جو دانا و ناداں ہے
زمانہ اس کا ہالہ ہے ، وہ ایسا ماہِ تاباں ہے

کیا ہے دوجہاں سے مجھ کو آزاد اک اشارے میں
نگہ تیری ہے قطعِ تعلق تیغِ بُرّاں ہے

یدِ بیضا سے کیا تشبیہ دوں اس کے کفِ پا کو
جو اس کا نقشِ پا ہے چشمہ خورشید تاباں ہے

کیا کرتے ہیں خونِ آرزو کنجِ قناعت میں
ہمارے پاس جائے گنجِ زر ، گنجِ شہیداں ہے

چمکتی ہے جو ریت اکثر نشاں ہے مہ جبینوں کا
جسے ہم رولتے پھرتے ہیں یہ سب خاکِ انساں ہے

شبِ فرقت میں کرتا ہوں نظر جس دم ستاروں پر
کسی کی گور پر میں جالتا ہوں یہ چراغاں ہے

۱۔ گردہ = حلقہ ، منڈلی ، دائرہ (فرہنگ آصفیہ ، چلد چہارم ، ص ۳۰)۔

جنوں نے کر دیا فارغ مجھے بندِ علائق سے
نہ وہ زنجیرِ داماں ہے، نہ وہ طوقِ گریباں ہے
گسستہ[1] ہوتی ہے ظالم عنانِ اختیارِ دل
مگر تیرے سمندِ ناز کو پھر عزمِ جولاں ہے
لگا اک وار پورا، ہے جگہ غیرت کی او قاتل
تری تلوار پر میرا دہانِ زخم خنداں ہے
میسّر ہو اگر عشرت تجھے، جان احتلام اس کو
جہاں میں پائے گر ایذا، سمجھ خوابِ پریشاں ہے
عجب کیا جان پائیں مچھلیاں گر اُس کی بالی کی
پسینہ اُس کے رخساروں کا رشکِ آبِ حیواں ہے
اٹھے جاتے ہیں روشن دل پیاپے یوں زمانے سے
ہوا چلتی ہے گویا تند اور اس میں چراغاں ہے
فرشتوں نے درِ جنّت جو کھولا گور میں تو کیا
کہ مجھ کو بعدِ مردن بھی خیالِ روئے جاناں ہے
سبک دوشی عنایت کی دمِ شمشیرِ قاتل نے
نہ تن پر بارِ سر ہے اب، نہ سر پر بارِ ساماں ہے
ہؤا ہر حلقۂ زنجیر ناسخ! حلقۂ ماتم
مگر زنداں سے تجھ کو ان دنوں عزمِ بیاباں ہے

۲۸۳

فرقتِ ساقی میں خُمِ تنّورِ طوفاں خیز ہے
کشتئ مے کیا سفینہ عمر کا لبریز ہے

۱۔ "گسستہ": ٹوٹنے والی۔

تیری نوک لے خلرِ غم دیکھیں تو کیسی تیز ہے
توسنِ عمرِ رواں کو حاجتِ مہمیز ہے
وحشتِ دل سے بے طرح اسپال شور انگیز ہے
وحشیو! نوروز ہے یا روزِ رستاخیز ہے
نغمہ و نے محفلِ عشرت میں ہے ساقی ہمیں
اشکِ خون آلود اور افغانِ درد آمیز ہے
ہو تجھے جس چیز کی خواہش دلا وہ ہے مضر
جو کہ مستحق ہے، ہاں ہے اسے پرہیز ہے
کیوں تقاضا کر رہا ہے اس قدر دیدار کا
کیا یدِ بیضا کفِ موسیٰ میں دست آویز ہے
کیا عجب عنبر اگر بن جائے سارا مومِ شمع
آج محفل میں کسی کی زلفِ عنبر بیز ہے
دستِ رد سے دمبدم لیتے ہیں کلرِ تیغ ہم
اپنا قتلِ آرزو میں نام لب چنگیز ہے
وصل کی شب کے برابر صبح کا دیکھا شفق
ہم عناں میداں میں گلگوں ہے مگر شبدیز ہے
بادۂ عشرت سے خالی زیست بھر ساغر رہا
آج کیونکر جام میری عمر کا لبریز ہے
رسم اُلٹی دیکھنا دیوانہ میں جس پر ہوا
وہ پری اب عازمِ صحرائے وحشت خیز ہے
کوہکن کو فی الحقیقت اپنے سر سے کام تھا
کوہ پر تیشہ لگا دیکھا کہ کیسا تیز ہے
کون ہے اس طفل کی فرقت میں جس کو غم نہیں
سودے والوں کی صدا اک آہِ درد آمیز ہے

وصل میں آیا جو یاد اس طفل کا رونا مجھے
چشمِ تر میں ہے جو طفلِ اشک طوفاں خیز ہے
جب سے ہے وہ طفل غائب ہو گیا سودا مجھے
یاد اُن منّت کے طوقوں کی جنوں انگیز ہے
غیر تجھ پر پھوڑتے ہیں سر عبث فرہاد ساں
تو اگر شیریں ہے تو ناسخ ترا پرویز ہے

۲۸۴

ایسے ہم آماج گاہِ تیرِ مژگاں ہو گئے
رونگٹوں کی جا بدن پر سارے پیکاں ہو گئے
جب ہوا سے بال زلفوں کے پریشاں ہو گئے
مثلِ بلبل[1] تار تار اکثر گریباں ہو گئے
باغ میں گلبن ہیں گلدستے مزاروں کے تمام
خاک میں کیا کیا ہی گل رخسار پنہاں ہو گئے
دل میں جب لایا تصور اس کو تب کہنے لگا
مثلِ یوسف ہم اسیرِ کنجِ زنداں ہو گئے
گلشنِ عالم میں ہوں وہ عندلیبِ نغمہ سنج
زاغ جس کے زمزمے سن کے خوش الحاں ہو گئے
اس پری نے دی نشانی ہم کو جو انگشتری
ایسے آئے باؤ[2] میں گویا سلیماں ہو گئے

۱۔ مصطفائی طبع اول و طبع دوم ۔ نسخہ مقبع ھدی : "مثل سنبل" ۔
۲۔ "باؤ پر آ جانا" : فعلِ لازم (پوربی) مغرور اور متکبر ہو جانا ۔ دماغ میں ہوا بھر جانا ۔ (ناسخ)
"کیوں سلاطینِ زمانہ آ گئے ہیں باؤ پر"
(فرہنگِ آصفیہ ، جلد اول ، ص ۳۶۰)

یہ اسیری میں پھنسایا ناتوانی نے ہمیں
رشتۂ رنگ حلقۂ زنجیرِ زنداں ہوگئے

رشکِ کوئے یار سے دنیا میں جتنے باغ تھے
گلشنِ شدّاد ساں نظروں سے پنہاں ہوگئے

وصل کی شب پھٹ گیا جس دم گریبانِ سحر
پیرہن میں یاں گریباں ہی گریباں ہوگئے

دیکھی اس گلگوں قبا کی باغ میں جس دم بہار
پھاڑ کر کپڑے ہزاروں غنچے عریاں ہوگئے

چلتے چلتے کر گیا اعجاز زور اے خوش خرام
جس قدر تھے نقشِ پا کبکِ خراماں ہوگئے

گلشنِ رخسارِ جاناں سے ہوئی رخصت بہار
صورتِ برگِ خزاں عاشق پریشاں ہوگئے

ارمغانِ داغِ سودا لے چلے سوئے وطن
دو دن اس وحشت سرا میں ہم بھی مہماں ہوگئے

جتنے ہیں داغِ جنوں ہیں سکۂ شاہانِ حسن
کشورِ دل میں رواں کس کس کے فرماں ہوگئے

جس جگہ تھے قصر و منظر بن گئیں گوریں تمام
شہر جو آباد تھے، شہرِ خموشاں ہوگئے

شانہ کرتے غیر کو دیکھا تو یہ نفرت ہوئی
گیسوئے پیچیدہ مجھ کو مارِ پیچاں ہوگئے

رات دن رہتی ہے ناسخ ہم کو از خود رفتگی
آہ جب سے عاشقِ رفتارِ جاناں ہوگئے

۲۸۵

جاں کنی بھی سیکھی ہے[1] اے کوہکن استاد سے
یہ صدا آتی ہے[2] ہر دم تیشۂ فرہاد سے

دردِ سر مجھ کو بھی ہے پوچھے کوئی فرہاد سے
تو نے یہ تیشہ لیا ہے مول کس حدّاد سے

پڑ گیا ہے اس کے ابرو کا مرے اشکوں میں عکس
آ کے تلواریں بجھا کہہ دے کوئی حدّاد سے

بندگی میں سرو حاضر ہو گیا، کہتا ہے وہ
منع ہے خدمت کا لینا بندۂ آزاد سے

جس طرح سے ہے محبت فاختہ کو سرو کی
طوق والے طفل کو الفت ہے مجھ آزاد سے

جوہرِ ذاتی بشر کا ہے، جسے کہتے ہیں عشق
سیکھتا ہے کون فنِ عاشقی استاد سے

جن کی آنکھیں ہیں نہیں وہ دیکھتے حیران ہوں
وہ صنم پنہاں نہیں ہے کور مادر زاد سے

وہ سہی قد شانہ بنواتا ہے اس کی چوب کا
اس لیے رکھتی ہے الفت فاختہ شمشاد سے

بادشاہی کیجیے چل کر کسی ویرانے میں
چاہیے الفت گدا کو کوچۂ آباد سے

تہلکہ ہے جان کو ہر آن زیرِ آسماں
جلد نکلا چاہیے اس قصرِ بے بنیاد سے

۱۔ نسخۂ مطبع مہدی ۔ ''جاں کنی بھی سیکھیے اے کوہکن''
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مہدی : ''یہ صدا آتی ہے'' ۔

دن کو گر روزہ رکھیں گے سے پئیں گے رات کو
ہم نہ باہر ہوں گے اے پیرِ مغاں ارشاد سے

مے سے جب محروم رکھا ہم نے بن کر محتسب
کھود ڈالا خانۂ خمار کو بنیاد سے

کان میں اے سرو آویزے زمرّد کے نہیں
دانۂ انگور یہ پیدا ہوئے شمشاد سے

عشق کے مقتل میں یارب ہم تو ہوں بے سر پڑے
پوچھتا جاتا ہو ہر کوئی گنہ جلاد سے

رشکِ گلزارِ مصلّیٰ ہے ہر اک رنگیں غزل[1]
آئے ہیں حافظ کنارِ آبِ رکناباد سے

۲۸۶

بے ستوں پر جا کے ٹکر کیوں نہ لیں فرہاد سے
سیکھے ہیں ہم دونوں یہ فن ایک ہی استاد سے

طائرِ رنگِ حنا ہاتھوں سے اڑ سکتا نہیں
چھوٹ آئے مرغِ دل کس طرح اس صیّاد سے

کوئی ہے غلطاں لہو میں، ہمدمِ جاناں کوئی
خنجرِ آئینہ ہیں ہرچند اک فولاد سے

اغنیا کو ہے یہاں حسرت، فقیروں کو ہے عیش
باغ کے مزدور ہی اچھے رہے شدّاد سے

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ٹھی :
"رشک گلزار مصلیٰ پڑھیے اک رنگیں غزل"

تھا ازل سے مجھ کو تا وقتِ ولادت خوابِ عشق
کھل گئیں[1] آنکھیں سرے شورِ مبارک باد سے

کوہکن بھی ہو گیا تیری محبت میں فقیر
ہے مشابہ زخمِ تیشہ ، قشقۂ آزاد سے

چہرہ ہو جاتا ہے میرا اُس کے آتے ہی بحال
انس ہے رنگِ پریدہ کو بھی اُس صیّاد سے

شوق پتھر کھانے کا ایسا ہے مجھ دیوانے کو
چھٹیاں لڑکوں کو دلواتا ہوں روز استاد سے

حلقۂ گیسو جو ہیں مانندِ طوقِ فاختہ
بال سلجھائے[2] ہیں شاید شانۂ شمشاد سے

کوہ کو ٹکڑے کیا ہے میرے سر کے واسطے
اُنس مجھ وحشی کو ہے اتنے لیے فرہاد سے

دیکھنا ہمت کو[3] ساتھ اس کے بھادی جوئے خوں
تھی طلب شیریں کو جوئے شیر کی فرہاد سے

سبزۂ نارستۂ خط کی رعایت چاہیے
تیرے رخ کو دوں مثال آئینۂ فولاد سے

دیکھ تاثیرِ تعیّن کیا ہی ہے آپس میں جنگ
تیغ و چار آئینہ دونوں گو ہیں اک فولاد سے

سنتے ہی آپس میں ٹکرانے لگے سر ہر صنم
کیا بھلا ناقوس کو نسبت سری فریاد سے

۱۔ مصطفائی اول و دوم :
"کھل گئی آنکھیں سری شور مبارک باد سے"

۲۔ نسخۂ مطبع مجدی : "بال سلجھائے ہیں شاید"۔

۳۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"دیکھنا ہمت ، کہ ساتھ اُس کے بھادی جوئے خوں"

بیٹھنے دے کون پاس اپنے کہ ناسخ دشت میں
گردبادوں کو ہے رم مجھ خانماں برباد سے

۲۸۷

سبز آئینہ نہیں عکسِ خطِ صیاد سے
نکلی ہے طوطی مقرر بیضۂ فولاد سے

ہے یقیں اے سرو تیرے عشق میں شمشاد سے
تیشہ مانگے اپنے سر کے واسطے شمشاد[1] سے

زیست بھر مجھ کو رہا خوں ریز محبوبوں سے کام
روزِ مولد نال کٹوائی[2] تھی کیا جلاد سے

منتیں ہم وحشیوں کی بڑھتی ہیں روزِ وفات
طوق ہر سال اور پہنائے، کہو حداد سے

[3]زادہائے سخت دل خوں ریز ہوتے ہیں دلا
نکلے کیا جز تیغ و خنجر بیضۂ فولاد سے

صحنِ گلشن میں ترے آتے ہی اے رشکِ بہار
حشر برپا ہے شکستِ رنگ کی فولاد سے

ہے یہ سفاکی کی جانب یار کا مائل مزاج
شمع کے سر کو بھی کٹوانے لگا جلاد سے

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی :
"تیشہ مانگے اپنے سر کے واسطے فرہاد سے"

۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی :
"روز مولد نال کٹواتی ہے کیا جلاد سے"

۳۔ یہ شعر نسخۂ مصطفائی طبع اول و دوم اور نسخۂ مطبع ہدی طبع ۱۲۵۸ھ میں تیسرے نمبر پر ہے ۔

آپ پیدا ہوتے ہیں سودائے بتاپان ازل
طوقِ قمری کوئی بنواتا نہیں حدّاد سے

دشت میں ماندہ پڑا ہوگا کہیں ساقی[1] کے ساتھ
بڑھ گیا آگے ہزاروں کوس میں ہمزاد سے

اے سہی قد چشمِ تر کو کر نہ قدموں سے جدا
آب جُو ہر باغ میں ہے متّصل شمشاد سے

مچھلیاں بے شست ہیں دستِ حنائی میں اسیر
کب ہے ماہی گیر کو نسبت مرے صیاد سے

کعبہ ہے سنسان ، میخانے میں مستوں کا خروش
کون ویرانے کو جائے خانۂ آباد سے

اے سہی قد تجھ پہ ہر خوش قد کا ہے صدچاک دل
ہو گیا ثابت یہ مجھ کو شانۂ شمشاد سے

مدح سنجِ قامتِ جاناں ہے سر ہر فاختہ
سرو موزوں ہے مشابہ بے نوا[2] آزاد سے

گرچہ اے زاہد خدا کو دل سے میں بھولا نہیں
ایک دم فرصت نہیں لیکن بتوں کی یاد سے

خوں میں غلطاں گل نظر آتے ہیں بے یار اے نسیم
کیا قلم کروائی تھی گلبن کسی جلّاد سے

ہاتھ میرے یار کی زنجیرِ در سے باندھ دیں
اور زنجیریں نہ بنوائیں عبث حدّاد سے

۱۔ مصطفائی اول و دوم :
”دشت میں ماندہ پڑا ہوگا کہیں سایہ کے ساتھ“

۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہندی :
”سرو موزوں ہے مشابہ بانوا آزاد سے“

ربع مسکوں ہو مسخر دو میں گر[۱] ہو اتفاق
خلق تابع ہو، رکھے جو رابطہ ہمزاد سے

آہنِ شمشیر کی بیڑی گھڑے میرے لیے
عاشقِ ابرو ہوں میں، کہہ دے کوئی حدّاد سے

لفظِ شیریں ہے دلوں میں نقشِ شیریں سنگ میں
ہے قلم اپنا زیادہ تیشہ فرہاد سے

جھاڑتا ہے ہر سہی قد گیسوؤں سے تیری راہ
نقشِ پا تیرا نہیں کم سایہ شمشاد سے

گر قفس میں پھنس گئی بلبل کو اس کا غم نہیں
ہے یہی صدمہ کہ چھوٹی پنجہ صیاد سے

قامتِ جاناں کے آگے کچھ اسے رتبہ نہیں
جانور ہے فاختہ جو عشق ہے شمشاد سے

آج مجھ شوریدہ سر کی جانِ شیریں جائے گی
کوہ تڑوائے ہیں اس نے تیشہ فرہاد سے

عکس جوہر خط نہ بن جائے کہیں رخسار میں
رابطہ اتنا نہ کر آئینہ فولاد سے

پھرتے پھرتے سب اتر آیا ہے تلووں میں لہو
خارِ صحرا ہیں زیادہ نشترِ فصّاد سے

ضعف سے ہے طائرِ دل، طائرِ رنگِ حنا
کب یکایک چھوٹتا ہے پنجہ صیاد سے

۱۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخہ مطبع ہدیٰ:
"ربع مسکوں ہو مسخر دو میں ہو کر اتفاق"

تاب سننے کی نہیں ، بہر خدا خاموش ہو
ٹکڑے ہوتا[1] ہے جگر ناسخ تری فریاد سے

۲۸۸

فراق میں ہے دمِ تیغ موجِ آب مجھے
ہے گرد لشکر غم جوشِ ماہتاب مجھے

جو مے فروش نے زر لے کے دی شراب مجھے
عوض میں ذرے کے بخشا ہے آفتاب مجھے

ملا ہے وہ بتِ محبوب[2] بے حجاب مجھے
عجب ہی آئی نظر برق بے سحاب مجھے

پیا جو جام ، بہی اشک بن کے ساری شراب
بغیرِ یار ہو کیا نشۂ شراب مجھے

دم انتظار میں نکلا ، تب آیا ہائے جواب
جوابِ نامہ ہوا نامے کا جواب مجھے

جوان دل ہے تو پیری نہیں ہے تابع[3] عیش
سفیدی بالوں کی ہے جوشِ ماہتاب مجھے

تڑپ تڑپ کے موا پیاس سے لبِ دریا
نظر جو آ گئی چینِ جبیں کی[4] آب مجھے

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی :
”ٹکڑے ہوتے ہیں جگر ناسخ تری فرہاد سے“

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی :
”ملا ہے وہ بتِ عجوب بے حجاب مجھے“

۳۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی :
”جوان دل ہے تو پیری نہیں ہے مانع عیش“

۴۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی :
”نظر جو آ گئی چینِ جبیں آب مجھے“

میں جس کے غم میں جلوں ہو وہ بے مزہ مجھ سے
کیا ہے بخت نے کیا سوختہ کباب مجھے
خوشی جہان کو ہے میری اشک باری سے
کیا ہے بخت نے ہم طالعِ سحاب مجھے
بجھے گی جان مری روزِ ہجر میں کیونکر ؟
دکھا رہا ہے فلک ، تیغِ آفتاب مجھے
بہا جو اشک کا سیلاب ، آنکھیں پھوٹ گئیں
ملے تھے کیا عوض آنکھوں کے دو حباب مجھے
جنوں سے ملتے ہیں کتنے دہانہ[1] زنجیر
کیا ہے عشق نے جو خانماں خراب مجھے
درود پڑھنے لگا ہوں جو یک بیک ناسخ
کسی پسینے کا یاد آ گیا گلاب مجھے

۲۸۹

وصل کی دولت ملی جذبِ دلِ بیتاب سے
کیمیا ہم نے بنائی ہے مگر سیماب سے
دن کو رات اُس نے کیا ہے گیسوئے پرتاب سے
رات کو دن کر دیا ہے روئے عالم تاب سے
اُسترا اُس کے ذقن پر جب پھرا ، ثابت ہوا
دور ہو جاتے ہیں تنکے حلقۂ گرداب سے
بے حقیقت کو بلا سے کب ہے دنیا میں گزند
عکس تنکے کا بھی بہہ سکتا نہیں سیلاب سے

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع بھدی :
''جنوں سے ملتے ہیں کتنے ہی خانۂ زنجیر''

ہے مسرت راحتِ دنیا سے غفلت کے سبب
کون خوش ہوتا ہے بیداری میں عیشِ خواب سے

آسماں کے پاس سامان عیب پوشی کا نہیں
کب کسی کا ستر ہوگا چادرِ مہتاب سے

آگے افتادوں کے ہاتے ہیں کہیں[1] سرکش فروغ
سرد ہو جائے نہ کیوں بازارِ آتش آب سے

پڑتے ہی عکسِ رخِ جاناں کی ہے تشبیہ تام
چوکھٹے کو ہالے سے، آئینے کو مہتاب سے

غیر سے لگوائی مہندی اس نے ہاتھوں پر جو رات
پنجۂ مژگاں کو ہم نے بھی رنگا خوناب سے

مدتیں گذریں کہ رکھتا ہوں فراقِ یار میں
دن کو پروانے سے صحبت، رات کو سرخاب سے

ہونٹھ[2] تیرے دیکھ کر مجھ کو ہوا جوشِ جنوں
کرتے ہیں کیونکر طبیب اصلاحِ خوں عناب سے

کھاتے ہیں ایسے تری محرابِ ابرو کے فریب
بھاگتے ہیں دور ہم مسجد کی بھی محراب سے

خاکِ کوئے یار ہے ناسخ مرے تن پر لباس
کام کیا مجھ کو حریر و اطلس و کم خواب سے

۲۹۰

چشمِ جاناں اور ہے، چشمِ غزالاں اور ہے
وضعِ انساں اور ہے، ترکیبِ حیواں اور ہے

۱۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجدی:
"آگے افتادوں کے ہاتے ہیں کوئی سرکش فروغ"۔
۲۔ ہونٹ۔

گر کتاں اُس سے پھٹے اس سے جگر ہو چاک چاک

ماہِ تاباں اور ہے ، رخسارِ تاباں اور ہے

سیرِ مقتل مت سمجھ گلگشت اے نازک مزاج

باغ و بستاں اور ہے ، گنجِ شہیداں اور ہے

یہ میسّر ہے وہ دیکھیں ہو میسّر یا نہ ہو

کوئے جاناں اور ہے ، گلزارِ جاناں اور ہے

ایک یوسف واں گرا تھا، یاں گرے دل ہائے خلق

چاہِ کنعاں اور ہے ، چاہِ زنخداں اور ہے

برق اس پر منتشی ہے، روتا ہے اس پر اک جہاں

ابرِ باراں اور ہے ، اور[1] چشمِ گریاں اور ہے

خاک جنت میں لگے گا بعدِ مردن دل مرا

نازِ غلماں اور ہے ، اندازِ انساں اور ہے

اس میں ہے داغِ فراق اے صبح اُس میں آفتاب

یہ گریباں اور ہے ، تیرا گریباں اور ہے

دل سے ہے کاوش اسے، تلووں سے ہے اُس کو خلش

خارِ مژگاں اور ہے ، خارِ مغیلاں اور ہے

جانور[2] اُس پر ہے عاشق ، اس پہ عاشق آدمی

سروِ بستاں اور ہے ، سروِ چراغاں اور ہے

ہوتے ہیں خوں اس کے دیکھے سے تو اُس کی ضرب سے

جسمِ عریاں اور ہے ، شمشیرِ عریاں اور ہے

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"ابرِ باراں اور ہے یہ چشمِ گریاں اور ہے"

۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"جانور ہے اس پر عاشق ، اس پہ عاشق آدمی"

گرچہ جھکوں خاک پر غلطاں ہیں لیکن فرق ہے
سنبلستاں اور ہے ، زلفِ پریشاں اور ہے

ناتراشیدہ ہے وہ ، اور یہ ہے سانچے میں ڈھلا
شاخِ مرجاں اور ہے ، دستِ حسیناں اور ہے

باعثِ ایماں ہے وہ ، غارت گر ایماں ہے یہ
نظمِ قرآں اور ہے ، رخسارِ جاناں اور ہے

فرق ہے شاہ و گدا میں قولِ شاعر سے یہی
شیرِ قالیں اور ہے ، شیرِ نیستاں اور ہے

۲۹۱

غیر نے آ کے چھڑایا درِ جاناں مجھ سے
دیو نے چھین لیا تختِ سلیماں مجھ سے

مجھ میں اور اُس میں ہے اب آتش و سیماب کا ربط
گرم جوشی کروں جتنی ، ہو گریزاں مجھ سے

ہوں وہ عریاں کہ کبھو چھو نہ گیا مجھ کو لباس
ہوں وہ کانٹا کہ نہ اُلجھا کبھی داماں مجھ سے

بے خودی میں شبِ غم ، اپنے گریباں کے عوض
پھٹ گیا صبحِ قیامت کا گریباں مجھ سے

میری قسمت کی وطن میں یہ سیہ بختی ہے
تیرگی مانگتی ہے شامِ غریباں مجھ سے

گرچہ ہوں مور ولے رتبۂ برپادی میں
اُڑ کے جائے گا کہاں تختِ سلیماں مجھ سے

لاکھ ہو گردشِ ایام ، یہ حاضر ہے مدام
آنس رکھتی ہے نہایت شبِ ہجراں مجھ سے

خالہ ویراں بھی کہتا تھا ہر اک اے فلک ا
اب تو آباد ہوا خانۂ ویراں مجھ سے

۲۹۲

دلا فصلِ بہاری ہے ، جنوں زا ربعِ مسکوں ہے
گلستانِ جہاں میں جو شجر ہے ، بیدِ مجنوں ہے
سمجھتا ہوں میں شاخِ گل کو اُس کا قدِ گلگوں ہے
صبا دیتی ہے جنبش ، جانتا ہوں رقصِ موزوں ہے
کرے کیا خال پر رغبت جو محوِ چشمِ میگوں ہے
کہ آبِ زندگانی ہے شراب ، اور زہر افیوں ہے
بنیں گے بدر ماہ نو نشانِ نعل توسن کے
اگر اے شہ سوار ! ایسا ہی حسنِ روز افزوں ہے
جہاں موذی ہیں دنیا میں مسخّر زر سے ہوتے ہیں
کہ نقشِ زر خزانے میں برائے مارِ افسوں ہے
برابر جانتے ہیں خشک و تر کے جزو و کل کو ہم
جو ذرہ ہے وہ ہاموں ہے ، جو قطرہ ہے وہ جیحوں ہے
بجز رنگیں مزاجی زندہ دل ہونا نہیں ممکن
کہ رنگِ زندگانی ہے بدن میں جب تلک خوں ہے
خدا نے زر کیا پیدا اڑا دینے کو دنیا میں
زمیں میں جس کو پنہاں کرتے ہیں وہ گنجِ قاروں ہے
نہ ہو ادنٰی کو تا حسرت کبھی اعلٰی کے رتبے سے[1]
زمیں آرام سے ہے ، رات دن گردش میں گردوں ہے

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مہدی :
”نہ ہو ادنٰی کو تا حسرت کبھی اعلٰی کے رتبے کی“

کیا ہے اس قدر لاغر فراقِ یار نے ہم کو
کہ کہتے ہیں مرے ہمدم نہ لیلیٰ ہے نہ مجنوں ہے
کسی محبوب کو کیا ہے مرے محبوب سے نسبت
کہ رشکِ خالِ مشکیں ہے جو اُس کی زلف کی جوں ہے
اندھیرا سا اندھیرا چھا رہا ہے آنکھوں کے
شبِ تاریک میں مجھ کو خیالِ زلفِ شبگوں ہے
نظر آتا ہے مجھ کو غیرتِ شمشاد کیوں شجرہ
رباعی میں مگر موزوں تری قامت کا مضموں ہے
سخاوت کو بدل امساک سے ایسا کیا سب نے
کہ ہر ساغر میں جانے بادۂ گلرنگ، افیوں ہے
یہ مستوں کی ہے رفتار میری کلک میں ناسخ
دمِ فکرِ سخن مجھ کو خیالِ چشمِ میگوں ہے

۲۹۳

مرے محمل نشیں کے آگے لیلیٰ کا جو مفتوں ہے
وہ مجنوں ہے وہ مجنوں ہے وہ مجنوں ہے وہ مجنوں ہے
علی بند اُس پری رو کی سپر میں آج گلگوں ہے
نہیں معلوم کس بے چارہ پر عزمِ شبِ خوں ہے
تو وہ لیلیٰ ہے ظالم ہر پری رو تیرا مجنوں ہے
ترے آگے جو ہے شمشاد قامت، بیدِ مجنوں ہے
ترے قد کا نہایت طبع کو مرغوب مضموں ہے
مرے دیوان میں ہے جو الف اک سروِ موزوں ہے
رکھوں آغوش میں مانندِ ساحل کیوں نہ عالم کو
حباب و موج میں سب دوست دشمن بارِ جیحوں ہے

بہ ظاہر سب مساوی ہیں ، مگر ہے فرق باطن میں
نہیں مینے میں حکمت ہے نہ ہر خم میں فلاطوں ہے

بلندی میں مثالِ آسماں گو قصر تھا تو کیا
اجل کے ہاتھ سے زیرِ زمیں آخر فریدوں ہے

سیہ کاری ہی حاصل ہے سیہ کاروں سے ملنے میں
معینِ وسمہ بالوں کے سیہ کرنے میں صابوں ہے

بہارِ حسنِ جاناں نے کیا یہ رنگ گلشن کا
کہ جانے برگِ گل ہر غنچے میں اک قطرۂ خوں ہے

سفید اس آفتِ دوراں نے جو موباف ڈالا ہے
برنگِ شاخِ شبّو ان دنوں گیسوئے شبگوں ہے

کھلے جب فصد تیری خون ہو جائے زمانے میں
تو وہ لیلیٰ ہے ظالم ایک عالم تیرا مجنوں ہے

کبھی ہنسنے میں بھی کھلتے نہیں جو اے پری پیکر
ترے دانتوں کو میں سمجھا ہوں، سلکِ درِ مکنوں ہے

ہوئے سیلِ فنا سے قصرِ عالی بے نشاں لاکھوں
تری[1] عبرت کو منعم ! ایک باقی قصرِ گردوں ہے

قناعت ایسی حاصل ہے تری دولت جنوں مجھ کو
چمکتی ہے جو ریگِ دشت ، گویا گنجِ قاروں ہے

نہ کیونکر روتے روتے لال ہو جائیں مری آنکھیں
شبِ فرقت میں اے ناسخ خیالِ روئے گلگوں ہے

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہندی : "ایک باقی طاقِ گردوں ہے"۔

۲۹۴

توسنِ عمرِ رواں ایسا ہی گر چالاک ہے
گردِ ساں برباد اک دن میری مشتِ خاک ہے

شغل رونے کا نہ چھوٹا مجھ سے بعد از مرگ بھی
ابر ساں دوشِ ہوا پر قطرہ افشاں خاک ہے

آئنے کو دوست رکھتے ہیں جہاں کے خوب و زشت
دل ہوا جب صاف بس عالم سے جھگڑا پاک ہے

یادِ ساقی میں ہوئے ہیں دانۂ زنجیر اشک
ساقیاں مژگانِ تر کا خاربستِ تاک ہے

یوں نکالی حسرتِ دل صیدگاہِ عشق میں
چنگلِ شاہیں کو میں سمجھا کہ یہ[1] فتراک ہے

آگ سے جب تک نہ سینکیں ہو کہاں کیونکر درست
حسنِ ابرو کے لیے وہ روئے آتش ناک ہے

دستِ صانع بھی مرے حق میں ہوا دستِ جنوں
تن برنگِ غنچہ پیش از پیرہن صد چاک ہے

شست و شو کو آبِ شبنم چاہیے تا آفتاب
کون ہے موجود جو آلودگی سے پاک ہے

جس قدر نشہ زیادہ اتنی ہی سرگشتگی
ایک صورت پر ازل سے گردشِ افلاک ہے

ساکنِ دل تو ہوا، آنکھوں کو ترساتا ہے کیوں؟
جس قدر دل صاف ہے، ویسی لگن بھی پاک ہے

۱- مصطفائی طبع اول و دوم - نسخۂ مطبع ہدی:
"چنگلِ شاہیں کو میں سمجھا ہی فتراک ہے"

جلد پاتے ہیں رہائی قیدیِ زندانِ عشق
یار میں میں یہ بڑی خوبی ہے جو سفاک ہے
داغِ دل کے اب وہ شعلے ہیں کہ جن کے سامنے
پنجۂ خورشید اک مشتِ خس و خاشاک ہے
جیبِ یار آلودگی سے پاک ہے تو کیا خطر
ہے گواہ اشکِ رواں ، اپنی نگہ بھی پاک ہے
وسعتِ مشرب ہے تو رندو گنہ سے کیا ضرر
دامنِ دریا ہزار آلودگی سے پاک ہے
یہ نہ ہوتا تو زمینِ شعر بھی ہوتی نہ خلق
اس لیے ناسخ جو مدّاحِ شہِ لولاکؑ ہے

۲۹۵

گلشنِ عالم میں کیا دستِ جنوں چالاکؔ ہے
جیبِ گل سے تا گریبانِ سحر صد چاک ہے
اسفل و اعلیٰ جو ہیں مل جائیں گے سب خاک میں
آسماں اس رتبۂ عالی پہ زیرِ خاک ہے
پست تر کرنے کو گردوں سب کو کرتا ہے بلند
اشک کا آنکھوں میں آنا دل سے بہرِ خاک ہے
حسن ہو کیسا ہی ، پر رہتا ہے بالا دستِ عشق
ہے زلیخا کو جنوں اور جیبِ یوسف چاک ہے
دیتے ہیں تشبیہ ان دونوں میں سو بے ہوش ہیں
مے تو ہے ناپاک ، چشمِ مستِ جاناں پاک ہے
پاک ہو کیونکر نہ اپنی چشمِ گریاں کی نگاہ
آبِ چشم ہر سے گزر جاتا ہے وہ شے پاک ہے

آج یہ مجھ پر کھلے ہیں معنیِ والسابحات[1]
ہر ستارہ میرے بحرِ اشک میں تیراک[2] ہے

سالب جیسے کینچلی ڈالے وہ یوں عریاں ہوا
جو حسیں ہے جسم پر اس کی عبث پوشاک ہے

جلتے ہیں سودائی میری گرمیِ بازار سے
شعلۂ آتش ہوں میں، عالم خس و خاشاک ہے

روح ہے ہر جسم میں مشتاق اخبارِ اجل
اس لیے یہ آمد و رفتِ نفس کی ڈاک ہے

تعصیہ مالی اغنیا کی ہے عبث اے اہلِ حرص
نقد سے خالی ہمیشہ کیسۂ دلاّک ہے

قتل کرنے کو تو آخر گھر سے باہر آئے گا
ہے دلا امید کی جا یار اگر سفّاک ہے

مثلِ نکہت جسم اس کا ہے لطافت سے نہاں
غم نہیں، ٹکڑے برنگِ گل اگر پوشاک ہے

ڈر کے مارے صبح کا دیوِ سفید آتا نہیں
کس قدر صورت شبِ فرقت کی دہشت ناک ہے

مطلع روشن اب ایسا ہے کہ جس کے رشک سے
پنجۂ خورشید سے جیبِ سحر صد چاک ہے

۲۹۶

دشتِ وحشت میں یہ میرے جسم پر پوشاک ہے
داغ سر پر، پاؤں میں خار اور بدن پر خاک ہے

۱۔ مصطفائی اول و دوم : "معنیٔ والسائحات" ۔ نسخۂ مطبع مجتبائی :
"معنیٔ والسائحات"۔

۲۔ مصطفائی طبع دوم۔ نسخۂ مطبع مجتبائی : "تیراک ہے"۔

خواہشِ نظارہ کو ضعفِ بصر کا باک ہے
رات دن آنکھوں کے آگے روئے آتش ناک ہے

خوار ہی نکلا جو کوئی صحبتِ ہم جنس سے
جب تلک دریا سے قطرہ مشتمل ہے ہاک ہے

فاش اخفا میں ہوا جاتا ہے اپنا رازِ عشق
زخم سے بدتر ہے ہنسنا دل اگر غم ناک ہے

سیکڑوں نخچیر آتے ہیں جلو میں خود بخود
اے شکار افگن ! تجھے کیا حاجتِ فتراک ہے

کھینچتا ہوں جوشِ گریہ میں اگر میں آہِ سرد
ہنس کے کہتا ہے ہوا برسات کی غم ناک ہے

ختم ہے شیریں دہانی تجھ پہ[1] اے شیریں دہن
نیشکر سے بھی فزوں شیریں تری مسواک ہے

بھاگتے ہیں پاؤں میں چبھ چبھ کے یاں سے خار بھی
کیا مرا صحرا معاذ اللہ ! وحشت ناک ہے

پیرہن کی نوجوانی میں اڑیں[2] تھیں دھجیاں
جسم گل میں یہ مری اتری ہوئی پوشاک ہے

ہے عیاں جلوہ خدا کا ان بتانِ ہند میں
سوجھے کیا زاہد تجھے، آنکھوں کے آگے ناک ہے

کیا چٹک کر جا پڑا ہے دور مانندِ سپند
یہ زحل گردوں پہ خالِ روئے آتشناک ہے

۱۔ نسخۂ مطبع مجدی : "تجھ پر اے شیریں دہن"۔
۲۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجدی : "[3]اڑی تھیں دھجیاں"۔

ہے زمرّد کے یہ آویزے[1] سے مجھ پر آشکار

کان میں بالا نہیں ہے داربستِ تاک ہے

اے سراپا نور! نخلِ وادیِ ایمن ہے تو

بولتا ہے پر جہاں تیرے دہن میں شاک ہے

ہو رہا ہے اک جہاں تیرا شکاری، شہ سوار!

صید کیا صیاد بھی یاں بستہ فتراک ہے

اور کون اس بحر میں فاسخ ہلائے دست و پا

فکر یاں غوّاص ہے، طبعِ رواں تیراک[2] ہے

۲۹۷

ہے بجا گر خط غبارِ روئے آتش ناک ہے

آگ میں پڑ جائے جو شے، ایک دم میں پاک ہے

دسترس اس کی بدولت ثابت[3] سفّاک ہے

کیسۂ زر سے زیادہ کیسۂ دلاّک ہے

ہجر میں کیا باغ جاؤں، دل مرا غم ناک ہے

گل نظر میں شعلہ ہے، گلبن خس و خاشاک ہے

آج تیرا جسم ہے اور کیسۂ دلاک ہے

خاک میں گل[4] جسم کیا ہر استخواں بھی خاک ہے

گو بدلتا ہے لباس اپنا تُو دن میں کتنی بار

گل کے اترے گی جو تیری آخری پوشاک ہے

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہندی :

"ہے زمرد کے یہ آویزوں سے مجھ پر آشکار"

۲۔ مصطفائی طبع اول : "پیراک ہے"۔

۳۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہندی : "ثابتِ سفاک ہے"۔

۴۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہندی : "خاک میں گل جسم گیا"۔

عشق اس کی جامہ زیبی کا ہے ، کچھ سودا نہیں
عقل کل یاں جیب بیدست جنوں صد چاک ہے
آگے افتادوں کے عالی منزلت ہوتے ہیں پست
دیکھ ہر[1] پانی کے نیچے گنبد افلاک ہے
عالم بالا سے ہم بدمست پاتے ہیں جو رزق
طفنے آگے آسماں اک داربست تاک ہے
تیرے آگے رنگ گلشن ہو گیا ایسا سفید
جیب ہر گل مثل جیب صبح صادق چاک ہے
موئے مژگاں ہو گئے پانی میں رہنے سے سفید
انتہا رونے کی کچھ اے دیدۂ غم ناک ہے ؟
نرگس و زنبق سے پوچھو رنگ عارض بوئے زلف
اے گل سنبل کہ آس کی آنکھ آس کی ناک ہے
گو بظاہر خاک کے پتلے ہیں سب یکساں مگر
کوئی ہے اکسیر ان میں اور کوئی خاک ہے
ہے یہی حسرت کہ پھونچوں[2] اڑ کے کوئے یار میں
بعد مردن خاک میں بھی مجھ کو راحت خاک ہے
ہوں سوار توسن معنی زمین شعر میں
صید مضموں جو ہے ناسخ بستۂ فتراک ہے

۲۹۸

جو غزل ہے اس میں مضمون دل مایوس ہے
جو ورق ہے میرے دیواں کا ، کف افسوس ہے

۱- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع مجدی : ”دیکھ ہر پانی کے نیچے“ -
۲- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع مجدی : ”ہے یہی حسرت کہ پہنچوں“ -

روشنی دونوں کچوں[۱] کی شمع ساں محسوس ہے
جو کٹوری تیری انگیا کی ہے، اک فانوس ہے

گل جو ہے وہ تیرے داغِ عشق سے مانوس ہو
شاخِ گلبن میں جو ہے، گویا پرِ طاؤس ہے

دستکِ مطرب ترے غم میں کفِ افسوس ہے
داغِ حسرت سے بطِ مے صورتِ طاؤس ہے

مجھ کو اپنے گوشۂ دل میں ہے اس گلشن کی سیر
آسمانِ نیلگوں بھی جس میں اک طاؤس ہے

اس قدر میں نے ملے دستِ حنائی کرکے یاد
خون سے فرقت میں رنگیں پر کفِ افسوس ہے

قبر پر تعویذ اس کے نقشِ پا کا چاہیے
بعد مرنے کے بھی ہم کو حسرتِ پابوس ہے

بس مرے دل میں جگہ تیری ہے خالی اے صنم
سینہ ہے آتش کدہ، نالہ مرا ناقوس ہے

کیا کروں شکوہ کہ روزن دیکھ کر دیوار کا
جانتا ہوں میں لگانے کان یہ جاسوس ہے

جام سے ہوتا نہیں لبریز غیر از جامِ عمر
آسماں میری نظر میں شیشۂ معکوس[۲] ہے

۱- کچ : (ہ) اسم مؤنث ۔ بمعنی چھاتی، پستان :

"اظہار کرکے ہے یہ ابھرے کچوں کا عالم
سینے میں دل کو میرے گیا کیا دکھا گیا ہے" (جرأت)

(فرہنگ آصفیہ، ص ۳۴۴)

۲- نسخۂ نول کشور میں "ماکوس" غلط چھپا ہے ۔ صحیح "معکوس" ۔ نسخۂ مصطفائی اول و دوم اور نسخۂ مطبع مجتبائی میں درست ہے ۔

فرش سے تا عرش روشن ہے مرا حالِ تباہ
شمع ہوں میں سوزِ غم سے آسماں فانوس ہے
اس کی جھڑی گو کا ہو یہ تنِ خاکی غبار
یا الٰہی مرحِ جاں جس طفل کا مانوس ہے
خاک ہو جاتے ہیں دونوں خاک میں ملنے کے ساتھ
چار دن کوئی گدا ہے، کوئی کیکاؤس ہے
عشق نے جیسے کیا ہے کفر و دیں میں اتحاد
اپنی مسجد میں مؤذن کے عوض ناقوس ہے
چھوڑ دے میرا گریباں، تا نہ رسوا ہو کوئی
دستِ وحشت! یہ کسی کا پردۂ ناموس ہے
اے صبا لے جا وہاں نالہ مری زنجیر کا
دل مرا منت کے طوقوں میں جہاں محبوس ہے
وصل کا وعدہ کریں گے صبح صاحب تو وفا
ہر شبِ فرقت میں بندہ زیست سے مایوس ہے
وصل کو لکھا ہے فاسخ دردِ عاشق کی دوا
دل ہمارا قابلِ تشخیصِ جالینوس ہے

۲۹۹

کسی نے تیرِ دزدیدہ نگہ سے دل کو مارا ہے
لہو روتی ہیں آنکھیں، رازِ پنہاں آشکارا ہے
بسر کی عمر مثلِ شمعِ ماتم بزمِ ماتم میں
چراغِ گور شاید اپنے طالع کا ستارا ہے
زمانے میں لگا دی آگ اک کافر بھبھوکے نے
جہاں ہے تودۂ باروت، گویا وہ شرارا ہے

نظر میں ساتھ ابرو کے ہے خالِ اک زیرِ ابرو بھی
تماشِ پردہ ہائے چشم گویا چاند تارا ہے

ہمیں اے نخل بندِ باغِ عالم موسمِ گل میں
دکھاتا ساغرِ گل بادہ خواری کا اشارا ہے

نظر آتا[1] ہے جرمِ آفتاب افلاک سے جیسے
شراب آس کے تنِ نازک سے یوں صاف آشکارا ہے

نکل آؤں ابھی باہر گذر ہو کر حسینوں کا
لحد پارے[2] کی ہے کان اور میری خاک پارا ہے

گلوں کا اور میرا فصلِ گل میں ایک عالم ہے
چبھے ہیں خار پاؤں میں، گریباں پارا پارا ہے

تو وہ گل ہے کہ گزرا باغ سے جس جس خیاباں سے
تو آوازِ شکستِ رنگ سے گل نے پکارا ہے

وہ اپنے گھر میں ہے، خوشبو سے سب گلیاں مہکتی ہیں
نہاں ہے رنگِ گل اور نکہتِ گل آشکارا ہے

خدا کا اب کوئی طالب نہیں ساری خدائی میں
بتو! ہر کوئی بندے کی طرح بندہ ہمارا ہے

نظر آنے لگی ہے چشمِ عزرائیل جو مجھ کو
الٰہی کیا یہی صبحِ شبِ فرقت کا تارا ہے

یہ مضمونِ غم و شادی و مرگ و زیست ہے لاشے
جہاں وہ بیت ہے، جس میں سراسر استعارا ہے

دلا اب پنجۂ مژگاں میں دے تسبیح اشکوں سے[3]
ارادہ کوئے جاناں کا ہے، منظور استخارا ہے

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی: ''نظر آتے ہیں''۔
۲۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی: ''لحد پارہ کی''۔
۳۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی: ''دے تسبیح اشکوں کی''۔

گیاہِ دشت کو رکھتا ہے مجنوں سبز اشکوں سے
سمجھتا ہے کہ یہ جمّازۂ لیلیٰ کا چارا ہے

کمر تیری وہ ہے جس نے کمر توڑی ہے چیتوں کی
تری آنکھوں کے آگے اے پری! آہو بچارا ہے

اثر رکھتا ہے سایہ کیا ہی اس زلفِ معنبر کا
بجا ہے خاکِ کوئے یار میں عنبر ہی سارا ہے

مرا یہ رنگ فق، یہ بیخودی، یہ چشم تر اس کو
شبِ مہتاب ہے، مستی ہے، دریا کا کنارا ہے

ہمارے حکم سے یہ تخم ریزی ہے مضامیں کی
کہ ناسخ ہر زمینِ شعر میں اپنا اجارا ہے

۳۰۰

فرقت ہوئی جو صبح کو اک رشکِ ماہ سے
غربال آفتاب ہوا تیرِ آہ سے

اب تک جو اس کی ہیں وہی وعدہ خلافیاں
آگاہ کیا نہیں مرے حالِ تباہ سے

عاشق کو رنج ہو تو ہو معشوق کو بھی رنج
یوسف گرا کنویں میں زلیخا کی چاہ سے

آئی طواف میں تری چشمِ سیہ جو یاد
بسمل ہوئے غزالِ حرم تیرِ آہ سے

کیا پیروانِ شرع کو مرشد کی احتیاج
کچھ کم نہیں نشانِ قدم خضرِ راہ سے

یہ خود نمائیاں ہیں کہ معجز نمائیاں
روشن ہے چشمِ کور تری گردِ راہ سے

مشرق سے کالپتا نہیں نکلا یہ ہے سبب
خورشید ڈر گیا مرے روزِ سیاہ سے

صبحِ شبِ فراق کو بھولی افق کی راہ
ہر[1] تیرگی ہے اخترِ بختِ سیاہ سے

فرقت کی مے کشی میں جو ساقی گزک نہیں
لے لیں گے لختِ دل کوئی ہم سیخِ آہ سے

حجّام خطِ یار بناتے ہی مر گیا
عارض کا سبزہ کم نہیں مردم گیاہ سے

بھڑکی جو چشمِ یار، ہوئی اُس کی احتیاج
نسبت ہے کوہِ سرمہ کو کیا برگِ کاہ[2] سے

موذی اگر ہے گوشہ نشیں، کچھ خطر نہیں
ایذا ہے راہ رو کو فقط خارِ[3] راہ سے

گو جنگ سے گریز کرے کوئی بادشاہ
تاجِ خروس خوب ہے اُس کی کلاہ سے

ہر روز روزِ ہجر ہے، ہر شب شبِ فراق
نفرت ہوئی یہاں کے سفید و سیاہ سے

آتا ہے یاد ہجر میں رہ رہ کے روئے یار
دن رات مجھ کو رنج ہے خورشید و ماہ سے

ناسخ حضورِ شاہِ زمن حشر تک رہیں
بندے ہزاروں حشمت و اقبال و جاہ سے

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی : ''یہ تیرگی'' ۔
۲۔ نسخۂ مطبع ہدی : ''برگِ آہ سے'' ۔
۳۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہدی : ''اغیارِ راہ سے'' ۔

۳۰۲

مہر آنکھیں سینکتا ہے جو اس رشکِ ماہ سے
تارِ شعاع کم نہیں تارِ نگاہ سے

اے روسیہ رقیب! تو ڈر میری آہ سے
بجلی کو لاگ ہوتی ہے رنگِ سیاہ سے

ہم آدمی ہیں ، وصل میسر نہیں کبھی
ہوتا ہے غم نظارۂ مردم گیاہ سے

اعضا تمام گھل گئے ہیں غم سے اس قدر
مثلِ حباب سر ہے بھاری کلاہ سے

دو دن وہ باغ میں جو سہی قد نہیں گیا
شمشاد لاغری میں ہے برگِ گیاہ سے

اعلیٰ جو ہیں وہ کب ہوئے ادنیٰ سے ملتجی
سیراب کیا ہو ابر بھلا آبِ چاہ سے

عزلت گزین ہوتا ہے تجھ سے زمانہ صاف
اٹھتی ہے رہروؤں کے سبب گرد ، راہ سے

روتا ہے میرے غم میں جو وہ آج زار زار
چشمِ سیاہ کم نہیں ابرِ سیاہ سے

سبزہ ہے گردِ عارضِ گلگوں تو عیب کیا
گلدستے باندھے جاتے ہیں اکثر گیاہ سے

میری طرح جو پھنسی ہے زنجیر پاؤں میں
کیا عشق چاند کو بھی ہے تیری کلاہ سے

آنکھیں حسینوں کی لگی ہیں خطِ یار پر
ہوتا ہے آہوؤں کو تعلق گیاہ سے

مجھ ناتواں سے¹ حسن دوبالا ہے یار کا
دونا فروغ آگ کا² ہوتا ہے کاہ سے

ہر ایک اپنی آنکھوں میں دے مجھ کو کیا جگہ
سرمہ کیا ہے یار نے برقِ نگاہ سے

کب آؤں گا نظر ، نہ ملے گی جو تیری آنکھ
میں ناتواں اسیر ہوں تارِ نگاہ سے

کہتے ہیں جس کو عشق وہ پرتو ہے حسن کا
ہالے کا ہے وجود فقط نورِ ماہ سے

روشن ہے اس میں عارضِ تاباں تو اس میں داغ
کیا کم شبِ فراق ہے زلفِ سیاہ سے

تر دامنی ہے آبِ³ خجالت سے زاہدا
تسبیح کو انفعال ہے اپنے گناہ سے

۳۰۲

مجھ کو فرقت کی اسیری سے رہائی ہوتی
کاش عیسیٰ کے عوض موت ہی آئی ہوتی

گر نہ ہو شمع تو معدوم ہیں پروانے بھی!
تو نہ ہوتا تو صنم کب⁴ یہ خدائی ہوتی

۱۔ نسخۂ نول کشور میں سہو کتابت ہے:
"مجھ ناتواں کا حسن دوبالا ہے یار کا"
۲۔ مصطفائی طبع دوم:
"دونا فروغ آگ کو ہوتا ہے کاہ سے"
۳۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجیدی: "تر دامنی سے آپ [illegible]"
۴۔ مصطفائی اول و دوم: "[illegible] یہ خدائی ہوتی"۔

غیر سے کرتے ہو ابرو کے اشارے ہردم
کبھی تلوار تو مجھ پر بھی لگائی ہوتی
اس کی ہردم کی نصیحت سے میں تنگ آیا ہوں
کاش ناصح سے بھی آنکھ اس نے لڑائی ہوتی
ہوں وہ غم دوست کہ سب اپنے ہی دل میں بھرتا
غم عالم کی اگر اس میں سمائی ہوتی
خط کے آغاز میں تو مجھ سے ہوا صاف تو کب[1]
لطف تب تھا کہ صفائی میں صفائی ہوتی
ابر رحمت سے تو محروم رہی کشت مری
کوئی بجلی ہی فلک تو نے گرائی ہوتی
دھوئی کیوں اشک کے طوفان سے لوح محفوظ
سرنوشت اپنی ہی ناسخ نے مٹائی ہوتی

۳۰۳

زندگی بھر ہم نہ کوئے گل رخاں سے اٹھ سکے
کیا عجب لاشہ بھی اپنا گر نہ یاں سے اٹھ سکے
لادوں اس کی پشت پر اپنا اگر بار گناہ
ہے یقیں ہرگز نہ گاو آسماں سے اٹھ سکے
آنے جانے والے لاکھوں ٹھوکریں مارا کیے
پر نہ ہم مانند سنگ آستاں[2] سے اٹھ سکے

۱- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع ہدی :
"خط کے آغاز میں تو مجھ سے ہوا صاف تو کیا"
۲- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع ہدی :
"پر نہ ہم مانند سنگ اس آستاں سے اٹھ سکے"

رعب اے صیاد اٹھا تیرے نخچیروں کا ہے
ہو اگر رستم نہ چلنے بھی کہاں سے اٹھ سکے

کوئے جاناں سے اٹھاؤں کس طرح اغیار کو
جب نہ دل آیا ہوا مجھ ناتواں سے اٹھ سکے

قصر[1] کو جذبِ زلیخا کھینچ لاتا ہے آپ
اور جانب کو قدم کیا کارواں سے اٹھ سکے

گر لکھوں ناسخ نہ حال اپنے غمِ جاں سوز کا
شمع ساں شعلہ نہ خامے کی زباں سے اٹھ سکے

۳۰۴

خوں چکاں دل کی حکایت ہے بیاں کیا کیجے
تیغ ساں خوں سے ہے[2] آلودہ زباں کیا کیجے

منہ ہے زرد ، اشک ہیں سرخ اور ہے دم ہونٹوں پر
حالتِ دل ہے عیاں اس کو بیاں کیا کیجے

ہو سکے یادِ الٰہی نہ اگر اے زاہد
شغل پھر اور بجز یادِ بتاں کیا کیجے

وصلِ محبوب میسّر نہ جوانی میں ہوا
ہونے پیری میں اگر بخت جواں کیا کیجے

ناصحا چاک کے کرنے میں مجھے[3] رکھ معذور
وہ ہے ماہ اور گریباں ہے کتاں کیا کیجے

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہندی : ''مصر کو جذب زلیخا''۔
۲۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہندی :
''تیغ ساں خون سے آلودہ زباں کیا کیجیے''
۳۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہندی :
''ناصحا چاک کے کرنے میں ہمیں رکھ معذور''

خونِ بسمل کی بھی اس باغ میں بے قدر ہے نہر
کوچۂ یار میں اشکوں کو رواں کیا کیجے
سلکِ گوہر سخن اپنا ہے ولیکن لاسخ
دہنِ یار کے مانند نہاں کیا کیجے

۳۰۵

پاس یار جانی ہے ، بادہ ارغوانی ہے
شغلِ شعر خوانی ہے ، عالمِ جوانی ہے
رنگِ زرد ہے ہمدم ہوتے عشق سے محرم
روتے ہیں لہو ہر دم ، چہرہ ارغوانی ہے
ابر ہے گلستاں ہے، مطربِ غزل خواں ہے
مستِ بادہ جاناں ہے لطفِ زندگانی ہے
چال کس پری رو کی ، وقتِ فکر یاد آئی
آج کچھ بہت اپنی طبع میں روانی ہے
منہ سے گر لگے مینا آبِ خضر ہو پینا[1]
پی کے ایک دم جینا عمر جاودانی ہے
آئنہ[2] دوراں ہے ، اس میں عکسِ جاناں ہے
آپ اپنا حیراں ہے ، آپ اپنا ثانی ہے
مینہ نہ ٹوٹ پڑتا گر تو وہ آتے میرے گھر
مینہ نہیں ہے ، یہ مجھ پر قہرِ آسمانی ہے
سننے والے روتے ہیں ایسی نیند سوتے ہیں
آن پہ نوحے ہوتے ہیں اپنی وہ کہانی ہے

۱- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع مجلدی : ''آبِ خضر ہو پینا'' -
۲- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع مجلدی : ''آئینہ یہ دوراں ہے'' -

گور ہو گیا ہے گھر ، للہ شورشِ محشر
عین موت ہے دلبر اپنی زندگانی ہے

کھینچی ہے شبیہ اپنی اس نے لاکھ جا آپھی
مُو قلم ہے زلف اس کی ، ہاتھ اس کا مانی ہے

خواب میں وہ آنے کا کیوں نہ اب کرے وعدہ
یعنی کب جدائی میں مجھ کو نیند آتی ہے

نخلِ وادیِ ایمن کر دے بیدِ مجنوں کو
تیرے رنگ میں لیلٰی بانگِ لن ترانی ہے

آفتاب کا کہنا ، ہے شراب کو زیبا
کس لیے کہ شیشے کا رنگ آسمانی ہے

عمرِ خضر تک لاسخ بے ثبات ہم کو بھی
گوہرِ سخن میں یاں آبِ زندگانی ہے

۳۰۶

کیا سیاہی اور سرخی لالہ وار آنکھوں میں ہے
چشم بد دور آج اے ساقی بہار آنکھوں میں ہے

کیوں سفیدی اور سیاہی آشکار آنکھوں میں ہے
عکس افگن کیا یہ زلف و روئے یار آنکھوں میں ہے

کرکے وعدہ شب کے آنے کا ، نہیں آیا جو یار
بیقراری دل میں ہے اور انتظار آنکھوں میں ہے

جامِ مے خنداں جو بے ساقی نظر آیا مجھے
جوش پر کیا گریۂ بے اختیار آنکھوں میں ہے

کر دیا بسمل آتے جس سے ہوا قاتل دو چار
یہ نگہ ہے یا کہ تیغِ آبدار آنکھوں میں ہے

دل میں اس آتش کے بھڑکانے نے شاید گھر کیا
آج سے جو پارۂ دل شعلہ بار آنکھوں میں ہے

آج جو وہ پھول سا چہرہ نظر آیا نہیں
نوکِ مژگاں کی خلش، مانندِ خار آنکھوں میں ہے

قطرہ رشکِ چاہ کنعاں ہے خیالِ یار میں
طفلِ اشک اب یوسفِ رنگیں عذار آنکھوں میں ہے

بے سبب پیری میں غافل کم نظر آتا نہیں
توسنِ عمرِ رواں کا یہ غبار آنکھوں میں ہے

آتے ہیں ٹکڑے دلِ پُرداغ کے اشکوں کے ساتھ
فرقتِ رشکِ چمن ہے لالہ زار آنکھوں میں ہے

کوئے جاناں کا تصور باندھ کر روتا ہوں میں
صحنِ گلشن دل میں ہے اور آبشار آنکھوں میں ہے

ہو گئی طاقت یہ ساقط تیرے نظارے بغیر
ان دنوں قطرِ نگہ بھی مجھ کو بار آنکھوں میں ہے

ظاہرا انکار ہے، باطن میں ہوں لبریزِ عشق
دل ہے مخمورِ مئے گلگوں، خمار آنکھوں میں ہے

گھر سے تو نکلے تو باہر یہ بھی نکلے اے پری
دیر سے اپنی نگہ امیدوار آنکھوں میں ہے

مثلِ درباں بیٹھی ہے اپنی نظر بیرونِ در
کس قدر ظالم ہجومِ انتظار آنکھوں میں ہے

ٹکڑے ٹکڑے ہو اگر عاشق نہیں آتا قرار
لختِ دل جو ہے وہ ناسخ بیقرار آنکھوں میں ہے

آئینہ دیکھے نہ تما ہو جیسے دیدار کی
پتلیوں کے بدلے آنکھوں میں ہے مورت یار کی

صفحۂ ہستی میں صورت ہی نہیں اغیار کی
ہر مرقع میں ہیں تصویریں بس اپنے یار کی

اس قدر پتلی کمر ہے اس پری رخسار کی
کہتے ہیں پھبتی سب اس پر میرے جسمِ زار کی

جا بجا تعریف لکھی ہے خطِ دلدار کی
چاہیے جدول سرے دیوان کو زنگار کی

ہیں جو سالک جانتے ہیں اپنے دشمن کو بھی دوست
آبلوں کو فائدہ کرتی ہے کاوش خار کی

کرتے ہو تعمیر اوروں کے لیے قصر رواق
غافلو! تم کو ملی قسمت مگر معمار کی

ہجر میں منہ سے لگاتے ہی ہوا صدمہ مجھے
ہیں لبِ فنجانِ مے یا باڑھ ہے تلوار کی

طور پر موسٰی نے جس کا نام رکھا صاعقہ
ایک چنگاری ہے تیرے آتشِ رخسار کی

پھلجڑی کی طرح خط اپنا غبار[۱] افشاں ہوا
گر کبھی لکھی حقیقت آہِ آتش بار کی

بوئے زلفِ یار لاتی ہے جو گلشن میں نسیم
ہو گئی تاثیر غنچوں میں دہانِ مار کی

۱۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخۂ مطبع مجدی:
پھلجڑی کی طرح خط اپنا شرر افشاں ہوا

چہرہ اُس گل کا چمک جاتا ہے جس دم باغ میں
بند ہو جاتی ہیں آنکھیں نرگسِ بیمار کی

لے تصور میں صبا بوسہ تو مرجھائے وہ گل
برگِ گل کو تاب ہے بلبل تری منقار کی

دیکھنے آیا مرا جوشِ جنوں وہ خود فروش
آتشِ سودا سے گرمی ہے یہاں بازار کی

باغ میں بے یار فوّارے ہوئے آتش فشاں
ہے ہزاروں میں روش منقار موسیقار کی

آبلوں کو دیکھ کر عبرت کرو اے ظالموں
اشکِ خونیں روتی ہیں آنکھیں غریب آزار کی

پیکرِ نازک کو کافی ہے مرا تارِ نگاہ
اُس بتِ کافر کو کچھ حاجت نہیں زنار کی

شوقِ مے نے کردیا اس درجہ مجھ کو بے حواس
محتسب سے راہ پوچھی خانۂ خمار کی

تیرے آگے خشک ہوجاتے ہیں کیا میرے ہی ہونٹھ[1]
دیکھ اے[2] ناوک فگن خشکی لبِ سوفار کی

بے سبب توڑا نہیں خُم محتسب نے ساقیا!
روح شاید تشنۂ مے تھی کسی مے خوار کی

تیر سی لگتی ہے دل میں اُس لبِ گلگوں کی یاد
جب نظر آ جاتی ہے سرخی لبِ سوفار کی

چھید لاکھوں ناوکِ غم سے مرے دل میں نہیں
ہیں یہ تصویریں کسی کے روزنِ دیوار کی

۱- ہونٹ ۔
۲- مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی : "دیکھ او ناوک فگن" ۔

اے جنوں صحرا نوردی نے کیا روز۱ انقلاب
پاؤں میں بندھوائیں مجھ سے دھجیاں دستار کی
چاندنی شب ہائے فرقت میں کہاں مانندِ صبح
فکر کیا ہے ہمدمو میرے تنِ افگار کی
عندلیبِ روح ناسخ اڑ کے پہنچے خلد میں
ہو پرِ پروازِ الفت جعفرِ طیار کی

۳۰۸

ہے محبت سب کو اس کی ابروے خمدار کی
ہند میں کیا آبرو باقی رہی تلوار کی
منحنی کرتی ہے الفت ابروئے خمدار کی
آدمی کیا جبکہ جھک جائے کمر تلوار کی
وصل کی شب چاندنی دیوار سے جانے نہ پائے
منتیں کرتا ہوں ہر خارِ سرِ دیوار کی
استرا پھرنے سے روئے یار پر ہے دور خط
چال اس کم بخت نے سیکھی ہے کیا پرکار کی
جو کہ ہیں جاں بخش اُن کا حافظِ جاں ہے خدا
دے مسیحا کو جو ایذا کیا ہے طاقت دار کی
بند ہو جائے درِ توبہ تو زاہد غم نہیں
ہو قیامت، بند اگر دیکھوں دکاں خمار کی
کر سبوہائے وضو پر ایک مستانہ نگاہ
مسجدِ جامع بھی ہو ساقی دکاں خمار کی

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع ہمدی:
"اے جنوں صحرا نوردی نے کیا زور انقلاب"

نقد جاں دیتے ہیں ہم یوسف کو ہمارے مشتری
راہ بھی دیکھی نہیں ہرچند ابھی بازار کی

نشۂ مے کا گماں کرنے لگا وہ بدگماں
دیکھ کر سرخی ہمارے دیدۂ خوں بار کی

گھر بھی میرا منتظر ہے یار کا مجھ ہی طرح
روزنِ در میں ہے صورت دیدۂ بیدار کی

سوزن اکثر جس طرح ہوتی نہیں رشتے سے گم
پاسباں زنجیرِ پا ہے میرے جسمِ زار کی

کہتے ہو ہم[1] خواب میں آتے جو تو سوتا کبھی
خوب کی برباد محنت دیدۂ بیدار کی

پانی بھر آتا ہے یاں[2] قاتل دہانِ زخم میں
میان لے لیتا ہے جب منہ میں زباں تلوار کی

باغِ عالم میں کہاں ہے کوئی مجھ سا رحم دل
روز کرتا ہوں عیادت نرگسِ بیمار کی

بزمِ مے ہے عالمِ آب آ نہ اے واعظ ادھر
منہدم ہوگی عمارت گنبدِ دستار کی

داغِ سر ہیں جوشِ سودا میں برنگِ گل مجھے
مثلِ گلبن پاؤں میں کب ہے شکایت خار کی

۱۔ مصطفائی طبع اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"کہتے ہو تم خواب میں آتے جو تو سوتا کبھی"

۲۔ مصطفائی طبع اول و طبع دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"پانی بھر آتا ہے قاتل یاں دہانِ زخم میں"

وہ خدا کا دوست ہے اور دوست اُس کے جس کا خلیفہ ہو
کیوں نہ ہو ناسخ محبِ حیدرِ کرار کی ہے

۳۰۹

ہوئی محفل کی محفل قتل تیغِ تلزِ قاتل سے
مشابہ شمع سوزاں ہو گئی حلقومِ بسمل سے

محبت زیست بھر مجھ کو تھی اک زہرہ جمال سے
مرے لاشے کو دینا غسل آبِ چاہِ بابل سے

زیادہ بارِ الفت اٹھ سکا کب ناتواں دل سے
محبت مجھ کو کلفت ہے ترے رخسار کے تل سے

مگر لیلیٰ کو مجنوں کیر دیا تیری محبت نے
کہ آوازِ جرس ملتی ہے آوازِ سلاسل سے

نہیں موقوف کچھ جرأت تنومندی و طاقت پر
تمام اعضائے تن کو کیا ہے نسبت[1] مضغہ[1] دل سے

بے تسکینِ دل تصویرِ شیریں جس پہ کھودی تھی
بنائی کوہ کن کی لوحِ تربت بس اُسی سل سے

کسی دن پاؤں اپنے دھوئے تھے اُس نے لبِ دریا
حباب آ آ کے اب تک سر پٹک جاتے ہیں ساحل سے

تری آواز کیا انسان ہی کو قتل کرتی ہے
کہ[2] شہنا[3] بھی نہیں ہے کم گلوئے مرغِ بسمل سے

۱۔ مضغہ = (اسم ، مذکر) پارۂ گوشت ۔ لوتھڑا ۔ (فرہنگِ آصفیہ ، جلد چہارم ، ص ۳۶۵) ۔

۲۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"کہ شہنائی نہیں ہے کم گلوئے مرغِ بسمل سے"

۳۔ "شہنا = شہنائی" ۔ (نور اللغات ، جلد سوم ، ص ۳۹۹) ۔

وہ بحرِ حسن مجھ ثابت قدم سے کیوں گریزاں ہے
نکل سکتا ہے کب آبِ رواں آغوشِ ساحل سے

جہاں میں خشک و تر جو ہے ترا مشتاق رہتا ہے
نمایاں صورتِ آغوش ہے گرداب و ساحل سے

سمجھ کر سہل توڑا تو نے میرے شیشۂ دل[1] کو
غضب اے محتسب ہوگا شکیب[2] شیشۂ دل سے

چراغِ آفتاب ایسا نظر آتا[3] ہے جو روشن
ملا کیا[4] ہے اسے روغن ترے رخسار کے تل سے

گریزاں ہے[5] خدا سے کیوں ہے بندوں کو میں حیراں ہوں
رعیّت کو محبت ہوتی ہے سلطانِ عادل سے

جو آنکھیں سوئیں تو دل خواب میں محبوب کو دیکھے
نہیں ہشیار وہ ہرگز جسے نفرت ہے غافل سے

نہ چھوڑو ساتھ سے اب روسفید و روسیاہوں کو
ضرر کافور کو پہنچے، کرے دوری جو فلفل سے

گلابی کا مڑیکا[6] ہے تو ہم ہر مبصر کو
لہو میرا نہیں جو چھوٹتا شمشیرِ قاتل سے

۱- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع محمدی : "میرے شیشۂ سے کو" -
۲- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع محمدی :
"غضب اے محتسب ہوگا شکستِ شیشۂ دل سے"
۳- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع محمدی : "نظر آیا ہے جو روشن" -
۴- مصطفائی اول و دوم - نسخۂ مطبع محمدی : "ملا ہے کیا" -
۵- نسخۂ مطبع محمدی : "گریز اتنی" -
۶- مَڑک = بَل - کجی - داؤ - گھات - ساز باز - گُر - (فرہنگِ آصفیہ، جلد چہارم، ص ۳۲۸) -

کمالِ عشق میں آنکھوں کے آگے یار ہے ہردم
نہاں ہوتا نہیں خورشید دم بھر ماہِ کامل سے

وہیں اطفال مارے پتھروں کے ٹکڑے کرتے ہیں
کھلونے گر کبھی بنتے ہیں مجھ دیوانے کی گل سے

سرہانے کی گھڑی سے آتی ہے بانگِ جرس ہر دم
مسہری کم نہیں اے اہلِ غفلت کچھ بھی محمل سے

روش قل کی پیالے کی ہے جامِ مے کی گردش میں
مجھے فرقت میں کیا ہو انس مےخواروں کی محفل سے

کہاں یہ بولتا اترا بدن کے ساتھ مدفن میں
نہیں آوازِ رنگِ کارواں کو کام منزل سے

مرے گھر آمد آمد آج ہے کس ماہِ تاباں کی
کہ مثلِ کرمِ شب تاب اڑ چلی ہے شمع محفل سے

جو ہے ممدوح اُس کا بس وہی ممدوح ہے اُس کا
نہیں **ناسخ** ذرا رتبے میں کم سحبان وائل سے

۳۱۰

ہوا میں لوٹتے ہیں خاک پر گل آج بسمل سے
گلستاں قتل کا میداں ہے تیغِ نازِ قاتل سے

صدا ہردم یہ آتی ہے درائے نالۂ دل سے
نکل جانے کی اک دن لیلیٰ جاں تن کے محمل سے

بے تحصیلِ زر زاہد خدا کا ذکر کرتا ہے
کیا[1] کرتا ہے یہ گویا درم عقدِ انامل سے

۱- نسخۂ مطبع پھدی: "گنا کرتا ہے یہ گویا"۔

مری آغوش سے وہ بحر خوبی کیوں گریزاں ہے
کوئی دریا نہیں کرتا کنارا اپنے ساحل سے
سراپا وہ پری پیکر دلا پُتلا ہے جادو کا
خمیر اس کی ہوئی کیا خاک آب چاہ بابل سے
نصیحت یہ منجّم شاعروں کو کہتے ہیں اکثر
زحل ہے نحس ہرو نسبت نہ رونے یار کے تل سے
یہ ہیں اشعار شور انگیز اک مطرب کی الفت میں
کہ اوراق اپنے دیواں کے مشابہ ہیں جلاجل سے
در خمار اگر ہے بند، مے خوارو! ادھر آؤ
بھرے ہیں جام آنکھوں کے شراب شیشۂ دل سے
فلک پر چاند کو مجنوں نے جب دیکھا تو یہ سمجھا
کہ لیلیٰ جھانکتی ہے منہ نکالے اپنے محمل سے

۳۱۱

یہاں مُل کا پیالہ ہے، وہاں مے کی پیالی ہے
مرا محبوب میکش کیا ہی رند لاابالی ہے
عجب انداز سے ساقی ہتھیلی پر پیالی ہے
کف رنگیں نہیں، لعل بدخشاں کی یہ تھالی ہے
مصیبت سی مصیبت عاشقی نے مجھ پہ ڈالی ہے
دلا جو مرثیے کی بیت ہے وہ شعر خالی ہے
دل پُرخوں ہے شیشہ، چشم تر ہم کو پیالی ہے
بھرے ہیں خُم اگر کیا کام، اپنا ہاتھ خالی ہے
کہوں کیا کیسی اے فیاض ہمت تیری عالی ہے
فلک تیرے گدا کے ہاتھ کا جام سفالی ہے

ترے فیضِ قدم سے بے خزاں گلزارِ قالی ہے
بدن کے قرب سے جاندار تصویرِ نہالی ہے

شبِ تاریک مدفن ایک دن پیش آنے والی ہے
دلِ ناداں فراقِ یار کی کیا رات کالی ہے

کہاں ساقی کی کوئی بات کیفیت سے خالی ہے
کہ تلخی میں شراب اُس کی لبِ میگوں کی گالی ہے

ہر لگ تیر دل میں لگتی ہے جو تیری گالی ہے
لبِ سوفار سے قاتل ترے ہونٹوں کی لالی ہے

قدم کیا رکھ سکوں محفل میں ایسا رعب ہے اس کا
کہ میری جان کو شیرِ ژیاں پر شیرِ قالی ہے

نہیں عورات میں بھی جان مردوں کی طرح تجھ پر
جو ہے جالی کی کرتی اے صنم! روضے کی جالی ہے

زمیں پر لوٹتا ہوں میں، اُسے آرام بستر پر
شبِ فرقت میں بہتر مجھ سے تصویرِ نہالی ہے

نہ ہوگا میکشی میں یاں عروجِ نشہ بے ساقی
نہیں گردوں سرِ شیشہ پہ یہ خالی پیالی ہے

نہ بھائی ریشِ قاضی تو لیا عمامہ مفتی سے
مزاج ان مے فروشوں کا بھی کیا ہی لاؤ بالی[1] ہے

کمال انسان نے پیدا کیا جو گاؤ زوری میں
تفاخر کیا، زمیں اک گاؤ نے سر پر اٹھا لی ہے

گراں گو[2] اے پری گر تو ہے تو اُس کا تعجب کیا
کہ تیرے گوشِ نازک کو گراں سونے کی بالی ہے

۱۔ نسخہ مطبع ہمدی: ''لا اُبالی ہے''۔
۲۔ مصطفائی اول و دوم۔ نسخہ مطبع ہمدی:
''گراں گوش اے پری گر تو ہے تو اس کا تعجب کیا''

چراغِ روغنِ جاناں آج روشن ہے جو تربت پر
تو بس قندیل کی جالی سرے روضے کی جالی ہے

بلا گردانِ شمعِ عارضِ جاناں ہیں سیارے
فلک بزمِ جہاں میں مثلِ فانوسِ خیالی ہے

شبیہ اس کی کھنچے کیا جو کمر نظروں سے پنہاں ہو
جو موئے کاکلِ پیچاں ہے، تصویرِ خیالی ہے

جو کیفیت بھری ہے تیری آنکھوں میں کہاں اس میں
کہ نرگس کی کٹوری ساقیا اک جامِ خالی ہے

دکھاتے ہیں وہ جامِ چشمِ کیفیت زمانے کی
اسی کی مے کشی سے آسماں، مینائے خالی ہے

چمن دولت سرا کا صحن ہے رنگیں خرامی سے
ترے جاروب کش کی تو کوی پھولوں کی ڈالی ہے

جو اس کا نام لیتا ہے وہ بن جاتا ہے دیوانہ
کہیں اب اس پری کے نام کو عامل جلالی ہے

قفس میں کیوں پڑی دم توڑتی ہے آج اے بلبل
چمن میں کیا کسی نے کوئی ڈالی توڑ ڈالی ہے

رہا ذی غیرتوں کا مزرعِ امید لاحاصل
دلا جز آبرو ریزی جہاں میں خشک سالی ہے

نہ کیوں رو رو کے کھینچوں سرد آہیں ہجرِ ساقی میں
ہوائے بادہ خواری ہے، ہوائے برشگالی ہے

ہزاروں قامتِ بالا کے مضموں کیوں نہ ہوں موزوں
رسا تا عالمِ بالا ہماری طبعِ عالی ہے

زرِ گل ہے گداز اے شعلہ خو یہ تیرے پرتو سے
کہ جو گل ہے چمن میں ایک سونے کی کٹھالی ہے

چمن میں جوشِ رنگِ گل یہاں ہے جوشِ خونِ ناسخ
جلال اپنا زیادہ کیوں نہ ہو، ماہِ جلالی ہے

۳۱۲

کس درجہ ہے ظالم تری رفتار میں گرمی
ہے حشر کے میدان سی بازار میں گرمی

ہے داغِ جنوں سے بدنِ زار میں گرمی
یاں آتشِ گل سے ہوئی ہے خار میں گرمی

کیا بند ہوا مدفنِ تاریک میں ہوگی
کچھ بھی نہیں گرما کی شبِ تار میں گرمی

ہیں داغ مرے سر کے جنوں مشتعل ایسے
خورشید کے مانند ہے دستار میں گرمی

ہیں قطرۂ شبنم لبِ گلبرگ پہ تبخال
کس حسن کی آتش سے ہے گلزار میں گرمی

ہر عضو دہکتا ہے پڑا آتشِ غم سے
ہے تپ سے زیاد اپنے تنِ زار میں گرمی

ہر دم یہی کہتا ہے مرے جلتے ہیں تلوے
ہے رنگِ حنا سے کفِ پار میں گرمی

ہے آگ میں اسپند یہ آنکھوں میں نہیں تل
ایسی ہے مرے دیدۂ بیدار میں گرمی

گل جلنے لگے، دیدِ چمن کو جو وہ آیا
آفت ہے، غضب ہے، نگہِ یار میں گرمی

زرد آنکھیں ہوئیں، صاف خلل ہے یرقاں کا
پیدا یہ ہوئی نرگسِ بیمار میں گرمی

پتھر بھی شرر سوز ہیں ، مرے دل میں ہے تپِ عشق
داغوں سے کہاں لالۂ کہسار میں گرمی

سب زخم مرے جلتے ہیں شعلے کی طرح سے
بجلی کی طرح ہے تری تلوار میں گرمی

اے شعلہ صفت روزنِ مجمر[1] کی طرح سے
رہتی ہے ترے روزنِ دیوار میں گرمی

کیوں سوزشِ غم ہے دلِ صد چاک میں اتنی
کم ہوتی ہے ایوانِ ہوادار میں گرمی

بل کھانے سے ہر زلف میں عالم ہے دھوئیں کا
شعلے کی طرح ہے ترے رخسار میں گرمی

بجلی کی طرح کیوں نہ چمک جائے ہوا ہر
کیسی ہے ترے توسنِ رہوار میں گرمی

جاتی ہے ہر اک آہِ شرربار فلک کو
ہے میرے ہی دم سے کرۂ نار میں گرمی

مدّاح کی جل جائے زباں شمع کی مانند
ہے سر سے قدم تک یہ مرے یار میں گرمی

ہر بات میں ہونٹوں سے نکلتا ہے دمِ سرد
یاد آتی ہے جس دم تری گفتار میں گرمی

ساقی کی جدائی میں ہوئی آتشِ مے سرد
دوزخ کی طرح خانۂ خمّار میں گرمی

کس برقِ جہاں سوز کے موزوں ہوئے اوصاف
ناسخ نہ ہو کیونکر مرے اشعار میں گرمی

۱- مجمر=(بکسر اوّل و فتح سوم) عود سوز - بونے سوز - آتش دان -
(فرہنگِ عمید ، ص ۱۰۵۵)-

۳۱۳

سودا ہے مجھ کو عشق خطِ سبزا[۱] رنگ سے
ممکن نہیں کہ عقل نہ زائل ہو بنگ سے

خوشبو یہ ہے ترے دہنِ غنچہ رنگ سے
شرمندہ ہے گلاب کا پنجہ تفنگ سے

ہشیاروں کی نہ صلح سے خوش ہو اگر ہے ہوش
نسبت نہیں دلا آپ مستوں کی جنگ سے

لکھ لکھ کے حال اُس کے محل پر گرائیے
قاصد نہیں دلا کوئی بہتر پتنگ سے

توڑیں جو پاؤں تو بھی جہاں میں پھرے حریص
بیٹھا گیا نہ کونے میں تیمور لنگ سے

ہم خواب تو ہوا نہ کبھی مجھ سے ایک شب
یاروں نے مجھ کو آج اتارا پلنگ سے

ہر اس میں خیال ہے مجھ کو مآل کا
ایذا ہے صلح یار سے، راحت ہے جنگ سے

گوشِ رقیب تیرِ حسد کا نشانہ ہو
کر آج میرے کان میں باتیں تفنگ سے

گل کر دیا چراغ ہماری حیات کا
بتی اُڑائی تو نے نگہ کے خدنگ سے

ہوتی ہیں اور عشق میں رسوائیاں مری
ثابت ہوا ہے مجھ کو اجل کے درنگ سے

۱۔ مصطفائی اول و دوم ۔ نسخۂ مطبع مجدی :
"سودا ہے مجھ کو عشق خطِ سبزہ رنگ سے"

گزرے جو باغ میں وہ سوارِ سمندِ ناز
گلگوں بھی آگے بڑھ نہ سکے گل کے رنگ سے
ہو جائے پیشِ یار مصوّر ورق سفید
تصویر گر کھنچے مرے چہرے کے رنگ سے
تصویر میں بنے لبِ شیریں تو کوہ کن
کھنے لگا نکالے ہیں یاقوت سنگ سے
پہنچوں میں ناتواں ہو اگر کوئے یار تک
سوراخِ موز کم نہیں مجھ کو سرنگ سے
بادِ بہار سی ترے گلگوں کی چال ہے
ٹھوکر کے ساتھ پھول نکلتے ہیں سنگ سے
پیکِ اجل سے بھاگ کے بچنا محال ہے
ناسخ حصول کچھ نہیں مشقِ شلنگ سے

خاتمة الطبع

سبحان اللہ ! وہ کیسا حکیم سخنِ آفریں ہے جس نے خاک کے پتلوں کو آفتابِ سخن کا مطلع بنایا ، کل مخلوق میں سے اُن کو فصاحت و بلاغت کا مقطع ٹھہرایا ۔ خوش تقریر کیا ، کلامِ پُر تاثیر دیا ۔ سحر بیانی رنگیں زبانی ، طبعِ عالی ، نازک خیالی کو الھی کے لیے موزوں کیا ۔ عقل و فہم ، ذہن و ذکا کوٹ کوٹ کے بھر دیا ۔ اللہ اللہ کیسا نبیِ برحق باعزّ وتمکین جو جوامع الکلم ، افصح عرب و عجم ہے ۔ بلکہ اُس کے کمالِ فصاحت و بلاغت کی دھوم زمین سے عرش تک ہے ۔ کچھ اس میں شک نہیں ہے بشر کو ۔ کیا منہ رکھتا ہے جو اُس کے ایک حرف کے مقابل میں زبان کھولے ۔ یہاں ملائکہ کا کلام اس کے کلام کا ہم ردیف نہیں ہے ۔ قافیہ تنگ ہے ،

مکتے کا عالم ہے ، ہر ایک قائلِ مالم یعلم ہے ۔ پیروی اس کی قطعاتِ باغِ جنّت دلاتی ہے ، شفاعت اس کی گنہگاروں کو قیدِ دوزخ سے چھڑاتی ہے ۔ جسے اس کی محبت کامل ہے ، تقارب باللہ حاصل ہے ۔ صلواۃ اللہ علیہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین الی یوم الدین ۔

امابعد بندۂ خاکسار ، ذرۂ بے مقدار ، بے ہنر کم مایہ و بدتر ناکام مہدی علی نام ، مشتاقوں کو خوش خبری سناتا ہے ، شائقوں کو پتا بتاتا ہے کہ زمانۂ میمون ، روزگارِ ہمایوں میں دیوان حُسنِ کلام و خوش بیانی کا نشان ، جس کے ہر شعر آبدار کے آگے آبروئے گوہر خاک میں ملی ہے اور ہر مصرعِ موزوں اس کا نازنینوں کے قدِ موزوں سے دوبالا ہے ۔ رشکِ کلامِ کلیم و طالب آملی ہے ۔ حلاوت میں شکّر ہے ، طراوت میں گلِ تر سے بہتر ہے ۔ ہلال صورت ہے ، ہلال سیرت ہے یا شیر شامل انگبیں ہے یا عرقِ گل میں حل کیا مسکِ مشکیں ہے ۔ تصنیفِ شاعرِ بے مثال ، نازک خیال ، شیوا زبان عزوبت ہزار داستان کا جس نے مضامین کے طائرانِ تیز پر ، بلند پرواز کو بے کھٹکے رشتۂ فکر میں باندھ لیا ، ہاتھ سے جانے نہ دیا ۔ شعر گوئی کا دہرا بنایا ہے ، رہ رووں کو سیدھا رستہ بتایا ہے ۔ جو چاہے بے دھڑک چلا جائے ، کہیں نہ بھٹکے ، مضمون کے آہوئے وحشی کو صید کر لائے ۔ بندش چست ، الفاظ درست ، استعارے خوب ، کنائے مرغوب ، محاورے فصیح ، ترکیب صحیح کا بادشاہ ہے ۔ کلام اس کا تعقیدِ لفظی و معنوی ، ایتا و سکتہ سے پاک ہے ۔ ماہر اس فن کا خوب آگاہ ہے ، اگلے ریختہ گویوں کے کلام کا بیشک ناسخ ہے ۔ وہ کون ؟ شیخ امام بخش ناسخ ہے ۔ حکم سے جناب آقائے نامدار والا تبار عالی ہمم بحرِ فیض و کرم ، جوادوں کے سرتاج ، حاتم خصلتوں کے مہاراج ، ہنر پرور منشی نول کشور نام آور کے ،

واسطے فیضِ خاص و عام اور فائدۂ تمام کے ، بہت صحت اور محنت و مشقت سے مطبع فیض مرجع کانپور میں منتظمِ خوش سلیقہ واقفِ فنونِ دقیقہ ، چابک دست ماہرِ حسنِ بندوبست مولوی محمد اسمٰعیل کے انتظام لیک فرجام سے ماہ اگست ۱۸۷۲ عیسوی میں مطبوع ہوا ، سخن شناسوں کو پسند و مطبوع ہوا۔

● ● ●

مجلس ترقی ادب لاہور